جامعہ

جامعہ ملّیہ اسلامیہ، دہلی

خط و کتابت کا پتہ
رسالہ جامعہ، جامعہ نگر۔ نئی دہلی

جامعہ

سالانہ چندہ
چھ روپے

قیمت فی پرچہ
پچاس نئے پیسے

جلد ۴۷	بابت ماہ جولائی سنہ ۱۹۶۲ء	شمارہ ۱

فہرست مضامین

رسالہ جامعہ کے جدید دور کی پہلی جلد (یعنی ۴۵ ویں) نومبر ۱۹۶۰ء سے اکتوبر ۱۹۶۱ء تک بارہ مہینوں پر مشتمل تھی۔ کچھ خریداروں اور مضمون نگاروں نے خواہش ظاہر کی ہے کہ ایک جلد صرف چھ ماہ کی ہونی چاہیئے، اور جنوری سے جون اور جولائی سے دسمبر تک کے مہینوں پر مشتمل ہو۔ ان کی اس خواہش کے مطابق ۴۶ ویں جلد جون ۱۹۶۲ء پر ختم کر دی گئی ہے اور اب جولائی سے ۴۷ ویں جلد شروع کی جا رہی ہے۔

اگر قارئین جامعہ چاہتے ہوں کہ ہر جلد کی فہرست مضامین بھی الگ سے شائع کی جائے تو براہِ کرم مطلع فرمائیں کہ فہرست مضمون وار شائع کی جائے یا صفحات کے لحاظ سے؟

(مرتب)

بین اقوامی مفاہمت اور نصاب کی کتابیں

پروفیسر محمد مجیب

۱۹۴۵ء میں جنگ ختم ہوئی تو جرمنی کے استادوں کو سوچنا پڑا کہ وہ تاریخ کیسے پڑھائیں گے۔ جو کتابیں موجود تھیں وہ ہٹلر کے دور کی تھیں، اور کسی کو اس کی ہمت نہیں ہوسکتی تھی کہ وہ برباد شدہ بستیوں اور دکھوں کی تباہ حال آبادی کے بچوں کے ہاتھ میں ایسی کتابیں دے جن کا مقصد غرور اور عظمت کا احساس پیدا کرنا تھا۔ مغربی جرمنی پر انگریزوں، فرانسیسیوں اور امریکیوں کا قبضہ تھا، اور ایسی کسی حکومت کی تشکیل نہیں ہوئی تھی جو تعلیم کی ذمہ داری لیتی اور اس کی رہنمائی کرتی۔ جرمنی کے استادوں نے اپنی انجمنوں کے ذریعہ درسی کتابوں پر نظر ثانی کا کام اپنے ہاتھ میں لیا اور برنس وک میں ایک بین اقوامی درسی کتابوں کے ادارہ کی بنیاد رکھی جس کے ڈائرکٹر پروفیسر اکرٹ ہیں۔ اسی شہر میں میری مسز فوکس سے ملاقات ہوئی جو اب برنس وک کی میئر ہیں اور اُس زمانے میں ضلع کی وزیر تعلیم تھیں۔ انھوں نے کہا کہ اکرٹ کو میں نے یہاں بلایا تھا۔ اس وقت بچارہ دُبلا پتلا اپنے فوجی یونیفارم پر شرمندہ تھا۔ اب دیکھو کیسا خوش ہے۔ یہ کہہ کر انھوں نے پروفیسر اکرٹ کے دونوں گالوں پر بوسہ دیا اور انھیں گلے سے لگا لیا۔ مسز فوکس خود ستر برس کی ہیں اور ان کی محنت، خیر خواہی اور کارپردازی مثال مانی جاتی ہے۔ انھیں اور پروفیسر اکرٹ کو جو کامیابی ہوئی ہے اسے دیکھتے ہوئے خوشی کا یہ اظہار بجا تھا۔ جرمنی میں بہت جلد ایسی تاریخ اور جغرافیہ کی درسی کتابیں تیار ہوگئیں جو تعلیمی اور سیاسی اعتبار سے قابل اطمینان ہیں۔

۱۹۵۴ء میں یونسکو نے پروفیسر ہمایوں کبیر کی تحریک پر دنیا کی قوموں کے درمیان مفاہمت اور مختلف تہذیبوں کی قدروں سے واقفیت پیدا کرنا اپنا منصوبہ بنایا۔ اس منصوبے کے کئی پہلو ہیں، مگر شاید سب سے زیادہ اہم یہ ہے کہ ساری دنیا میں تاریخ، جغرافیہ اور ادب کی درسی کتابوں میں ایسا مواد شامل کیا جائے جو مختلف تہذیبوں کی قدرشناسی کا جذبہ پیدا کرے۔ اس سلسلے میں پہلی بین اقوامی کانفرنس

مئی ۱۹۵۶ء میں پیرس میں ہوئی تھی۔ معلوم نہیں نمائندوں کا انتخاب کس طرح ہوا تھا، بہرحال ہندوستان کی وزارت تعلیم کا یہ منشا نہیں تھا کہ درسی کتابوں کی نظرثانی میں کسی با مقصد طریقہ سے شرکت کی جائے، مجھے اس کانفرنس میں شرکت کی دعوت دی گئی اور مجھے صرف یہ محسوس ہوا کہ یونسکو میں یا کہیں اور کوئی قدردان مجھے اس کا موقع دینا چاہتا ہے کہ میں پیرس کی سیر کرلوں۔ کانفرنس کی بحثیں بہت دلچسپ تھیں، اور مجھ سے کہا گیا کہ مغربی ملکوں کی درسی کتابوں میں شامل کرنے کے لئے میں تاریخ ہند کے عنوانات کی ایک فہرست تیار کروں۔ یہ یونسکو کے "کاغذ" نمبر ای۔ ڈی/۱۴ پیرس، ۸ر نومبر ۱۹۵۶ء میں ضمیمہ کے طور پر شامل ہے۔ اس کانفرنس کے دو سال بعد ٹوکیو میں ایک کانفرنس ہوئی، جس میں ہندوستان کے نمائندے ایس۔ ایس بھنڈارکر صاحب، بمبئی کے ڈائرکٹر تعلیمات تھے، اور پھر دو سال بعد نیوزی لینڈ کے شہر ولنگٹن میں جہاں سی۔ ایس بھنڈاری صاحب ڈائرکٹر، ادارہ تحقیق نفسیاتی، الہ آباد نے ہندوستان کی نمائندگی کی۔ اپریل ۱۹۶۲ء میں میرے پاس جرمنی میں ہندوستانی سفارت خانہ کے ڈائرکٹر بھٹاچاریہ صاحب کا خط آیا کہ جرمنی میں کئی لوگ پوچھ رہے ہیں کہ آپ کب آرہے ہیں۔ میں نے انھیں لکھا کہ مجھے معلوم نہیں کہ مجھے جرمنی سے کسی نے بلایا ہے اور بلایا ہے تو کیوں، اور ساتھ ہی ڈاکٹر اکرٹ کو لکھا کہ میرے پاس سفارت خانہ سے ایک خط آیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مجھے جرمنی آنے کی دعوت دی گئی ہے۔ اگر انھیں معلوم ہو کہ کیا ماجرا ہے تو مجھے بتا دیں۔ اس کے بعد میرے پاس جرمنی کے یونسکو کمیشن کا باضابطہ دعوت نامہ آیا، اور وزارت تعلیم نے بھی اس کا اقبال کیا کہ ایسا دعوت نامہ آیا ہے اور کانفرنس میں شرکت کے لئے میرا ہی انتخاب کیا گیا ہے۔ غالباً پالیسی کا تسلسل مدنظر نہیں تھا اس لئے جرمنی کے یونسکو کمیشن کی خواہش کہ مجھے بھیجا جائے پوری کی جا سکتی تھی۔ چنانچہ ۱۳ر مئی کی شام کو شہر گرسلار، جہاں کانفرنس ہونے والی تھی، پہنچ گیا۔

پہلا دن خیریت سے گذر گیا۔ کچھ رسمی تقریریں ہوئیں شام کو دعوت ہوئی۔ دوسرے دن ڈاکٹر اکرٹ نے مجھ سے کہا کہ کانفرنس کی صدارت آپ کو کرنی ہوگی۔ میں نے بہت کہا کہ میں اس کام کے لئے بالکل موزوں نہیں ہوں، مگر وہ بھی مجبور تھے۔ ڈیلی گیٹس میں چکوسلواکیہ، ہنگری اور

یوگوسلاویہ کے نمائندے تھے، لیکن یہ بے ضرر رہتے ہیں یا سیاسی عداوتوں کو بالائے طاق رکھنے پر تیار ہو جاتے ہیں اگر انھیں روس کی رہنمائی حاصل نہ ہو۔ کانفرنس میں پروفیسر نرویچ نشکی روس کی نمائندگی کرنے کے لئے آنے والے تھے۔ امریکی نمائندوں کے ہوتے ہوئے انھیں صدر نہیں بنایا جا سکتا تھا۔ اوران کی موجودگی نے اس عہدے کے لئے امریکی نمائندوں کو اوران کے ساتھ مغربی یورپ کے دوسرے نمائندوں کو خارج از بحث کر دیا۔ چنانچہ مجھے صدر، اور امریکہ کے مسٹر ہارٹس مورن، چکوسلاواکیہ کے مسٹر نچ اور جرمنی کے پروفیسر اکرٹ نائب صدر مقرر ہوئے۔ کانفرنس نے اپنے کام کو تین بڑے حصوں میں تقسیم کیا، ہر ایک پر غور کرنے اور اس کے متعلق رپورٹ دینے کے لئے گروپ بن گئے اور ان کے الگ صدر اور رپورٹر مقرر ہو گئے۔

کانفرنس میں جرمنی، انگلستان اور امریکہ کے بعض پبلشرز تھے، اور ان کی موجودگی سے فائدہ اٹھانے کے لئے طے ہوا کہ پہلا گروپ درسی کتابوں کی تیاری اور چھپائی اور اس میں بین اقوامی تعاون کے امکانات پر غور کرے۔ تیسرے گروپ کے سپرد پیرس، ٹوکیو اور ولنگٹن کی کانفرنس کی سفارشات پر نظر ثانی اور ان کی تکمیل کرنا تھا، بین اقوامی مفاہمت کو یونسکو، مختلف قوموں کے نیشنل کمیشنوں، نظامِ تعلیم، نصابِ تعلیم اور درسی کتابوں کے ذریعہ ترقی دینے کے جملہ مسائل دوسرے گروپ کے ذمّے ڈالے گئے۔

پروفیسر نرویچ نشکی کا اور میرا تیسرے گروپ میں ساتھ ہوا۔ وہ ماسکو کے ایک ٹیچرز کالج کے پروفیسر ہیں، جرمن، انگریزی اور فرانسیسی روانی کے ساتھ نہیں تو بہت اعتماد کے ساتھ بول سکتے ہیں مطلب کے موافق اور مطلب کے خلاف بات کو فوراً سمجھ لیتے ہیں اور میں نے ان کو کسی موقع پر اس اندیشے کی وجہ سے ہچکچاتے یا تکلف کرتے نہیں دیکھا کہ وہ اپنا مافی الضمیر صحیح انگریزی یا جرمن میں بیان نہ کر سکیں گے۔ وہ اپنے ساتھ مشرقی جرمنی کی چھپی ہوئی چند کتابیں لائے تھے جن میں مغربی جرمنی کی درسی کتابوں کا جائزہ لے کر دکھایا گیا تھا کہ ان کے ذریعہ بچوں میں ایسی ذہنیت پیدا کی جا رہی ہے جو بین اقوامی امن اور اتحاد کے منافی ہے۔ انھوں نے اپنی پہلی تقریر میں جغرافیہ کی ایک کتاب کا خاص طور پر ذکر کیا۔ اس کے جواب میں پروفیسر اکرٹ نے کہا کہ کسی کتاب کے ایک دو جملوں کو متن سے الگ کر کے پوری کتاب کو

اور ایک کتاب کے کسی نقص کی بنا پر تمام درسی کتابوں کو قابل اعتراض ٹھہرانا صحیح نہیں ہے، اور اس کا یقین دلاکر کہ جرمنی میں درسی کتابوں کو عداوت کے جذبے سے پاک کرنے کی مخلصانہ کوشش کی جا رہی ہے درخواست کی کہ کتابوں پر اعتراض کرنے کا سلسلہ نہ شروع کیا جائے۔ اس طرح یہ بات آگے نہیں بڑھی، تین چار دن بعد ایک عام جلسے میں پروفیسر ورج نشکی نے ایک امریکی کتاب پر ایسا ہی اعتراض کیا۔ اس وقت تک ان سے بے تکلفی نہیں تو خاصی واقفیت ہوگئی تھی، اور خود میں نے بحیثیت صدر کے اس پر اظہار افسوس کیا کہ وہ ایک قابلِ اعتراض کتاب کو ایک ملک کی تمام کتابوں پر اعتراض کرنے کے لئے دلیل بنا رہے ہیں۔ ان دو مثالوں کے علاوہ پروفیسر ورج نشکی کی تقریروں اور انداز گفتگو میں کوئی ایسی بات نہیں تھی جس سے کسی کو شکایت ہو۔ میں نے صدر کی حیثیت سے انھیں رائے دینے کا پورا موقع دیا، اور اگرچہ مجموعی طور پر شاید وہی سب سے زیادہ رائے دیتے رہے، ان کی بات ہمیشہ معقول ہوتی تھی۔ اس کا اعتراف سب نے کیا، اور رفتہ رفتہ بدگمانی بڑی حد تک دور ہوگئی۔

کانفرنس میں جاپان کے ایک نمائندے پروفیسر کرساوا تھے۔ وہ کئی سال سے جاپانی زبان میں اصول اور فن اور تاریخ تعلیم پر کتابیں لکھ رہے ہیں۔ اسی سلسلے میں انھوں نے مختلف ملکوں کی درسی کتابوں کا موازنہ کیا، اور جو نتیجے نکلے تھے ان کے متعلق ایک نوٹ کانفرنس میں غور کرنے کے لئے پیش کیا۔ یہ نوٹ ان کی ایک جاپانی کتاب کے خلاصہ کا ترجمہ تھا۔ وہ خود انگریزی بہت کم جانتے ہیں، ترجمے کی زبان بہت ناقص تھی، اور نوٹ میں جو نظریے اور کلیے پیش کئے گئے تھے وہ تعلیم اور تہذیب (اور سیاست) کے اعتبار سے بہت اہم تھے۔ مثلاً انھوں نے روس کی درسی کتابوں کا مطالعہ کرکے نتیجہ نکالا تھا کہ درسی تعلیم کا مقصد صنعتی کارپردازی ہے، اور متحدہ ریاستوں کی درسی کتابوں کو دیکھ کر یہ رائے قائم کی تھی کہ وہاں تعلیم کا مقصد مہذب انسان پیدا کرنا ہے۔ بحث کے سلسلے میں انھوں نے کمیونسٹ اور آزاد ملکوں کا ذکر بھی کیا تھا۔ کانفرنس کے منتظموں کو ان سے بڑی دلچسپی تھی۔ انھوں نے نوٹ کو کانفرنس کے کاغذات میں شامل کردیا، اور ایجنڈے میں پروفیسر کرساوا کی تقریر کے لئے دو گھنٹے مخصوص کر دئے۔ پروفیسر کرساوا جاپانی کے علاوہ کوئی زبان جانتے نہیں، انھیں کتابیں بھی بہت کم مل سکیں اور انھوں نے درسی کتابوں کے موازنے کے بارے میں اپنے نوٹ میں جو کچھ لکھا تھا اسی سے صاف ظاہر تھا کہ ان کا کام بہت

ناقص ہے، کانفرنس کے سامنے اسے پیش نہ کرنا چاہیئے۔ کانفرنس کے منتظموں کو شاید پروفیسر پر ترس آیا، اس لئے کہ انھوں نے تن تنہا ایک بہت بڑے کام کو انجام دینے کی کوشش کی تھی، اور انھوں نے نوٹ کو پڑھے بغیر گشت کرا دیا۔ پروفیسر کرساوا نے تقریر سے پہلے ہال میں بہت سے چارٹ لگا دئے تھے، تقریر کے ساتھ انھوں نے بیشتر سلائڈ بھی دکھلائے (بیشتر پہلے الٹے اور پھر سیدھے) اور کانفرنس کے تمام اراکین کو احساس ہوا کہ ان کا وقت بیکار ضائع کیا گیا ہے۔ اسی وجہ سے بیشتر چاہتے تھے کہ معاملے کو یہیں پر ختم کر دیا جائے، لیکن پروفیسر تروچ نشکی نے نوٹ کا ایک ایک لفظ پڑھا تھا، اور انھوں نے اصرار کیا کہ نوٹ پر بحث ہو۔ چونکہ مطالبہ صحیح تھا، مجھے ان کا ساتھ دینا پڑا، اور بحث کا وقت دوسرے دن سہ پہر کو رکھا گیا۔ اس سے پہلے پروفیسر اکرٹ اور یونسکو کے نمائندوں نے پروفیسر کرساوا کا نوٹ اچھی طرح پڑھا دوسری طرف پروفیسر تروچ نشکی نے یونسکو کے ایک نمائندے کو اس کا قائل کر دیا کہ نوٹ میں کئی باتیں اس درجہ قابلِ اعتراض ہیں کہ اسے کانفرنس کے ریکارڈ میں شامل نہیں کیا جا سکتا۔ پروفیسر اکرٹ کے سمجھانے سے پروفیسر کرساوا اس پر راضی ہو گئے کہ اپنا نوٹ تصحیح کے لئے اراکین کانفرنس سے واپس طلب کر لیں۔ بحث تو مقررہ وقت پر ہوئی، مگر خاتمہ اس پر ہوا کہ اعتراضات سننے کے بعد پروفیسر کرساوا نے درخواست کی کہ ان کا نوٹ انھیں واپس کر دیا جائے۔

کانفرنسوں کی آخری نشستیں عموماً اضطراری ہوا کرتی ہیں۔ ہماری کانفرنس نے جو گروپ مقرر کئے تھے انھوں نے اپنے اپنے موضوعوں پر سیر حاصل بحثیں کیں اور رپورٹیں تیار کیں۔ یہ عام جلسوں میں پیش ہوئیں، اور منظور بھی کر لی گئیں۔ پھر انھیں کی بنا پر سفارشات مرتب کی گئیں۔ رپورٹوں میں جو بات تفصیل سے کہی گئی تھی وہ جب سفارشات میں مختصر اور قطعی صورت میں نظر آئی تو بعض لوگوں کو محسوس ہوا کہ سفارش میں جو بیان کیا گیا ہے وہ رپورٹ میں تھا ہی نہیں یا دوسری شکل میں تھا، بعض نے رپورٹ کی منظوری کو سفارشات کی منظوری کے برابر نہیں مانا، سفارشات اتنی جلدی میں مرتب کی گئی تھیں کہ ان کی زبان گنجلک اور اکثر مبہم تھی، اور ان کو وہ ترتیب دی ہی نہیں جا سکتی تھی جو سفارشوں کو معمولاً دی جاتی ہے۔ پیرس سے جو خاتون انگریزی سے فرانسیسی

میں ترجمہ کرنے کے لئے بلائی گئی تھیں انھوں نے بعض جگہ انگریزی کا مطلب نہیں سمجھا اور اس کی وجہ سے بڑی غلط فہمیاں پیدا ہوئیں۔ سفارشوں کی تعداد بھی بہت تھی، کانفرنس کے آخری دن، ۲۳ مئی کی سہ پہر کو جب سفارشیں سامنے آئیں اور ان کی تعداد اور عبارت کی خامیوں کا اندازہ ہوا تو سب کو خیال ہوا کہ انھیں مرتب شکل دے کر منظور کرنے کا کام اتنے تھوڑے وقت میں نہ ہو سکے گا۔ کانفرنس کے منتظموں کی رائے تھی کہ چونکہ تجویزیں سب رپورٹ کی شکل میں منظور ہو چکی ہیں اس لئے سفارشوں کو مجموعی اور اصولی طور پر منظور کر کے انھیں مرتب کرنے کی ذمہ داری جرمن نیشنل کمیشن اور یونسکو کے سپرد کر دی جائے۔ پروفیسر زوریخ نٹسکی نے اس رائے کی بہت سختی سے مخالفت کی۔ بعض ممبروں نے زچ ہو کر کہا کہ سفارشوں کی ضرورت ہی نہیں ہے، کانفرنس کی تجویزیں سب رپورٹوں میں موجود ہیں، انھیں کو شائع کر دینا کافی ہوگا۔ یہ خیال بھی پسند نہیں کیا گیا۔ آخر میں یہ طے ہوا کہ ایک ایک سفارش پر غور کر کے اسے منظور کیا جائے، اور جرمن نیشنل کمیشن اور یونسکو سے صرف ایسی ترمیم کرنے کو کہا جائے جو سفارشوں کو رائج قاعدوں کے مطابق ترتیب دینے کے لئے ضروری ہو۔ اس طریقہ کار کو منظور کرنے کے بعد سفارشوں پر بحث شروع ہوئی۔ دوسری سفارش پر گاڑی رک گئی۔ اتفاق سے چائے کا وقت ہو چکا تھا، اس لئے چائے پینے اور ذہنی فضا کو بہتر کرنے کے لئے جلسہ ملتوی کیا گیا۔ لیکن کھانے کے وقت تک کوئی ساٹھ سفارشوں میں سے صرف سات آٹھ منظور ہو سکی تھیں۔ کھانے کے لئے جلسہ ملتوی ہوا تو مجھ سے ایک امریکی نمائندے نے کہا کہ جلسہ میں میں یہ تجویز دوبارہ پیش کرنے والا ہوں کہ کانفرنس کی رپورٹ میں سفارشیں نہ رکھی جائیں۔ میں نے جواب دیا کہ ایسا ہرگز نہ کیجئے، بلکہ ممبروں سے کہیئے کہ جس سفارش کے متعلق کوئی بڑا اصولی اختلاف نہ ہو اسے بغیر بحث کے منظور کر لیں۔ جلسہ شروع ہونے سے پہلے جرمن نیشنل کمیشن کے سکریٹری نے مجھ سے کہا کہ ممبروں کو مطلع کیجئے کہ مترجم کا جہاز ۱۱ بجے رات کو جا تا ہے، اسے دو مرتبہ روکا جا چکا ہے، اب نہیں روکا جا سکے گا، اس لئے بحث مختصر کی جائے۔ میں نے کہا مجھے امید ہے کسی تنبیہ کے بغیر ہمارا کام ہو جائے گا۔ جب جلسہ شروع ہوا اور میں نے کسی سفارش کی عبارت پڑھ کر سنا دی اور پوچھا کہ کیا یہ منظور ہے تو ہر طرف سے

"منظور" "منظور" کی صدائیں آنے لگیں پروفیسر موننسکی پر اس فضا کا اثر نہیں ہوا، ایک موقع پر مجھے درخواست کرنی پڑی کہ میری خاطر اپنا اعتراض واپس لے لیجئے، مگر کام میں رکاوٹ ڈالنا ان کا منشا بالکل نہیں تھا، اور دوسرے ممبران کے ہر معقول اعتراض کو فوراً مان بھی لیتے تھے، اس لئے ایک گھنٹے کے اندر تمام سفارشیں منظور ہو گئیں۔

کانفرنس نے سفارشوں کی ترتیب کے بارے میں طے کیا کہ یونسکو نیشنل کمشنوں، قومی حکومتوں درسی کتابوں کے ناشروں، مختلف مضامین کے استادوں سے جو سفارشیں کی گئی ہوں انھیں الگ الگ رکھا جائے، اور باقی "عام سفارشوں" کے تحت رکھی جائیں۔ یونسکو سے جو سفارشیں کی گئیں ان میں سے میرے نزدیک خاص طور پر تین قابل توجہ ہیں۔ ایک سفارش یہ ہے کہ چونکہ درسی کتابوں کو بدلنا یا ان میں ترمیم کرنا لمبا اور مشکل کام ہے، اس لئے استادوں کی معلومات میں اضافہ کرنے اور ان کے درس کو بین اقوامی مفاہمت اور مختلف تہذیبوں کی قدرشناسی کے لئے مفید بنانے کی خاطر کتابیں یا کتابچے تیار کئے جائیں۔ دوسری سفارش یہ ہے کہ یونسکو کو براہ راست استادوں کی انجمنوں سے تعلقات پیدا کرنا اور انھیں مطلع کرنا چاہیئے کہ یونسکو سے ان کو کس کس طرح کی مدد مل سکتی ہے۔ تیسری سفارش یہ ہے کہ یونسکو کو استادوں کی تربیت کے نصابوں میں زیادہ وسعت پیدا کرنے کی تدبیریں اختیار کرنا چاہیئے، تاکہ استاد اپنی ذاتی معلومات کی بنا پر درسی کتابوں کی کمیاں پوری کر سکیں۔

ملکوں کے اندر یونسکو کے تعلیمی اور تہذیبی مقاصد حاصل کرنے کے لئے جو قومی کمیشن ہیں ان سے کئی سفارشیں کی گئی ہیں۔ انھیں ابتدائی اور ثانوی مدرسوں کی درسی کتابوں کو بہتر بنانے کے لئے کمیٹیاں مقرر کرنی چاہئیں جن میں درسی کتابوں کے ناشروں کے نمائندے بھی ہوں۔ انھیں یہ معلوم کرنا چاہیئے کہ ملک کے اندر کون سے ادارے اور جماعتیں ہیں جو تہذیبی مفاہمت کے منصوبے کو ترقی دے سکتے ہیں، انھیں اس کی کوشش کرنا چاہیئے کہ درسی کتابوں کی چھپائی اور اشاعت سے پہلے ہی ان کی جانچ کر لی جائے، انھیں درسی کتابوں کے ناشروں اور استادوں کی انجمنوں کو تعاون کی صورتیں نکالنی چاہئیں، تہذیبی مفاہمت کے سلسلے میں جو بھی مختلف کام ہو رہے ہیں ان کے درمیان رابطہ پیدا کرنا چاہیئے، اور یونسکو سے جو مواد حاصل ہو اسے اپنے ملک میں [illegible]

کارآمد بنانے کی تدبیریں کرنا چاہیئے۔ قومی حکومتوں سے سفارش کی گئی ہے کہ وہ نیشنل کمیشن کے لئے ضروری وسائل، خاص طور سے مالی وسائل فراہم کرتی رہیں، اور اگر ضرورت ہو تو نصاب کی کتابوں سے سیاسی اور فوجی تاریخ سے ایسی باتیں خارج کرنے میں جو تعصب اور عداوت پیدا کرتی ہیں، نصاب اور درسی کتابیں مرتب کرنے والی جماعتوں اور ایجنسیوں کی مدد کریں۔

تعلیم کا دارومدار استاد پر ہوتا ہے، اس لئے استادوں کی انجمنوں سے سفارش کی گئی ہے کہ وہ بھی اس پر غور کریں کہ تہذیبی مفاہمت کے مقصد کو پورا کرنے کے لئے کیا تدبیریں کی جا سکتی ہیں، اور انھوں نے تاریخ، جغرافیہ اور ادب سے شوق بڑھانے کے لئے جو سوسائٹیاں یا کلب بنائے ہوں ان کے پروگرام میں دنیا کے ان حصوں کے متعلق معلومات فراہم کرنا شامل کریں جن پر ابھی تک کم توجہ کی گئی ہے یا جنھیں نظر انداز کیا گیا ہے۔ استادوں سے اس کی بھی سفارش کی گئی کہ وہ نوجوانوں کی رہنمائی کے لئے مطالعے کے قابل کتابوں کی فہرستیں بنائیں، اور بری کتابوں کو پڑھنے کی ممانعت کرنے کے بجائے اچھی کتابیں پڑھنے کی ترغیب دلائیں۔

کانفرنس کی سب سے نمایاں خصوصیت ممبروں کا خلوص تھا۔ عام طور پر بین اقوامی مجلسوں میں ہر ملک کے لوگ اپنی قومی زندگی اور اپنی حکومت کے رویے کی حتی الامکان تعریف کرتے ہیں اور کسی خامی کو ظاہر کرنا مصلحت کے خلاف سمجھتے ہیں۔ گوسلار کی کانفرنس میں سیاسی بحثیں نہیں ہوئیں اور کام کے سلسلے میں جو رکاوٹیں پیش آتی ہیں انھیں بے تکلفی سے بیان کیا۔ متحدہ ریاستوں میں بعض چھوٹی اور بیشتر مقامی مگر خاصی طاقت ور پارٹیاں یونسکو کے بہت خلاف ہیں، اور کبھی کبھی ایسا ہوا ہے کہ استادوں کو یونسکو کے بارے میں تعلیم دینے کی سزا میں برطرف کر دیا گیا۔ دوسرے گروپ کی تجویزوں میں ایسی دباؤ ڈالنے والی جماعتوں کا ذکر تھا۔ چونکہ کسی ملک کا نام نہیں دیا گیا تھا، صرف "بعض" ملکوں کے حوالے سے بات کہی گئی تھی، میں نے کہا کہ کمیونسٹ اس سے یہ نتیجہ نکالیں گے کہ بیجا دباؤ ڈالنے والی جماعتوں سے مراد جمہوری ملکوں کی کمیونسٹ پارٹیاں ہیں، اور انھیں اس پر اعتراض ہوگا۔ تب یہ راز کھلا کہ تجویز ایک امریکی ممبر کی تحریک پر رپورٹ میں شامل کی گئی تھی، اور امریکی ممبر نے مجھے یقین دلایا کہ اس سے مراد ان کے اپنے ملک کی رجعت پسند پارٹیاں ہیں،

کیمونسٹ ہرگز نہیں ہیں۔ آج کل وہ لوگ جو دل سے بین اقوامی مفاہمت کے خواہش مند ہیں اپنے ملکوں کے سیاسی نظام سے نہیں تو حکومتوں کے طریق کار سے بیزار ہیں۔ حالات میں تبدیلی کرنا ان کے بس میں نہیں ہے، اور شکایت کرنے سے دشواریاں بڑھتی ہیں۔ اس لئے وہ صرف اپنے کام سے جو لگاؤ ہے اسے ظاہر کر سکتے ہیں اور ایک سے دوسرے کو حق کے ساتھ صبر پر متفق ہونے کی تلقین کر سکتے ہیں۔

عنفوانِ شباب کے مسائل

ڈاکٹر سلامت اللہ

کہتے ہیں کہ فرد کی زندگی کی کسی اور منزل پر اتنے پیچیدہ مسائل نمودار نہیں ہوتے جیسے کہ عنفوانِ شباب کی منزل پر۔ والدین اور اساتذہ دونوں اس عمر کے لڑکے لڑکیوں کی تعلیم و تربیت میں خاص قسم کی دشواریاں محسوس کرتے ہیں۔ مگر یہ بات صحیح نہیں ہے کہ اس منزل پر کوئی غیر معمولی تبدیلی یکدم رونما ہوجاتی ہے۔ نشوونما کا عمل ایک مسلسل اور اٹوٹ عمل ہے۔ اس کی مختلف منزلوں کے درمیان کوئی متعین حدِ فاصل نہیں ہے کہ ایک منزل یہاں ختم ہوئی اور دوسری وہاں شروع ہوئی۔ ہر ایک منزل دوسری میں رفتہ رفتہ مدغم ہوجاتی ہے۔ مگر ہر ایک منزل دوسری منزلوں سے اپنی خصوصیات کی بنا پر ممیز کی جاسکتی ہے۔ اور یہ خصوصیات مخصوص مسائل کا پیش خیمہ بنتی ہیں۔ ان مسئلوں کا جاننا اور سلجھانا ان کے لئے بہرحال ضروری ہے جن کے ذمے بچوں کی پرورش اور تعلیم و تربیت کا کام ہے۔ اس اہم کام کا ایک بڑا حصہ استاد کے ذمے ہوتا ہے۔ یوں تو نشوونما کی ہر منزل کے مسئلے استاد کی توجہ کے مستحق ہیں، لیکن عنفوانِ شباب کے مسائل اس کے خاص غور و فکر کے محتاج ہیں۔ اس بات کی اہمیت اس لئے اور زیادہ بڑھ جاتی ہے کہ اس منزل کے بعض مسائل ایسے ہیں کہ جن کا حل کرنا تو دور کی بات ہے ان کا ذکر کرنا تک ہماری موجودہ تہذیب میں شجرِ ممنوعہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

عنفوانِ شباب زندگی کا وہ عبوری دور ہے، جو بچپن اور بلوغ کے درمیان واقع ہوتا ہے۔ اس وقت فرد کو نہ تو بچہ ہی کہا جا سکتا ہے اور نہ بالغ ہی۔ اگرچہ ابھی اس میں بالغ کی سی پختگی نہیں ہوتی۔ تاہم اب اس کے ساتھ بچے جیسا سلوک بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اور نہ ہی اسے بالغ کی طرح ذمہ دار اور خودمختار قرار دیا جا سکتا ہے۔ عام طور پر زندگی کی اس منزل کو ایک مخصوص عمر کے ساتھ وابستہ کیا جاتا ہے۔ مثلاً یہ قیاس کیا جاتا ہے کہ یہ دور تیرہ اور انیس سال کے درمیانی وقفے یعنی سات سال پر مشتمل ہے۔ مگر ماہرینِ نفسیات کا خیال ہے کہ اس منزل کی حدبندی اس طرح نہیں کرنی چاہیئے۔ ان کے نزدیک اس کا تعلق محض جسمانی

شواہد سے نہیں، بلکہ کسی قوم کے سماجی حالات سے بھی ہے۔ اگر ایک سماج میں فرد کو بالغ کی ذمہ داریاں دیر میں سپرد کی جاتی ہیں تو وہاں عنفوان شباب کا دور دیر تک قائم رہتا ہے مثلاً امریکہ میں اب تقریباً چوبیس پچیس سال کی عمر تک فرد پر خاندانی ذمہ داریاں عائد نہیں ہوتیں اور وہ اس زندگی کی تیاری کے لئے مختلف قسم کی تعلیم و تربیت حاصل کرنے میں مصروف رہتا ہے۔ اس لئے وہاں عنفوانِ شباب کی منزل چوبیس پچیس سال کی عمر تک جاری رہتی ہے۔ ہمارے سماجی نظام میں بلوغیت کی ذمہ داریاں نسبتاً کم عمری میں اٹھانی پڑتی ہیں۔ ہمارے یہاں ابتدائی تعلیم ختم کرنے کے بعد جو بچے ثانوی مدرسے میں داخل ہوتے ہیں، ان میں سے اکثر اپنے عنفوانِ شباب کا دور وہیں ختم کرتے ہیں۔ اس لئے اس دور کی امتیازی خصوصیات اور مسائل کا علم ثانوی مدرسے کے استادوں کے لئے از بس ضروری ہے۔

اس منزل میں فرد طرح طرح کی تبدیلیوں سے دوچار ہوتا ہے بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ گویا ایک نئے جسم اور ایک نئے ذہن کا جنم ہوتا ہے۔ وہ تمام تبدیلیاں جو اس وقت اس کے جسم، ذہن اور اخلاقی تصورات میں پیدا ہوتی ہیں، انواع و اقسام کی پیچیدگیوں اور الجھنوں کا سبب بنتی ہیں۔

جسمانی اعتبار سے دیکھیئے تو اس دور میں قد، وزن، شکل و صورت، آواز اور جسم کی اندرونی بناوٹ میں نمایاں تغیرات نظر آتے ہیں۔ جب عالم شباب کی نشانیاں ظاہر ہوتی ہیں تو نشوونما کی رفتار تیز تر ہو جاتی ہے، بعض کا قد تو ایک ایک سال کے اندر چھ چھ انچ تک بڑھ جاتا ہے اور بعض کے وزن میں بیس بیس تیس تیس پونڈ تک اضافہ ہو جاتا ہے۔ اس غیر معمولی تبدیلی سے نہ صرف نوجوان مختلف قسم کی الجھنوں میں مبتلا ہو جاتا ہے بلکہ اس کے والدین کو بھی طرح طرح کے مسائل پیش آتے ہیں۔ اس زمانہ میں تیزی سے بڑھتے ہوئے جسم کے لئے مزید غذا کی ضرورت ہوتی ہے اور بھوک بہت شدت سے محسوس ہوتی ہے۔ مگر اکثر والدین اور بڑوں کی ناسمجھی کی وجہ سے نوجوان کو طعن و تشنیع کا نشانہ بننا پڑتا ہے۔ کوئی اس کی بھوک کو جتے بہتر سے تعبیر کرتا ہے، کوئی کہتا ہے کہ لڑکا کیا ہے دیو ہے کہ کھاتا ہی چلا جاتا ہے اس کا جہنم بھرتا ہی نہیں۔ اس قسم کے غیر ہمدردانہ رویئے سے نہ صرف وہ جسمانی تسکین سے محروم رہتا ہے بلکہ وہ ایک پریشان کن ذہنی کش مکش میں بھی مبتلا ہو جاتا ہے

دوسرا مسئلہ جو والدین کے سامنے آتا ہے وہ ہے لباس سے متعلق جوتا خریدتے ہی چھوٹا ہو جاتا ہے آستینیں مسلسل چھوٹی ہوتی رہتی ہیں۔ کُرتے اور پائجامے بہت جلد اونچے ہو جاتے ہیں! ایسی صورت میں خصوصاً غریب والدین کو بڑی دشواری محسوس ہوتی ہے۔ کہاں تک نئے جوتے خریدے جائیں اور نئے کپڑے سلوائے جائیں۔ لہٰذا اس زمانے میں ذرا ڈھیلی ڈھالی چیزیں مہیا کرنی چاہئیں۔ جن میں تیزی سے بڑھتے ہوئے جسم کے لئے کسی قدر گنجائش موجود ہو۔

قد اور وزن میں غیر معمولی اضافے کے علاوہ اس دور میں شکل و صورت میں بھی خاص تبدیلیاں نمودار ہوتی ہیں۔ لڑکے اور لڑکی دونوں کی ظاہری شباہت بالغوں کی سی ہو جاتی ہے۔ کندھے چوڑے ہو جاتے ہیں، بازوؤں کے پٹھے اُبھر آتے ہیں اور جبڑوں کی ہڈیاں خاص طور پر نمایاں ہو جاتی ہیں۔ عام طور پر جسم چھریرا ہو جاتا ہے، اعضائے تناسل سنِ بلوغ کی جسامت اختیار کر لیتے ہیں۔ آغازِ شباب کے وقت ان اعضاء کی نشوونما کی رفتار نمایاں طور پر تیز ہوتی ہے۔

بچپن کی پیاری، میٹھی، اور سریلی آواز، بھونڈی اور بھدی ہو جاتی ہے۔ نوجوان اپنی آواز کو سنبھالنے کی بہت کوشش کرتے ہیں مگر بے سود۔ یہ بات ان کے لئے تشویش کا سبب بن جاتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ بات چیت کرتے ہوئے جھینپتے ہیں۔ اگر انھیں اس وقت ہمدردانہ لہجے میں بتا دیا جائے کہ ان کی آواز خود بخود کچھ عرصہ بعد ٹھیک ہو جائے گی تو ان کی بے جا پریشانی دور ہو سکتی ہے۔

نوجوانوں میں ان کی غیر معمولی جسمانی نشوونما سے جو جذباتی کیفیت پیدا ہوتی ہے، وہ ان کے لئے مُضر ہے بعض نوجوانوں کو ایک خوف سا محسوس ہوتا ہے اور وہ کچھ بجھے بجھے اور کچھ مرجھائے ہوئے سے معلوم ہوتے ہیں۔ وہ اپنی شکل و صورت کی تبدیلی پر ایک بے تکا پن سا محسوس کرتے ہیں یہاں مجھے ایک واقعہ یاد آگیا۔ جامعہ کے مدرسۂ ابتدائی کی جماعت ششم میں ایک لڑکا تھا، اس کا قد گرمی کی تعطیلات میں کئی انچ بڑھ گیا، تعطیلات کے بعد جب اس کی جماعت کے تمام لڑکے قد کے لحاظ سے ایک قطار میں کھڑے کئے گئے، تو اسے پہلے نمبر پر کھڑا ہونا پڑا۔ حالانکہ اس سے پہلے وہ تیسرے نمبر پر کھڑا ہوا کرتا تھا۔ اس موقع پر اس کے چہرے سے حجاب اور پریشانی کے آثار نمایاں

تھے۔ وہ اپنی گردن نیچے کئے ہوئے تھا اور اپنی پنڈلیوں کو سکوڑنے کی کوشش کر رہا تھا، اس کے ساتھی ہنس رہے تھے، اس سے وہ اور بھی زیادہ خفیف ہو رہا تھا۔

اس منزل پر نوجوان کو جس چیز سے سب سے زیادہ فکر و تشویش محسوس ہوتی ہے وہ ہے اس کے جنسی عمل کی پختگی کا ظہور۔ جب کسی لڑکے کو پہلی بار احتلام کا تجربہ ہوتا ہے تو اس پر ایک ہیجانی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ اگر اسے اس نئے جسمانی عمل کی وجہ نہیں معلوم ہوتی یا غلط وجہ معلوم ہوتی ہے تو وہ اس کی فکر میں گھلنے لگتا ہے۔ اوسط درجے کے لڑکوں میں یہ واقعہ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد رونما ہوتا رہتا ہے۔ والدین اور اساتذہ کا فرض ہے کہ وہ انھیں اس عمر میں پہلے سے آگاہ کریں کہ اس قسم کا واقعہ ایک فطری عمل ہے، نہ یہ کوئی بری بات ہے اور نہ اس سے ڈرنے کی ضرورت ہے۔ لیکن ہمارے سماج میں بدقسمتی سے زیادہ تر نوجوان، اس معاملہ میں بالکل بے خبر رکھے جاتے ہیں۔ وہ اس سے بہت حیران و پریشان ہوتے ہیں اور آسانی سے کسی مکار عطائی کے جال میں پھنس جاتے ہیں جو اس فطری عمل کو کسی بیماری سے تعبیر کر کے انھیں اور زیادہ ڈرا دیتا ہے اور علاج کے بہانے لوٹتا ہے۔ ہندوستانی اخباروں کے اشتہارات ملاحظہ فرمایئے۔ وہ اس شرمناک اور دیدہ دلیرانہ لوٹ کھسوٹ کی شہادت دیتے ہیں۔ ہمارے شہروں اور قصبوں کی دیواریں تک اس قسم کے اشتہاروں سے پاک نہیں ہیں۔ یہ تو ہوا لڑکے سے متعلق۔ اسی طرح اس لڑکی کے حال پر غور کیجئے جسے پہلے سے حیض کے متعلق کوئی معلومات بہم نہیں پہنچائی گئی ہے۔ جب اسے سب سے پہلے اس عمل کا تجربہ ہوتا ہے تو وہ شدید خوف، ذہنی پریشانی اور ناپسندیدہ جذبات کا شکار بن جاتی ہے۔ بعض اوقات لڑکیاں اس جذباتی اور ذہنی الجھن میں مہینے گزار دیتی ہیں اور ان بیچاریوں کی کوئی مدد نہیں کرتا۔ نوجوانوں کو اس قسم کے جسمانی حوائج سے باخبر کرنے کی اشد ضرورت ہے، لیکن اس سلسلے میں ایک بات یاد رکھنی چاہیئے کہ اس بارے میں غلط معلومات بہم پہنچانا یا غلط طریقے سے تعلیم دینا اتنا ہی برا ہے، جیسا کہ اس سے قطعاً ناواقف رکھنا۔ جو لوگ نوجوانوں کو اس قسم کی معلومات فراہم کرنا چاہتے ہیں انھیں خود اس موضوع کا سائینٹفک علم حاصل کرنا چاہئے؛ نیز انھیں یہ بھی جاننا

چاہیئے کہ اس سے نوجوانوں کو روشناس کرنے کا پسندیدہ اور موثر طریقہ کیا ہے۔

جسمانی نشو ونما کی طرح اس منزل میں ذہنی نشو ونما کی وجہ سے بھی بعض مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ یہ عمر کا وہ زمانہ ہے جب کہ عقل کے پودے میں پھول لگتے ہیں۔ یعنی اس زمانے میں غور و فکر کی صلاحیت اجاگر ہوتی ہے۔ اس سے پہلے فرد آزادی اور کاوش سے کسی مسئلے پر غور و خوض نہیں کر سکتا تھا۔ اب تک اس کی بیشتر دلچسپیاں ٹھوس اور مقرون اشیاء کھیل کود وغیرہ تک محدود تھیں۔ مگر اب مجرد تصورات بھی اس کی دلچسپی کا مرکز بنتے ہیں۔ اس میں رفتہ رفتہ تعمیم (GENERALIZATION) کی قابلیت پیدا ہو جاتی ہے۔ یعنی وہ اس قابل ہو جاتا ہے کہ دیئے ہوئے واقعات سے نتیجہ نکال سکے اصول و قواعد وضع کر سکے۔ اس کے ذہنی مشاغل اب زیادہ سنجیدگی اختیار کر لیتے ہیں۔ وہ اب اپنے مستقبل کے متعلق سوچنے لگتا ہے۔ "میں کیا بنوں گا؟" "میں کیا کروں گا؟" اس دور میں آزاد خیالی اور خود اعتمادی کی صفات پروان چڑھتی ہیں۔ لیکن اس میں کامیابی یا ناکامی کا انحصار اس بات پر ہے کہ اس سے پہلے اس کی تعلیم و تربیت کس نہج پر ہوئی ہے۔ اگر والدین نے اسے محض ایک کھلونا سمجھ کر پالا پوسا ہے تو اس میں آزاد خیالی اور خود اعتمادی بہ مشکل پیدا ہو سکے گی۔ اس کے برعکس اگر والدین نے تعلیم و تربیت میں اس کی انفرادیت کا لحاظ رکھا ہے، تو ان خوبیوں کے پیدا ہونے کی قوی امید ہے۔ اوسط ذہنی استعداد کا بچہ جس کی عمر سات سال ہو چکی ہے اور وہ اب تک خود اپنے کپڑے نہیں پہن سکتا، اس کی ماں یا بہن اُسے اپنے ہاتھ سے کھانا کھلاتی ہے وہ رات کو اکیلا نہیں سو سکتا۔ ایسا بچہ دراصل اپاہج بنایا جا رہا ہے۔ اُسے ایک ایسے مرض میں مبتلا کیا جا رہا ہے جو اسے گھر سے کہیں دور جانے سے روکے گا۔ گویا وہ اپنے گھر کے اندر ہمیشہ کے لئے مقید ہو کر رہ جائے گا۔ ایسے بچے میں بعد ازاں آزاد خیالی اور خود اعتمادی کے اوصاف پیدا کرنا بہت مشکل ہو گا۔ وہ ہمیشہ اپنے بڑوں کا دست نگر رہے گا۔ دراصل والدین کے سامنے یہ ایک نازک مرحلہ ہے کہ وہ اپنی اولاد کی تربیت میں کیا رویہ اختیار کریں۔ معقول رویہ تو یہ ہو گا کہ نوجوان کو نہ تو اچانک بے نکیل کے اونٹ کی طرح آزاد چھوڑ دیا جائے اور نہ ہی ہمیشہ کے لئے طوطے کی طرح پنجرے میں بند کر کے رکھا جائے۔ ہمارے نوجوانوں میں خود اعتمادی کے فقدان کی بڑی وجہ یہ ہے کہ والدین

اور خصوصاً ماؤں کا میلان طبع انھیں اپنے بچوں کو نجی ملکیت سمجھنے پر مجبور کرتا ہے۔ اور انھیں اس خیال سے بڑی تکلیف ہوتی ہے کہ ایک دن ان کی اولاد ان کی توجہ اور سرپرستی سے بالکل بے نیاز ہو جائے گی۔

زندگی کی اس منزل پر یہ مسئلہ بھی سامنے آتا ہے کہ نوجوان بالآخر اپنی روزی کمانے کا کون سا طریقہ اختیار کرے گا۔ مدرسے کا فرض ہے کہ اس معاملے میں اس کی مناسب رہنمائی کرے۔ ہوائی قلعے بنانے سے آخر میں جو مایوسی اور صدمہ ہوتا ہے، اس سے جہاں تک ہو سکے نوجوان کو بچانا چاہیئے۔ اس سلسلے میں اُسے اور اس کے والدین کو چند بنیادی باتیں سمجھانے کی ضرورت ہے۔

١۔ مختلف پیشوں کے لئے مختلف قسم کی ذہنی صلاحیت اور عملی تیاری درکار ہوتی ہے۔

٢۔ سماجی زندگی کی تنظیم میں اعلیٰ سے اعلیٰ اور ادنیٰ سے ادنیٰ ہر قسم کی ذہنی صلاحیت کی ضرورت ہے۔

٣۔ نہ تو آبائی پیشے کو زبردستی نوجوانوں کے گلے باندھا جا سکتا ہے اور نہ ہی فقط والدین اور اپنی خواہش کی بنا پر کسی مخصوص پیشے کو اختیار کیا جا سکتا ہے۔

حال میں مغربی ملکوں میں ثانوی مدرسے کے طلبہ کی پیشہ ورانہ رہنمائی کے میدان میں بہت بڑی ترقی ہوئی ہے۔ وہاں تجربے سے معلوم ہوا ہے کہ جن نوجوانوں نے وہ پیشے اختیار کئے جن کا مشورہ مختلف قسم کی جانچوں کی بنا پر انھیں دیا گیا تھا وہ اپنے پیشے میں ان لوگوں کے مقابلے میں زیادہ کامیاب ہوئے جو اس قسم کے مشورے سے محروم رہے تھے۔ اس مقصد کی خاطر ثانوی مدرسے میں مختلف قابلیتوں اور رجحانوں کے لحاظ سے طلبہ کے لئے مختلف قسم کے نصابوں کا التزام کیا جاتا ہے۔ اگر کوئی طالب علم یا اس کے والدین کسی ایسے پیشے کے آرزومند ہوتے ہیں جس کے لئے ایک خاص قسم کی ذہنی استعداد کی ضرورت ہے اور وہ اتفاق سے اس طالب علم میں موجود نہیں ہے تو مدرسہ اُسے اس بات سے آگاہ کر دیتا ہے اور کسی دوسرے مناسب پیشے کی سفارش کرتا ہے۔ اور وہ طالب علم نصاب انتخاب کرنے یا پیشہ اختیار کرنے میں غلط قدم اٹھانے سے بچ جاتا ہے اور اُسے بعد کی ناکامیوں کے تلخ تجربے سے دوچار نہیں ہونا پڑتا۔ اب ہمارے ملک میں بھی ایسی ہی ایک کوشش کثیر المقاصد مدارس (MULTIPURPOSE SCHOOLS) کے تحت شروع کی گئی ہے۔ مگر ابھی جا [illegible] ایسے بہت کم ادارے ہیں اور جو ہیں بھی [illegible] وہ مقبولیت حاصل نہیں کر سکے ہیں۔ ان [illegible] صاحب کا کتنا [illegible]

اور ناکارہ بیٹا تعلیم اور پیشہ کے معاملے میں ایک پیچیدہ مسئلہ بن جاتا ہے۔ باپ کو اس وقت تک تسکین نہیں ہوتی جب تک کہ بیٹا دھن دولت اور شہرت کے لحاظ سے اس سے زیادہ یا کم از کم اس کے برابر مرتبہ حاصل نہیں کر لیتا۔ اس لئے وہ اپنے بیٹے کو اپنی سماجی حیثیت کے مطابق اچھے سے اچھے تعلیمی اداروں میں داخل کراتا ہے اور اس کے نزدیک اچھا ادارہ وہی ہے جہاں اخراجات زیادہ ہوں اور جہاں صرف ان ہی لوگوں کے بچے تعلیم حاصل کر سکیں، جو اپنی سماجی حیثیت کے اعتبار سے کم از کم اس کے ہم پلہ ہوں۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ اپنی اولاد پر ولایتی سند کا ٹھپہ لگوانے کے لئے ہزاروں روپیہ ضائع کر دیتا ہے۔ اسی طرح ہمارے دیس میں اس لڑکے کا مسئلہ بھی خاصا پیچیدہ ہے جو کسی گم نام اور نادار باپ کا بیٹا ہے، لیکن جسے قدرت نے اعلیٰ ذہنی صلاحیتیں بخشی ہیں۔ اس بے چارے کو ترقی کرنے کے خاطر خواہ مواقع میسر نہیں ہوتے۔ اور یہ کلی بغیر کھلے مرجھا جاتی ہے۔ غور سے دیکھئے تو نہ صرف یہ اس کا ذاتی نقصان ہے بلکہ یہ ایک قومی خسارہ بھی ہے۔ اس کی خداداد صلاحیتیں بروئے کار نہیں آتیں، تو قوم بھی اس کی ذات سے فائدہ نہیں اٹھا سکتی۔ اس قومی خسارے کو روکنے کے لئے کوئی نہ کوئی تدبیر ضرور کرنی چاہیئے۔ خوشی کی بات ہے کہ ابھی حال میں حکومت ہند نے ایسے ہونہار طلبہ کی تعلیم کے لئے معقول امداد کی فراہمی کا اعلان کیا ہے۔ مدرسے کا فرض ہے کہ طلبار کی صلاحیتوں اور کوتاہیاں مناسب طریقوں سے معلوم کرے اور والدین کو برابر باخبر رکھے، تاکہ وہ اپنی اولاد سے دور از کار امیدیں وابستہ کرنے سے باز رہیں۔ اور وہ خود اور ان کی اولاد دونوں اس مایوسی اور خفت سے بچ سکیں جو ناقابل حصول مقاصد میں ناکامی کی صورت میں ہوتی ہے۔

عام طور پر ایک ناتجربہ کار نوجوان پیشہ ورانہ زندگی میں داخل ہونے کے لئے کوئی دروازہ ڈھونڈتا ہے۔ اُسے کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ تمام اچھی آسامیاں پہلے سے پُر ہیں یا اس کی دسترس سے باہر ہیں اور اُس کی کہیں بھی کھپت نہیں ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ اسے کوئی بھی کام نہیں ملے گا اور وہ مایوسی اور خوف وہراس کے عالم میں دن کاٹتا ہے۔ اور اس صورت حال میں جو کام بھی سب سے پہلے اس کے ہاتھ آجاتا ہے اسے بطور پیشہ اختیار کر لیتا ہے چاہے اُس کے لئے اس کی طبیعت موزوں ہو یا نہ ہو، لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ نوجوانوں کو اُن آسامیوں کے متعلق معلومات بہم پہنچائی جائے جن

کی ملک میں زیادہ مانگ ہے۔ ہر آزاد ملک میں جہاں کی حکومت عوام کی فلاح و بہبود کا خیال رکھتی ہے۔ اس قسم کے اعداد و شمار سرکاری طور پر باقاعدہ شائع کئے جاتے ہیں۔ مگر ہمارے ملک میں اس وقت اس کی بڑی کمی ہے۔ یہاں صرف چند ہی بڑے شہروں میں اس قسم کا انتظام ہے جہاں (EMPLOYMENT EXCHANGE) کو دفاتر کے ذریعے ضروری معلومات فراہم کی جاتی ہیں۔ پھر بھی اُس وحشت کو کسی حد تک کم کیا جا سکتا ہے جو خالی جگہوں کی کمی کے خیال سے نوجوانوں پر طاری رہتی ہے۔ اس بارے میں طلبہ کے زاویۂ نگاہ کو بدلنے کی کوشش کرنی ہوگی۔ انھیں یہ سمجھانا پڑے گا کہ ان آسامیوں کے بارے میں پریشان نہ ہوں، جن پر تجربہ کار لوگ فائز ہیں بلکہ ان آسامیوں کے متعلق سوچیں جو کہ اُن جیسے ناتجربہ کار لوگوں کے لئے خالی ہیں۔ اس طرح ان کی کامیابی کے امکانات بڑھ جائیں گے اور ان کی پریشانی بڑی حد تک دور ہو جائے گی۔

عنفوان شباب کی منزل میں بعض اہم سماجی اور اخلاقی مسائل بھی پیدا ہوتے ہیں۔ اس کی ایک وجہ جنسی قوت کا ظہور ہے۔ ہر ایک مہذب جماعت میں جنسی جبلّت کو عموماً ایک شیطانی اور ناپاک قوت سمجھا جاتا ہے۔ والدین اور اساتذہ سبھی اس فطری رجحان کو دبانے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن اس کا نتیجہ اکثر پسندیدہ نہیں ہوتا۔ نوجوان کی فطرت میں یہ چیز داخل ہے کہ اگر اُسے کسی کام سے زبردستی منع کیا جائے تو وہ بغاوت کرتا ہے اور اس کام کو کھلم کھلا یا چھپے چوری کرنے میں اسے فتح و کامرانی کا احساس ہوتا ہے جس عشق کی راہ میں طرح طرح کی رکاوٹیں حائل ہوں وہ اس کے لئے زیادہ تسکین اور کشش کا باعث ہوتا ہے۔ متوازن نشو و نما کے لئے ضروری ہے کہ نوجوانوں کو جنسِ مخالف کے ہم عمر افراد سے ملنے جلنے کا موقع دیا جائے۔ اس معاملے میں والدین اور بڑے بوڑھوں کا رویہ ہمدردانہ اور دانشمندانہ ہونا چاہیئے۔ مگر بدقسمتی سے ہمارے ہاں جب نوجوان لڑکے لڑکیاں سماجی زندگی میں ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں، تو اکثر بڑے بوڑھے ان کے میل ملاپ کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھتے ہیں کہ کچھ نہ کچھ دال میں کالا ضرور ہے اور بہت جلد دو خاندانوں کی ناک کٹنے والی ہے۔ لیکن یہ رویہ مناسب نہیں ہے۔ والدین کو اس معاملے میں نہ تو اتنی بے نیازی برتنی چاہیئے کہ ان کے لڑکے لڑکیاں جو چاہیں کریں اور نہ ہی انھیں اس قدر شکی ہونا چاہیئے کہ ہر وقت ان کی نگرانی ہر مرحلہ کی

طرح کرتے ہیں۔ ان دونوں طریقوں میں سے ایک بھی طریقہ مفید ثابت نہیں ہوگا جنسی معاملات میں بھی والدین کو اسی قسم کی دلچسپی ہونی چاہیئے، جیسی کہ وہ اپنی اولاد کی تعلیم و تربیت، اس کے مستقبل اور دوسرے مسائل میں رکھتے ہیں۔ علم نفسیات کے نزدیک مخالف جنسوں کے افراد کی باہمی دلچسپی اور محبت کوئی پیچیدہ مسئلہ نہیں ہے۔ البتہ وہ مسائل زیادہ مشکل ہیں جن کا تعلق غیر فطری جنسی مظاہر سے ہے مثلاً امرد پرستی، جلق وغیرہ۔ اور بدقسمتی سے ہمارے ملک میں اس قسم کے شواہد اکثر ظہور پذیر ہوتے ہیں اس لئے تعلیمی نقطۂ نظر سے یقینی یہ دانشمندانہ اقدام ہوگا کہ نوجوانوں کو جنسیات سے متعلق ضروری معلومات بہم پہنچائی جائے۔ مثلاً علم الاعضا کے سلسلے میں انہیں افزائش نسل کے عمل اور ضبط نفس کی ضرورت سے آگاہ کیا جائے کہ یہ جسمانی صحت، نفسیاتی توازن اور اقتصادی خوش حالی کا ضامن ہے صحیح طریقہ اختیار کیا جائے تو امید ہے کہ اوسط درجے کے ذہین نوجوان لڑکے لڑکیوں کو ضبطِ نفس کی ترغیب ہوگی۔ قانونی شادی کے علاوہ اور کسی دوسری قسم کے جنسی تعلقات سے جن امراضِ خبیثہ میں مبتلا ہونے کا احتمال ہے ان سے بھی نوجوانوں کو باخبر کر دینا چاہیئے۔

ضبط نفس کے حاصل کرنے کی بعض تدابیر بہت موثر ثابت ہوئی ہیں۔ کسی محرک کے زور کو ختم کرنے کا نفسیاتی طریقہ یہ ہے کہ توجہ کو دوسری دلچسپیوں کی طرف موڑ دیا جائے۔ ثانوی مدرسے میں ورزش اور کھیل کا اہتمام اس مقصد کے حصول میں معاونت کرتا ہے۔ اس قسم کے مشاغل نہ صرف جسمانی نشوونما کے لئے مفید ہیں بلکہ ان کی بدولت نوجوان کو جنسی باتوں پر سوچنے اور جسمانی لذتوں کو حاصل کرنے کی فرصت نہیں ملتی۔ مشہور ہے کہ خالی ذہن شیطان کا کارخانہ ہوتا ہے۔ کوئی پسندیدہ معروفیت نہ ہو تو کسی گھٹیا کام میں پھنسنے کا بہت امکان ہوتا ہے۔

عنفوانِ شباب کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس منزل میں فرد خیر و شر کے بنیادی مسائل پر غور و فکر کرنے کی طرف مائل ہوتا ہے۔ اس رجحان کو مذہب و اخلاقیات میں دلچسپی سے بھی تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ دراصل یہ سماجی اثرات کا نتیجہ ہے۔ چونکہ نوجوان میں غور و فکر کی صلاحیت رونما ہوتی ہے اس لئے وہ ان بنیادی تصورات کی طرف بھی متوجہ ہوتا ہے جو سماج میں عقیدہ کے طور پر جاری و ساری ہوتے ہیں۔ نوجوان پر دو بے پناہ قوتوں کا انکشاف ہوتا ہے جو بظاہر متضاد ہیں۔ ایک قوت تو اسے اپنی روح میں پوشیدہ معلوم ہوتی ہے اور دوسری قدرت میں۔ اسے اپنی روحانی قوت پر

اس قدر اعتماد ہوتا ہے کہ وہ خود کو ہر چیز کا اہل سمجھنے لگتا ہے. لیکن دوسری طرف جب اسے قدرت کی بے پایاں قوت کا ادراک ہوتا ہے، تو اسے اپنی بے چارگی اور بے مائگی کا شدید احساس ہوتا ہے۔ یہی مذہبی شعور کی بنیاد ہے۔ کبھی کبھی نوجوانوں کا مذہبی جذبہ دیوانگی کی حد تک پہنچ جاتا ہے. بعض اوقات وہ اسی محرک کی وجہ سے بہت متفکر اور گم سم سے دکھائی دیتے ہیں. کبھی کبھی دیکھا گیا ہے کہ وہ گھنٹوں مذہبی کتابوں کے مطالعہ میں غرق رہتے ہیں. بعض اوقات وہ تنہائی میں آنسو بہا کر دل کو ہلکا کرتے ہیں اور کبھی خود کو جسمانی اذیتیں پہنچا کر تزکیۂ نفس کی سبیل نکالتے ہیں۔ لہٰذا نوجوانوں کو تنہائی میں خالی وقت گزارنے کا کم سے کم موقع دینا چاہیئے اور جہاں تک ممکن ہو انھیں کسی عملی کام میں مصروف رکھنے کی تدبیر کرنی چاہیئے۔

بچپن کے زمانے میں بچہ سماجی قوانین کی پابندی بلا سمجھے بوجھے کیا کرتا ہے. مگر نوجوان میں سماجی شعور اجاگر ہوتا ہے اور وہ سمجھ بوجھ کر سماج کی معین کی ہوئی کسوٹی پر اپنی ذات کو پرکھنے اور پورا اُترنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس میں قربانی اور ایثار کا جذبہ بیدار ہوتا ہے وہ اپنی ذمہ داریوں کو سمجھنے لگتا ہے۔ لہٰذا جماعت اور مدرسے کے نظم ونسق میں نوجوانوں کو شرکت کرنے اور سماجی خدمات انجام دینے کے مواقع فراہم کرنے چاہئیں۔ اسکاؤٹنگ اور دیگر اجتماعی منصوبے بھی اس نقطۂ نظر سے مفید ثابت ہوں گے۔

نوجوان اپنے کردار کا محاسبہ خود کرتا ہے۔ وہ سوچتا رہتا ہے کہ کہیں اس کے قول و فعل میں کوئی چیز قابل اعتراض تو نہیں ہے۔ اسے اپنی شخصیت کے ہر پہلو کی خامیوں اور کمزوریوں کا احساس ہوتا ہے. کبھی کبھی وہ اپنی شکل وصورت کے بناؤ سنوار میں گھنٹے صرف کر دیتا ہے آئینے میں اپنے چہرے کو اکثر دیکھتا رہتا ہے۔ اپنے بازوؤں اور پاؤں کو جھکاتا، موڑتا رہتا ہے۔ اس بات کو بہت محسوس کرتا ہے کہ لوگ اسے کس طرح مخاطب کرتے ہیں، کس نظر سے دیکھتے ہیں۔ وہ اپنی ذات سے متعلق مختلف قسم کی قیاس آرائیاں کرتا رہتا ہے۔ اس وقت یہ بہت ضروری ہے کہ والدین اور اساتذہ اس کی ان باتوں کو ہمدردی کے ساتھ دیکھیں اور سمجھیں۔

اس دور میں نوجوان اپنی شخصیت کا کم وبیش ایک صاف نقشہ بنا لیتا ہے۔ وہ ان خوبیوں کو

اپنانے کی کوشش کرتاہے جو اس کے نصب العین کے حصول کے لئے لازمی ہیں۔ اس لئے نوجوان کے سامنے خاص طور پر اچھے کردار کے نمونے پیش کرنے چاہئیں، خلاً عظیم تاریخی شخصیتیں، زمانۂ حال کے بڑے آدمی اور گردونواح کے مقبول اشخاص وغیرہ۔ مگر یہاں اس بات کا خیال رکھا جائے کہ کہیں نوجوان کسی عظیم شخصیت کو بُت بنا کر پوجنے نہ لگے بلکہ رفتہ رفتہ اسے اس قابل بنایا جائے کہ وہ اخلاقی اصولوں کی روشنی میں دوسروں کو اور اپنی ذات کو پرکھ سکے اور اپنی اصلاح خود کرسکے۔ اس طرح ہوسکتاہے کہ اس کی ذات کسی شخص واحد کا چربہ نہ ہو، بلکہ اس کی شخصیت مختلف اشخاص کی خوبیوں سے عبارت ہو، مثلاً وہ اپنی شخصیت کی تعمیر میں کسی شخص کی ہمت وجواں مردی، کسی کی دیانت داری، خلوص اور نیک نیتی اور کسی کی حُب وطن یا انسان دوستی کو نمونہ سمجھ کر اپنائے۔ مدرسہ سیرت سازی کے عمل میں ڈرامے سے بھی مدد لے سکتاہے۔ نوجوان اداکار جب اسٹیج پر آتاہے تو وہ اپنے رول کی خصوصیات سے متاثر ہوتاہے۔ اس سلسلے میں یہ بات بہرکیف سامنے رکھنی چاہیئے کہ اس لڑکے یا لڑکی کو کسی بدمعاش (VILLAIN) کا پارٹ بھول کر بھی نہ دیا جائے جو فطری طور پر بُری باتوں کی طرف مائل نظر آتا ہو۔ اسی طرح اچھی فلموں سے بھی شخصیت کی تعمیر میں مدد لی جاسکتی ہے مگر یہ بات نہیں بھولنی چاہیئے کہ اس معاملے میں سب سے زیادہ موثر فرد کا اپنا قریبی ماحول ہے جس میں وہ رات دن رہتا سہتاہے۔ اس کے والدین، خاندان کے لوگ اور اساتذہ، اس کے ساتھی اور دوست، نیز گردونواح کے اشخاص یہ سبھی اس کی شخصیت پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اس لئے ماحول کو اچھے سے اچھا بنانے کی کوشش کرنی چاہیئے۔

نوجوان کی تلون مزاجی ایک مسلّمہ حقیقت ہے۔ اور اس بنا پر اسے اکثر بُرا بھلا کہا جاتاہے۔ لیکن اس معاملے میں دراصل وہ کلیتہً موردِ الزام نہیں ہے۔ اس میں ہماری تہذیب کا بھی ہاتھ ہے بعض جبلتیں اور میلانات جو اس عمر میں بڑی شدومد سے اُبھرتے ہیں، انھیں تہذیب معیوب قرار دیتی ہے۔ نوجوان جسمانی اعتبار سے ایسے بہت سے کام کرنے کا اہل ہوجاتاہے جن کے لئے موجودہ سماج مواقع فراہم نہیں کرتا۔ اس لئے اُسے بہت عرصے تک بچے کی سی زندگی گذارنی پڑتی ہے۔ بالغ بھی شاید موجودہ صورت حال سے مطمئن نہیں ہے، لیکن وہ اپنی سمجھ بوجھ کی بدولت کسی نہ کسی

طرح حالات کے ساتھ سمجھوتہ کرلیتا ہے۔ ظاہر ہے، یہ نوجوان کے بس کی بات نہیں ہے۔ وہ بیچارہ اپنے حالات پر قابو نہیں پا سکتا۔ اور جب اسے ناکامی ہوتی ہے، تو وہ ایک ہیبت ناک جذباتی کش مکش میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ اس لئے نوجوان کو یہ احساس دلانا مفید ہوگا کہ انسان کی ہر ایک آرزو پوری نہیں ہو سکتی۔ اس لئے اُسے صرف ان خواہشات پر اکتفا کرنا چاہیئے جو اس کے نزدیک سب سے زیادہ اہم ہیں۔

نوجوان کو ذہنی اور جذباتی کش مکش سے جو تکلیف ہوتی ہے، اس کے احساس کی شدت اس وجہ سے اور بڑھ جاتی ہے کہ وہ سوچتا ہے کہ میں ہی ایک بدنصیب ہوں جسے اس پریشان کن تجربے سے گزرنا پڑ رہا ہے۔ لہذا اسے اس بات کا احساس دلانا چاہیئے کہ یہ مسائل عالم گیر ہیں، اور کم و بیش سبھی نوجوانوں کو ان سے دوچار ہونا پڑتا ہے اور سبھی اسی طرح تکلیف اٹھاتے ہیں۔ ان مسائل کو حل کرنے کے لئے وسیع تخیل اور گہری ہمدردی درکار ہے۔ نوجوان کو اس طرح مسلح کرنا چاہیئے کہ وہ خود اپنی جنگ کامیابی سے لڑ سکے اور مشکلات کا ڈٹ کر مقابلہ کر سکے۔ تعلیم و تربیت کا یہی فریضہ ہے۔

مکاتیب شبلی

بنام مولانا ابوالکلام آزاد دہلوی

جناب ابوعلی اعظمی

مولانا شبلی گوناگوں حیثیتوں کے مالک تھے، اور اسی اعتبار سے ان کا حلقۂ احباب بھی بہت وسیع تھا جس میں ہندوستان کے ہر شعبۂ زندگی کے ممتاز افراد شامل تھے، ان میں سے ہر ایک سے ان کے تعلقات کی نوعیت مختلف تھی، اور ان سے خط وکتابت کا سلسلہ قائم تھا۔ انہی میں ایک مولانا ابوالکلام آزاد بھی تھے، جن سے پہلی مرتبہ ملاقات بمبئی میں ہوئی۔ اور اس پہلی ہی ملاقات میں دونوں بزرگ ایک دوسرے کی شخصیت سے بیحد متاثر ہوئے۔ اور اسی ملاقات و تاثر نے رفتہ رفتہ دوستی، یگانگت اور اخلاص و محبت کی صورت اختیار کر لی، جو مولانا شبلی کی زندگی تک قائم رہی، آج کی صحبت میں انہی کے نام مولانا شبلی کے چند خطوط پر ہم روشنی ڈالنا چاہتے ہیں،

تازہ خواہی داشتن گر داغہائے سینہ را
گاہے گاہے باز خواں ایں دفتر پارینہ را

ان دونوں بزرگوں میں مراسلت و مکاتیب کا سلسلہ مولانا ابوالکلام کے ندوہ کے زمانۂ قیام ہی میں شروع ہو گیا تھا، وہ ندوہ کے نائب ایڈیٹر تھے، اس کے لئے اداریہ لکھنے، لوگوں سے مضامین حاصل کرنے، اور پھر ان کے جمع و ترتیب کی خدمت انہی سے متعلق تھی جسے وہ مولانا شبلی کی نگرانی میں نہایت خوش اسلوبی سے انجام دیتے تھے، اس درمیان میں مولانا شبلی کو کسی ضرورت سے بھوپال جانا پڑا جہاں ان کا قیام خلاف توقع کچھ طویل ہو گیا، اس لئے خاص مضامین اور دوسرے امور کے متعلق خط لکھ کر ان سے استفسار کرنا ضروری تھا، چنانچہ اس سلسلہ میں مولانا ابوالکلام نے ان کو کئی خط لکھے، اور مولانا نے

ان کے جواب دئے، ایک خط میں تو کسی مضمون کے متعلق جو یہاں الندوہ کے فائل میں موجود تھا ہدایت ہے، دوسرے میں اپنے کسی نئے مضمون کی ڈاک سے بھیجنے کی اطلاع اور صحت کے ساتھ کاتب سے لکھوانے کی تاکید کی ہے، مولانا آزاد الندوہ کی سب ایڈیٹری کے فرائض کچھ اس طرح ادا کرتے تھے، کہ مولانا کو اطمینان نہیں ہوتا تھا، اور برابر اس کے لئے تاکید کرتے رہتے تھے۔ بھوپال گئے، تو وہاں بھی اس کا خیال رہا، اور الندوہ کے وقت پر شائع ہونے کی ان کو تاکید لکھی، مولانا آزاد اور اڈیٹروں کی طرح روزانہ کام کرنے کے عادی نہیں تھے، جس سے لوگوں کو شبہ رہتا تھا کہ الندوہ وقت پر شائع ہو سکے گا یا نہیں، لیکن جونہی اشاعت کا وقت قریب آتا، وہ مستعد ہو جاتے اور پرچہ مرتب کرکے پریس کے حوالہ کر دیتے، اور وہ وقت پر چھپ کر شائع ہو جاتا۔

چند ہی ماہ کے قیام کے بعد مولانا ابوالکلام ندوہ سے امرتسر چلے گئے، جہاں ان کا قیام مولانا سید سلیمان ندوی صاحب حیات شبلی کی روایت کے مطابق دو سال رہا، اسی دوران میں انھوں نے اپنے بھائی مولانا ابوالنصر غلام یسین آہ کی معیت میں مشرق وسطیٰ کا سفر کیا، ابھی وہ بغداد ہی میں تھے کہ یکایک ان کے بھائی بیمار پڑ گئے، اور مرض نے شدت اختیار کر لی، اور وہ اسی حالت میں تنہا بمبئی واپس آگئے، جہاں کچھ دنوں کے بعد ان کا انتقال ہو گیا، مولانا ابوالکلام عراق، شام و موصل اور شمالی ایران کی سیاحت سے واپس آئے، تو اس کے دو ہی ایک سال کے بعد ان کے والد بھی وفات پا گئے، رحلت کے وقت انھوں نے مولانا ابوالکلام کو امرتسر سے بلوا کر اپنا جانشین بنایا اور وہ اپنے والد کی جگہ ہدایت و ارشاد خلق میں مصروف ہوئے، اور اسی سلسلے میں بمبئی میں جہاں ان کے والد کے ہزارہا مرید تھے۔ پہلے قیام کیا۔ پھر کلکتہ میں مستقل سکونت اختیار کر لی، جو بعد میں ان کی ہر قسم کی سیاسی و قومی، ملی و ادبی و صحافتی سرگرمیوں کا مرکز بن گیا۔ مولانا شبلی سے خط و کتابت کا سلسلہ درحقیقت یہیں سے شروع ہوتا ہے جو مولانا کی وفات نومبر ۱۹۱۴ء تک رہا، آخری وہ تار تھا جو مولانا شبلی نے اپنی وفات سے تین دن پہلے ۱۵ نومبر ۱۹۱۴ء کو کلکتہ کے پتہ سے ان کو بھیجا تھا، یہ تار ان تمام تاروں سے لمبا تھا، جو

بیماری کے آخری دنوں میں مختلف لوگوں کو دیئے تھے، ان کو سیرۃ کی تکمیل کے متعلق مشورہ کرنے کے لئے اعظم گڑھ بلایا گیا تھا، لیکن ان میں سے کوئی بھی وقت پر نہیں پہنچ سکا، اور مولانا ابوالکلام کو تو وہ تار ہی نہیں ملا، اور وہ نہ آسکے، اور مولانا شبلی یہ حسرت اپنے ساتھ لے گئے۔

دار المصنفین کے قیام کے بعد مولانا سید سلیمان نے مولانا شبلی کے خطوط کے جمع و ترتیب کا ارادہ کیا تو مولانا ابوالکلام کو بھی اس کے متعلق لکھا، انھوں نے جواب میں لکھا کہ

"مولانا شبلی مرحوم و مغفور کے مکاتیب مشکل ہے کہ مل سکیں کچھ ملے تو پرائویٹ معاملات یا ندوہ کے متعلق ہیں، اور ان کی اشاعت غیر ضروری"۔

بہرحال سید صاحب کے اصرار سے مولانا شبلی کے تمام خطوط جو ان کے پاس محفوظ رہ گئے تھے انھوں نے سید صاحب کے حوالے کر دئے، اور وہ مکاتیب شبلی جلد اول کے پہلے اڈیشن میں آگئے، ان میں سے جو بعد کو دستیاب ہوئے وہ دوسرے اڈیشن کے اوراق کی زینت بنے، ان سب کو ملا کر خطوط کی تعداد ۳۳ ہو جاتی ہے۔ یہ خطوط زیادہ تر علمی ہیں، مولانا نے ان میں یا تو علمی مشاغل کا تذکرہ کیا ہے یا کوئی نئی یا پرانی کتاب کہیں سے ہاتھ آگئی ہے، تو اس کی اطلاع ان کو دی ہے، اور اس مسرت میں، ان کو بھی شریک کرنا چاہا ہے۔

شروع کے چند خطوط تو بالکل کاروباری ہیں، یعنی نو عمر مدیر الندوہ کو بعض زیر ترتیب مضامین کے متعلق ہدایات ہیں، بقیہ تمام تر علمی و ادبی ہیں، جن کے بار بار پڑھنے سے بھی ذوق کو تسکین نہیں ہوتی۔ پھر ان میں غایت محبت و تعلق کی بنا پر اور زیادہ کیف پیدا ہو گیا ہے۔ کاش کہ وہ سب خطوط محفوظ ہوتے اور مکاتیب شبلی کی ایک جلد تنہا انہی کے نام کے خطوط پر مشتمل ہوتی، اور ہم اس سے اپنے ذوق کی تسکین کا سامان بہم پہنچاتے۔

مولانا شبلی علم و دانش، فضل و کمال، شہرت و عزت اور عظمت و جلال کی جس معراج پر تھے، اس سے یہ توقع کرنا، کہ انھوں نے بھی ان نوجوان دوست کے عقیدت ناموں کو محفوظ رکھنے کا اہتمام کیا ہوگا، ذرا مشکل ہے، لیکن مولانا شبلی کے نام ان کے ایک آدھ خط حسن اتفاق سے جو مل گئے ہیں، ان سے اندازہ ہوتا ہے، کہ عقیدت و محبت و نیاز مندی کے ان نذرانوں کی حفاظت کا اہتمام

ضرور کیا گیا تھا، لیکن امتداد زمانہ سے وہ محفوظ نہیں رہے، اور ضائع ہو گئے، ورنہ کون کہہ سکتا ہے کہ ایک اور غبار خاطر انہی خصوصیات و امتیازات کے ساتھ جن کا وہ حامل ہے، تیار نہ ہو جاتا، اور اردو کی صنفِ خطوط نگاری کے ذخیرہ میں ایک اور بیش قیمت چیز کا اضافہ نہ ہو جاتا۔

مولانا شبلی کے خط و کتابت کا دائرہ بہت وسیع تھا، اس میں سر سید اور محسن الملک سے لے کر منشی سید افتخار عالم صاحب مارہروی مولف حیات النذیر، مولوی حامد حسین قادری بچھرایونی مولف داستان اردو تک سبھی شامل تھے، ان میں سے ہر ایک کے ساتھ ان کے تعلقات کی نوعیت مختلف تھی، لیکن وہ جتنا کھل کر مولانا ابوالکلام کو خط لکھتے تھے، کسی کو بھی نہیں لکھتے تھے، ان سے کوئی پردہ نہیں تھا، سب کچھ ان پر ظاہر کر دیتے تھے، ان کے احباب و اعزا و تلامذہ کے وسیع حلقہ میں یہ اختصاص کسی کو بھی حاصل نہیں تھا، اور یہ اتنا در پردہ تھا کہ اگر یہ خطوط منظر عام پہ نہ آتے تو کسی کو معلوم بھی نہ ہوتا کہ مولانا شبلی اپنے ان اولوالعزم نوجوان دوست سے اس درجہ اخلاص رکھتے تھے۔ حد یہ ہے کہ اپنے سب سے زیادہ مخلص، ہمراز دہم داستان و لائق صد اعتماد دوست مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی سے بھی اس کا پردہ رکھا، اور ان کو خبر نہیں ہونے دی بمکاتیب شبلی میں مولانا شروانی کے نام ۱۰۸ خطوط ہیں، لیکن کسی خط میں بھولے سے بھی مولانا ابوالکلام کا ذکر کسی تقریب سے نہیں آیا ہے۔

منشی افتخار عالم صاحب حیات النذیر لکھ کر فارغ ہوئے تو یکایک ان کو خیال پیدا ہوا کہ لگے ہاتھوں حیات شبلی بھی کیوں نہ لکھ ڈالیں، جس کا مولانا شبلی ان کو قطعاً اہل نہیں سمجھتے تھے۔ منشی افتخار عالم نے اس کے متعلق ان کو لکھا، تو انھیں بڑا تعجب ہوا، مولانا ابوالکلام کو لکھتے ہیں:

"ہاں اور سنی! افتخار عالم صاحب مولوی نذیر احمد کی لائف لکھ کر انہی آلودہ ہاتھوں سے حیات شبلی کو چھونا چاہتے ہیں، اجازت اور حالات مانگے ہیں، میں نے لکھ دیا ہے کہ ظاہری حالات تو ہر جگہ سے مل جائیں گے، لیکن عالم السرائر خدا کے سوا ایک اور بھی ہے وہاں سے منگوائیے۔ بھئی بتا تو نہ دوگے، ایسے لوگ لاکھ

لکھیں تو کس کو خوشی ہوگی"۔

بعد میں یہی خدمت مولانا شبلی کے حسب توقع، تمام کرد ہات دیتوی سے فارغ ہونے کے بعد ان کے عزیز ترین شاگرد مولانا سلیمان ندوی نے انجام دی، اور حق یہ ہے کہ اس کا حق ادا کر دیا، اس میں مولانا ابوالکلام سے مولانا شبلی کے تعلقات کا ذکر بڑی تفصیل سے آیا ہے۔

بمبئی کے قریب جنجرہ نام کی ایک ریاست تھی، جہاں کے ایک انتہائی ترقی یافتہ مسلم خاندان کی علم دوست وعلم پرور خواتین سے جن میں عطیہ فیضی بیگم علم الکمال کے لحاظ سے بہت ممتاز تھیں، ان کے بڑے مخلصانہ اور مشفقانہ تعلقات تھے وہ مولانا کی بڑی قدرداں اور ان کے مذاق ادب کی دلدادہ تھیں ان سے خط وکتابت کا بھی سلسلہ قائم تھا، لیکن عام طور سے لوگ اس کو جانتے نہیں تھے، ایک مرتبہ تو مولانا شروانی کو لکھتے لکھتے رہ گئے، لیکن مولانا ابوالکلام کو اس کا علم تھا۔

انہی خواتین کی دعوت پر مولانا ایک مرتبہ جنجرہ بھی تشریف لے گئے تھے۔ ان کی مہمانداری اور وہاں کی آب وہوا کی لطافت سے مولانا بیحد متاثر ہوئے۔ اور اپنے تاثرات کا اظہار ایک غزل میں کیا، جس کے دو شعر مولانا ابوالکلام کو بھی لکھ بھیجے۔

ہوائے روح پرور بھی یہاں کی نشہ آور ہے ۔۔۔ یہاں فکر مے وجام وسبو ہوگی تو کیوں ہوگی
کہاں یہ لطف، یہ سبزہ، یہ منظر، یہ بہارستاں ۔۔۔ عطیہ تم کو یاد لکھنؤ ہوگی تو کیوں ہوگی

پوری غزل یہ ہے، جس کو مولانا شبلی نے جنجرہ سے رخصت ہوتے وقت اپنے ہاتھوں سے لکھ کر عطیہ کو دی تھی،

کسی کو یاں خدا کی جستجو ہوگی تو کیوں ہوگی ۔۔۔ خیال روزہ وفکر وضو ہوگی تو کیوں ہوگی
جو دو دن بھی بسر کرے گا اس قصر معلیٰ میں ۔۔۔ اسے خلد بریں کی آرزو ہوگی تو کیوں ہوگی
ہوائے روح پرور بھی یہاں کی نشہ آور ہے ۔۔۔ یہاں فکر مے وجام وسبو ہوگی تو کیوں ہوگی
جناب نازلی بیگم کو اور نواب صاحب کو ۔۔۔ کسی شے کی جو دل میں آرزو ہوگی تو کیوں ہوگی
کہاں یہ لطف، یہ منظر، یہ سبزہ، یہ بہارستاں ۔۔۔ عطیہ تم کو یاد لکھنؤ ہوگی تو کیوں ہوگی

عطیہ کے شوہر مسٹر رحمین فیضی نے جو بمبئی کے ایک مشہور آرٹسٹ ہیں مولانا کی ایک تصویر بنائی۔ مولانا ابوالکلام کو اس کا علم ہوا، تو اس کو دیکھنے کی خواہش کی تو مولانا ان کو لکھتے ہیں۔

"ہاں عطیہ فیضی کے یہودی شوہر نے جو آرٹسٹ ہے، میری تصویر ہاتھ سے کھینچی ہے، ابھی پوری تیار نہیں ہوچکی میں اس کا فوٹو لے کر آپ کو بھیجوں گا، نائب سفیر ٹرکی جو نہایت خوب صورت شخص ہے اس نے خواہش کی کہ اس کے ساتھ تصویر کھنچواؤں، چنانچہ ایک انگریزی کارخانہ میں فوٹو لیا گیا، توفیق افندی بھی اسی گروپ میں ہے"

اس فوٹو کی ایک کاپی مولانا سید سلیمان ندوی نے بھی مانگی تھی، تو ان کو لکھتے ہیں:

"فوٹو کی ایک ہی کاپی میرے پاس ہے اور اس پر سفیر ٹرکی کے دستخط ہیں کہ اس نے یہ فوٹو مجھ کو دیا ہے"

اول الذکر تصویر مسٹر رحمین فیضی کے کمال مصوری کا اعلیٰ ترین نمونہ ہے، وہ فرانس کی نمائش منعقدہ ۱۳ء میں آرٹ گلری کی بھی زینت بن چکی ہے۔ اس کی وہاں بے انتہا قدر کی گئی، اور نہایت معقول قیمت لگی، لیکن عطیہ بیگم نے اس کا فروخت کرنا کسی قیمت پر گوارا نہیں کیا وہ اب تک حجرہ کے ایوان رفعت کی زینت ہے۔

مولانا شبلی کو ترکوں سے بڑا قلبی لگاؤ تھا، ان کو اسلامی جاہ و جلال کا حامل سمجھتے تھے اور ان کی بڑی قدر کرتے تھے، ٹرکی حکومت کے نائب سفیر متعینہ ہندوستان نے جو ان کا مرتبہ شناس تھا، ان کے ساتھ تصویر کھنچوانے کی خواہش کی تو بطیب خاطر راضی ہوگئے، اس سے مولانا کے غیر معمولی تعلقات تھے، مولانا سید سلیمان کو لکھتے ہیں:

"وہ اگرچہ اردو، فارسی، عربی کوئی زبان نہیں جانتا تاہم اس سے ملنے کو جی چاہتا ہے جب وہ نہیں آتا تو خود ملنے کو جاتا ہوں، اس نے خواہش کی کہ میں اپنا فوٹو اس کے ساتھ کھنچواؤں، میں نے منظور کیا، مجھ کو تصویر سے دلچسپی نہیں۔ لیکن ایسا انکار بھی نہیں"

یہ تصویر مولانا کو اتنی پسند تھی کہ اپنی دستی تصویر کے ساتھ اس کا تذکرہ بھی کرنا انھوں نے ضروری سمجھا۔

مولانا شبلی کو مسلم لیگ کی سیاست سے کبھی اتفاق نہیں ہوا۔ اس کی بنیاد نواب وقارالملک وغیرہ کے ہاتھوں ڈھاکہ میں رکھی گئی، تو اس کی سب سے زیادہ مخالفت مولانا شبلی ہی نے کی اور زندگی کے آخر تک وہ اپنی اسی پالیسی پر قائم رہے، اور اس کے خلاف تیز و تند نظمیں لکھتے رہے، جو کثافت و صاف کے فرضی ناموں سے الہلال، زمیندار، مسلم گزٹ لکھنؤ وغیرہ میں بڑے آب و تاب سے چھپتی رہیں، اور لوگ بڑے مزے لے لے کر ان کو پڑھتے رہے، کھل کر تو کبھی سامنے آتے نہیں، لیکن درپردہ تعریض و طنز کا کوئی دقیقہ انھوں نے اٹھا نہیں رکھا، ۱۹۱۰ء میں اس کے بڑے سرگرم و فعال سکریٹری مولوی عزیز مرزا صاحب تھے، وہ چاہتے تھے کہ مسلم لیگ کی شاخیں ایک ایک شہر میں قائم ہو جائیں تاکہ اس کی آواز گورنمنٹ میں اور زیادہ موثر ہو جائے، اسی سلسلہ میں انھوں نے ایک مرتبہ مسلم لیگ کے متعلق ایک پمفلٹ شائع کیا، جس میں مسلمانوں کے لئے مسلم لیگ کی ضرورت کو بڑے پرزور دلائل سے ثابت کیا تھا، جس کی داد اور تو اور خود وقت کے وائسرائے نے بھی دی، مولانا شبلی تو ان مواقع کی تلاش میں رہتے تھے، ان کو معلوم ہوا تو مولانا ابوالکلام کو فوراً لکھا کہ

> "مولوی عزیز مرزا صاحب کو مبارک باد لکھئے ان کے پمفلٹ متعلق مسلم لیگ کی داد جناب والسرائے بہادر نے دی، اور اس کا اعلان تار کے ذریعہ سے اخبارات میں ہوا، ان کو شکایت تھی کہ لوگ مسلم لیگ قائم نہیں کرتے اب کس کو انکار ہوگا۔"
>
> (۲۸ ستمبر ۱۹۱۰ء)

دیکھئے ان چند جملوں میں کتنا زہر بھرا ہوا ہے،

مولانا ابوالکلام عنفوان شباب ہی میں اپنی جادو بیانی اور سحر نگاری کی وجہ سے سارے ہندوستان میں مشہور ہو گئے تھے۔ ان کا ہفتہ وار الہلال اپنی نوعیت کا ہندوستان میں تنہا اخبار تھا جو ملک کے گوشہ گوشہ میں جاتا تھا، اور بڑے ذوق و شوق اور دلچسپی سے پڑھا جاتا تھا، اس طرح سے سارا ہندوستان ان کی طرف متوجہ اور ان کی زیارت کا مشتاق و آرزومند ہو گیا تھا، جہاں جاتے تھے ان کا شاہانہ استقبال ہوتا تھا، مولانا شبلی ایک مرتبہ نواب عمادالملک کی دعوت پر حیدرآباد گئے

تو انھوں نے وہاں دیکھا کہ ہر شخص مولانا ابوالکلام کا نادیدہ پرستار، ان کی زیارت کا آرزومند، ان کی تقریر سننے کا مشتاق ہے، مولانا وہیں سے ایک خط میں ان کو لکھتے ہیں۔

"آپ کا تمام حیدرآباد مشتاق ہے، لیکن یہاں کوئی شخص حدود ریاست کے اندر کوئی آزادانہ تقریر نہیں کرسکتا، ایسی حالتوں میں لوگ یہ کرتے ہیں کہ رزیڈنسی کے حدود میں جلسے کرتے ہیں، جو بالکل شہر سے متصل ہے اور ریاست کے تمام شائقین شریک ہوتے ہیں۔

مفصل انتظامات دریافت اور استصواب کے بعد لکھوں گا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اہل حیدرآباد سے کہیں زیادہ خود مولف ہی اس وقت مولانا ابوالکلام کی تقریر سننے کا اشتیاق رکھتے تھے، اور اس کے لئے اپنے خاص اہتمام میں جلسہ کرنا چاہتے تھے اب نہیں کہا جا سکتا کہ مولانا شبلی کا یہ شوق پورا ہوا یا نہیں لیکن جہاں تک ہماری یادداشت کام کرتی ہے، مولانا ابوالکلام نظام کے عہد اقتدار تک کبھی حیدرآباد نہیں گئے۔ ان کو نظام حیدرآباد کی علم دوستی، علماء نوازی، ہنر پروری، اور علم وفن کی راہ میں ان کی بے پناہ اور عدیم المثال فیاضی وزرپاشی کے باوجود ان سے کبھی عقیدت نہیں پیدا ہوئی، نہ ساری عمر ان کے ابر کرم کو جس سے سارا ہندوستان سیراب ہوتا تھا، انھوں نے فیضیاب ہونے کا ننگ گوارا کیا۔

ارباب کمال کی خود ان کے اپنے وطن میں عموماً قدر نہیں ہوئی۔ لیکن مولانا شبلی اس سے مستثنیٰ تھے، وہ جب اپنے لمبے لمبے سفروں سے واپس آتے تھے، تو سارے شہر میں دھوم مچ جاتی تھی، اور ہر شخص جان جاتا تھا، کہ مولانا شبلی آگئے ہیں، اور پھر یہ چہار طرف سے مشتاقان دید جوق درجوق زیارت وملاقات کے لئے پہنچ جاتے تھے، جب تک ان کا قیام وطن میں رہتا، ان کا فیض جاری رہتا، اور لوگ اپنے اپنے ذوق کے مطابق ان سے استفادہ کرتے رہتے، ہمارے شہر کے مشہور نعت گو شاعر علامہ اقبال سہیل کو وطن کے اسی دوران قیام میں مولانا سے شرف تلمذ حاصل ہوا تھا، اور انھوں نے مولانا سے عربی ادب وکلامیات کی بعض اونچی کتابیں مثلاً حماسہ ابی تمام اور الکتاب والتبیین وغیرہ پڑھی تھیں، اس کا ذکر مولانا سہیل کی نامکمل سیرت شبلی

میں بھی ہے۔ اور اسی کو مولانا سید سلیمان ندوی نے حیات شبلی میں بھی نقل کر دیا ہے۔

مولانا شبلی اپنے غیر معمولی علمی اور ادبی کمالات کی شہرت کی بنا پر ہندوستان کے کسی گوشہ میں بھی بیگانہ نہیں تھے، جہاں جاتے تھے، ان کی آمد کا شور ہو جاتا تھا، اور ان کی زیارت کے لئے لوگ امنڈ پڑتے تھے، لکھنؤ، الہ آباد، کلکتہ، اور بمبئی کو تو مختلف وجوہ سے وطن ثانی کی حیثیت حاصل ہوگئی تھی، جہاں ان کا قیام کبھی کبھی ہفتوں نہیں، مہینوں ہو جاتا تھا، اس لئے ان شہروں کا ایک ایک بچہ ان کو جان گیا تھا، لیکن ان شہروں کے علاوہ ہندوستان کے دوسرے شہروں میں بھی جاتے تھے، تو ان کا بڑا شاندار خیر مقدم ہوتا تھا، اور وہاں کے عوام و خواص ان کو دیکھنے کے لئے بے تاب ہو جاتے تھے، ایک مرتبہ دورہ کے سلسلے میں بانکی پور پٹنہ گئے، تو ان کو لینے کے لئے ایک کثیر مجمع اسٹیشن پر اکٹھا تھا، اور با وجود مولانا کے انکار و اعراض کے جوش عقیدت میں آدھے راستہ سے ان کو جلوس کے ساتھ فرودگاہ تک لے گیا جس کا مولانا شبلی پر بڑا اثر تھا، مولانا ابو الکلام کو لکھتے ہیں:

> صبح کو بانکی پور پہنچا۔ غایت کثرت سے مجمع تھا، عمائد شہر اور تمام طلبہ کالج موجود تھے، نہایت سخت اصرار کے ساتھ طلبہ نے گاڑی کھینچی اور فرودگاہ تک لائے۔ میرے اصرار کا اتنا اثر تھا کہ آدھی راہ کے بعد یہ مشغلہ شروع ہوا، ورنہ وہ تو اسٹیشن ہی سے کانٹوں میں گھسیٹنا چاہتے تھے، یہ تو نہیں کہتا کہ رعونت پسند نفس کو پھریری نہیں آئی ہوگی، لیکن واقعاً ہنسی آتی تھی، کہ عجب خوش اعتقاد بلکہ ضعیف الاعتقاد ہیں"

لیکن مولانا شبلی نے وہیں سے اپنا دورہ ملتوی کر دیا، اور لکھنؤ روانہ ہو گئے، لکھتے ہیں:

> "دورہ کرتا ہوں تو لکھنؤ میں سالانہ جلسہ کے متعلق جو کام چھڑے ہیں، ابتر ہو جائیں گے"

ندوہ ان کو ہر چیز سے زیادہ عزیز تھا، اور اس کے ضروری کاموں پر اپنی ذاتی دلچسپیوں کو بھی بے تکلف قربان کر دیتے تھے، اور اس پر فخر کرتے تھے۔ مولانا شروانی کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

"اب کی بمبئی میں عجیب رنگین صحبتیں رہیں، لیکن عین عالم لطف میں ندوہ کی ایک فوری ضرورت سے یہاں آنا پڑا، لیکن آنکھوں میں اب تک وہ تماشا پھر رہا ہے، خیر اس پر فخر کرتا ہوں، کہ دل کی خوشی کو قوم اور مذہب پر نثار کرسکتا ہوں اور بے تکلف کر سکتا ہوں"۔ (۷۲)

ایک اور خط میں انہی کو لکھتے ہیں:

"میں اس وقت کہ چمن زار بمبئی کے گلگشت نے عالم طلسم میں پہنچا دیا تھا، بھاولپور کے عہدہ داروں کا خط پہنچا، کہ ریاست کے حکم سے ندوہ کے معائنہ کو آتے ہیں، اور اس وقت تمہارا ہونا ضروری ہے۔ بالکل اسی حالت میں بمبئی سے نکلا جس طرح مرحوم شداد نے بہشت عدن کو خیرباد کہا تھا، بہرحال پھر اسی خرابہ (ندوہ) میں آ گیا۔ (۷۱)

مولانا شبلی کے پاس فارسی کے نوادر کتب کا بڑا اچھا ذخیرہ تھا، جس کو وہ بہت محبوب رکھتے تھے، ان میں ایک مشائخ چشت کے حالات میں جہاں آرا بیگم کی تصنیف مونس الارواح کا ایک نادر بیش قیمت قلمی نسخہ بھی تھا، جو شاہجہاں کے دربار کے خاص کاتب رشید الدین وطواط کے ہاتھ کا دبیز زر افشاں کاغذ پر نہایت خوشخط لکھا ہوا ہے، اب وہ کتب خانہ دار المصنفین کی زینت ہے، اس کا خط اتنا پاکیزہ روشن اور دیدہ زیب ہے، کہ بس دیکھتے رہ جایئے، چار سو برس گزر جانے کے بعد بھی اس میں اتنی تڑپ ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ کاتب ابھی ابھی لکھ کر اس سے فارغ ہوا ہے، پیرس میں آل ورلڈ نمائش کے موقع پر یہ گرانقدر قلمی کتاب بھی نمائش میں رکھنے کے لئے طلب کی گئی۔ اور وہ ۱۵ ہزار کے بیمہ پر پیرس بھیجی گئی، لیکن مولانا کو پھر بھی خطرہ تھا، کہ کہیں ضائع نہ ہو جائے،

مولانا ابوالکلام کو لکھتے ہیں:

"میری کتاب جہاں آرا بیگم کی تصنیف، ولایت کی نمائش میں طلب ہوئی ہے، میں نے لکھ دیا ہے کہ ضرور واپس ملے"۔

ان کو اس قسم کے نوادر کے دیکھنے کی بھی بڑی تمنا رہتی تھی، اسی طرح کی ایک آل ورلڈ نمائش ۱۹۱۲ء میں ممالک متحدہ آگرہ و اودھ کے سابق دارالسلطنت الہ آباد میں بھی ہوئی تھی، اس میں بھی قلمی نوادرات ومخطوطات کی نمائش کا ایک شعبہ تھا، جس میں جابجا سے نہایت نادر اور بیش قیمت قلمی کتابیں نمائش کے لئے منگوائی گئی تھیں، ان میں دیوان فیضی کا ایک نادر نسخہ بھی کہیں سے آکر نمائش کی زینت بننے والا تھا، مولانا کو اس کی اطلاع ملی، تو ان کے لئے نمائش دیکھنے کی ایک اور وجہ ترغیب پیدا ہوگئی، مولانا ابوالکلام کو لکھتے ہیں:

"الہ آباد کی نمائش میں ایک اور اضافہ ہوا، یعنی نوادرات میں ایک دیوان فیضی بھی ہوگا، اور وہ دسمبر کے اوائل تک پہنچ جائے گا"

اب وہ الہ آباد کی مشہور پبلک لائبریری کی زینت ہے،

مولانا شبلی کے زمانۂ حیات میں تین بڑے اہم واقعات پیش آئے، اور انہی نے درحقیقت مسلمانوں کو بیدار کردیا، ان میں سے دو جن سے مسلمان بیحد متاثر تھے، ایک غزوۂ طرابلس ہے اور دوسرا جنگ بلقان ہے۔ ان دونوں میں جن لوگوں نے مسلمانوں کی رہنمائی کی، اور ترکوں کی حمایت اور ہمدردی کا بے پناہ جذبہ ان میں پیدا کردیا، ان میں دو بزرگ بہت ممتاز تھے، ایک مولانا شبلی اور دوسرے مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا شبلی ترکوں کی حمایت میں پرجوش نظمیں لکھتے تھے جو فرضی ناموں سے الہلال کلکتہ، زمیندار لاہور۔ اور مسلم گزٹ لکھنؤ میں چھپتی تھیں، اور مولانا ابوالکلام اپنے اخبار الہلال میں نہایت پرزور اور ولولہ انگیز مضامین لکھتے تھے ان کو پڑھ پڑھ کر مسلمان اتنا جوش میں بھر گئے، کہ وہ اپنا سب کچھ ترکوں پر نثار کرنے کے لئے تیار ہوگئے، ڈاکٹر انصاری کی سرکردگی میں ترکوں کی امداد کے لئے ہندوستان کے مسلمانوں کی طرف سے جو طبی مشن گیا تھا، وہ بھی درحقیقت ان کے اسی جوش وخروش کا مظہر تھا، اور وہ جب اپنے فرائض ادا کرکے بمبئی کے ساحل پر اترا ہے تو اس کے استقبال کے لئے مولانا شبلی بمبئی میں موجود تھے، اور ممبران وفد کے بخیر وعافیت واپس آنے پر ان کو پرزور مبارکباد دی، اور ایک قصیدۂ تہنیت بھی پیش کیا، جو ان کے بے پناہ جذبۂ ملی وجوش دینی کا پورا آئینہ دار ہے، آج بھی اس کے پڑھنے سے اس وقت کا نقشہ

آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے۔

تیسرا مچھلی بازار کان پور کی مسجد کے انہدام کا واقعہ ہے، جب یہ حادثۂ خونین پیش آیا ہے مولانا اپنے مستقر لکھنؤ سے بہت دور بمبئی میں تھے، اخبارات کے ذریعہ اس ہنگامہ کی خبریں ان تک پہنچیں، تو تڑپ گئے، اور اس اثر کے ماتحت انھوں نے پے در پے متعدد نظمیں لکھیں، جو اس واقعہ کے کئی برس بعد تک ہندوستان کے بچے بچے کی زبان پر تھیں، اور اب بھی ہیں، وہ اس قدر موثر، پرجوش اور ولولہ انگیز تھیں، کہ بقول مولانا سید سلیمان ندوی کے جس ہفتہ وہ الہلال کلکتہ یا ہمدرد دہلی یا زمیندار لاہور میں چھپتیں، ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے رجز کا کام دیتیں، اور وہ انگریزوں کے خلاف انتہائی جذبۂ انتقام اور جوش وخروش سے لبریز ہو جاتے، ان نظموں میں اب بھی وہی جوش وخروش کا طوفان ہے، جن کو پڑھ کر آج بھی انگریزوں کے خلاف خون کھول جاتا ہے، ایک نظم میں کانپور سے دوری، اور اس سعادت سے اپنی محرومی پر نہایت دلدوز الفاظ میں اظہار افسوس کیا ہے، فرماتے ہیں،

شہیدان وفا کی خاک سے آتی ہیں آوازیں
کہ شبلی بمبئی میں رہ کے محروم سعادت ہے

واقعہ کانپور کا ان پر جو اثر تھا، اس کا اندازہ ان دو قطعوں سے بھی کیا جا سکتا ہے۔

اگرچہ آنکھ میں نم بھی نہیں ہے اب باقی — اگرچہ صدمۂ بلقان سے جگر شق ہے
بچا رکھے ہیں، مگر میں نے چند قطرۂ خون — کہ کانپور کے بھی زخمیوں کا کچھ حق ہے

کیا پوچھتے ہو یہ کہ رسول عرب کی قوم — کیوں گھٹ رہی ہے آج عدد میں ہنود میں
سن لو وہ گنج ہائے گرانمایہ دفن ہیں — کچھ بلقان کی خاک میں کچھ کانپور میں

لیکن اس واقعہ کو سارے ہندوستان کے مسلمانوں کا ملی مسئلہ بنانے میں جس کے قلم وزبان کو سب سے زیادہ دخل ہے، وہ مولانا ابوالکلام آزاد تھے، انھوں نے اپنے اخبار الہلال میں اس کی حمایت میں مسلسل پرجوش مقالات لکھے، اس طرح سے ایک کی پراثر اور ولولہ انگیز نظموں نے

اور دوسرے کے آتشیں اللہ جوش انگیز مقالات نے سارے مسلمانوں کو جوش سے بھر دیا اور وہ مسجد کی حرمت اور تقدیس کے لئے ہر قسم کی قربانی پیش کرنے کے لئے تیار ہو گئے۔ مختصراً اصل واقعہ یہ ہے کہ رمضان المبارک کی دسویں تاریخ تھی، کہ مسلمانان کانپور نے مولانا آزاد سبحانی مدرس اعلیٰ مدرسہ کانپور کی سرکردگی میں ایک عظیم الشان جلسہ منعقد کیا، انھوں نے ایسی پرجوش تقریر کی، کہ سارا مجمع جوش سے لبریز ہو گیا، اور جلسہ کے ختم ہونے کے بعد اسی جوش و خروش کی حالت میں اس نے مسجد کا رُخ کیا، اور مسجد کے منہدم حصہ پر اینٹیں چننی شروع کر دیں اس وقت سکھ فوج کا پہرہ پڑ رہا تھا۔ مسٹر ٹیلر کمشنر کانپور نے موقع پر پہنچ کر، ان نہتے مسلمانوں پر جو مسجد کی تعمیر میں مصروف تھے، فوج کو حملہ کا حکم دے دیا، اور انھوں نے نہایت بے رحمی و بے دردی سے نہ صرف ان پر گولیاں برسائیں، بلکہ قریب پہنچ کر ان کے جسموں کو برچھوں اور نیزوں سے چھلنی کر دیا، جس کے نتیجہ میں بہت سے مسلمان شہید اور زخمی ہو گئے، جن میں ننھے ننھے معصوم بچے بھی شامل تھے، شہدا، کا صحیح اندازہ تو نہ ہو سکا، لیکن خود گورنمنٹ کی رپورٹ کے مطابق ان کی تعداد تیس سے کم نہ تھی، اس سے سارے ہندوستان میں ایک قیامت مچ گئی۔ جس سے حکومت بھی متاثر ہوئی۔ اس زمانہ میں وائسرائے کی کونسل کے ایک ممبر سر علی امام مرحوم تھے انھوں نے مولانا محمد علی اور مولانا عبد الباری فرنگی محلی کو مصالحت کا پیام دیا، اور صلح کی بات چیت شروع ہو گئی، لیکن اس سلسلہ میں حکومت اور مسلمانوں کے نقطہائے نظر میں بڑا شدید اختلاف تھا، مسلمانوں کا مطالبہ تھا، کہ مسٹر بٹلر ڈپٹی کمشنر کو سزا دی جائے، مسجد جیسی تھی ویسی ہی پھر بنوا دی جائے، قیدیوں کو قید و بند سے رہا کر دیا جائے، اور جو لوگ شہید ہو گئے ہیں ان کا خون بہا ادا کیا جائے لیکن مصالحت کی گفتگو کا آغاز اس طرح ہوا، کہ قیدیوں کو رہا کر دیا جائے گا، ملزموں پر سے مقدمہ اٹھا لیا جائے گا، مظلوموں کی مالی مدد کی جائے گی، لیکن مسجد کا جو حصہ منہدم کر دیا گیا ہے، اس کے پھر بنوانے پر مسلمانوں کی طرف سے اصرار نہ کیا جائے گا۔ مولانا نے اس پر ایک طنزیہ قطعہ لکھا اس کا ایک ایک شعر مسلمانوں کے اس وقت کے جذبات کا آئینہ دار تھا۔ اس کے بعض شعر یہ ہیں:

جزو مسجد کو اگر آپ سمجھتے ہیں حقیر | آپ کے ذہن میں اسلام کی تصویر نہیں
آپ کہتے ہیں، وضو خانہ تھا مسجد تو نہ تھی | یہ بجا مسئلہ فقہ کی تعبیر نہیں
آپ اس بحث کی تکلیف نہ فرمائیں کہ آپ | حامل فقہ نہیں واقف تفسیر نہیں

بالآخر مصالحت کی گفتگو کامیاب ہوئی۔ لارڈ ہارڈنگ وائسرائے ہند خود کانپور آئے، حکومت کی طرف سے سر علی امام نے نمائندگی کی، اور مسلمانوں کی طرف سے مولانا عبدالباری فرنگی محلی نے، اور دونوں کے اتفاق رائے سے معاملہ اس طرح طے ہوا کہ قیدیوں کو رہا کر دیا جائے گا۔ مقدمے واپس لے لئے جائیں گے، اور مسجد کا منہدم حصہ اس طرح تعمیر کیا جائے گا کہ اوپر چھت ہوگی جس سے وضو خانہ کا کام لیا جائے گا، اور نیچے سے آمد و رفت کے لئے سڑک یا راستہ بنا دیا جائے گا اس فیصلہ کو سب نے منظور کیا، اور وائسرائے بہادر نے اپنی طرف سے اس کا اعلان کیا، جس کا احرار اور وفاداران حکومت دونوں نے شکریہ ادا کیا، مولانا نے بھی وائسرائے کو خطاب کرکے حسبِ ذیل قطعہ کہہ کر اپنی شکر گذاری کا فرض ادا کیا، جس کے بعض اشعار یہ ہیں:

اے ہمایوں گہر و افسر اورنگ شہی
وہ کیا تو نے جو آئین جہاں بانی ہے
تو نے ظاہر میں رعایا سے جو کھائی ہے شکست
یہ حقیقت میں ظفر مندیٔ سلطانی ہے
تیرے لطف و کرم عام نے دیدی یہ ندا
کوئی مجرم ہے، نہ قیدی ہے، نہ زندانی ہے
تو نے اک آن میں گرتا ہوا گھر تھام لیا
بازوؤں میں یہ تیرے زور جہاں بانی ہے
گرچہ مدح امراء میں نے نہیں کی ہر گز بھی
شکر احسان مگر فطرت انسانی ہے

مولانا ابوالکلام کو جو گروہِ احرار کے سرخیل تھے، اور جنھوں نے اپنے اخبار الہلال کے ذریعہ اس مسئلہ کو مسلمانوں کا آل انڈیا مسئلہ بنادیا تھا۔ مولانا لکھتے ہیں :

"برادرم کانپور کا معاملہ جس طرح فیصل ہوگیا، اب سردست اس سے آگے بڑھنے کی ضرورت نہیں۔"

یہ مولانا شبلی کی قومی و ملی زندگی کا سب سے آخری مگر سب سے زیادہ جاں گداز حادثہ تھا، جس سے ان کے قلب و دماغ نے بیحد اثر لیا، اور اپنی پر اثر نظموں سے انھوں نے سارے ہندوستان میں ایک قیامت برپا کردی، اگر وائسرائے کی مداخلت سے بتعجیل تمام مصالحت نہ ہوجاتی تو مسلمانوں کا جوش آگے بڑھ کر معلوم نہیں کیا رُخ اختیار کرتا، اور اس بیخودی و سرشاری اور شدت جذبات میں وہ کیا کچھ نہ کر ڈالتے ابھی بلقان کا شور محشر بپا تھا، اور مسلمانوں کے دل برطانوی وزارت خارجہ کی سیاسی روش پر سخت مشتعل ہی تھے، کہ صوبہ متحدہ کے گورنر سر جمیس مسٹن اور ان کے ماتحت حکام کا نپور کی غلط اندیشیوں اور غلط کاریوں، اور غلط کوشیوں نے مسجد کانپور کی صورت میں ان کے اضطراب و اشتعال کا ایک نیا سامان پیدا کردیا، اور وہ غم و غصہ سے اور زیادہ لبریز ہوگئے، گورنمنٹ نے اس جوش کے دبانے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا، لیکن وہ باوجود قاہری و سلطانی و جباری کے بھی کامیاب نہ ہوسکی، اور اس کو مسلمانوں کے سامنے جھکنا پڑا۔

یہ اس وقت کا واقعہ ہے جبکہ برطانوی حکومت کا اقبال نصف النہار پر تھا۔ اور اس کے حدود فرمانروائی مشرق و مغرب اور شمال و جنوب میں بڑھتے چلے جارہے تھے اس کے طنطنۂ جبروت سے ایشیا تو ایشیا سارا یورپ کانپتا تھا، اس حادثۂ خونین کے ٹھیک ایک برس کے بعد مسلمانوں کی ملی زندگی کا یہ رجز خوان ہم سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہوگیا، لیکن اس کی رجز یہ نظموں نے انگریزوں کی سیاست کے خلاف لوگوں کے دلوں میں نفرت و حقارت کا جو شدید ترین جذبہ پیدا کردیا تھا، وہی درحقیقت ہندوستان کی تحریک آزادی کا نقطۂ آغاز ہے، جس کے بعد یہ جذبہ بڑھتا گیا، اس لحاظ سے مولانا شبلی ہندوستان کی تحریک آزادی کے اولین محرک ہیں جن کو ہندوستان کی تاریخ کبھی فراموش نہیں کرسکتی۔

ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

دُنیا کی ایک بڑی طاقت۔ امریکہ

جناب ایم۔ اے حفیظ

آج دنیا میں دو بڑی طاقتیں ایک دوسرے کی حریف ہیں۔ دو ہم پلہ ملک۔ دو وسیع تہذیبیں دو متضاد تحریکیں جن میں ایک کیمونزم اور دوسری جمہوریت کی علمبردار ہے۔ ایک روس ہے تو دوسرا امریکہ! ان میں نہ صرف نظریاتی اعتبار سے رسہ کشی ہے بلکہ خلائی ترقیاتی پروگرام میں بھی، دونوں ایک دوسرے سے گوے سبقت لے جانے میں منہمک ہیں اس تصادم و ٹکر پر دنیا کی تمام نگاہیں مرکوز ہیں۔ کیونکہ عالم کا امن و شانتی یا تیسری جنگ کے ہونے یا نہ ہونے کے امکانات زیادہ تر ان ہی دونوں ملکوں کے اقدام پر منحصر ہیں۔ علاوہ ازیں سائنس کی ترقی میں دونوں ملک تھوڑے بہت فرق کے ساتھ ہم قدم ہیں ان قوتوں میں جس تہذیب کے تانے بانے جنم لے رہے ہیں۔ وہ ہمیں تاریخ کے پچھلے اوراق الٹنے کی ترغیب دیتے ہیں۔

امریکہ جس کو نئی دنیا بھی کہا جاتا ہے، اتفاقی طور پر سیاحوں کو معلوم ہوا۔ یوں تو ۹۸۵ء میں ہی اسکنڈے نیویا کے باشندے بحر منجمد شمالی سے گزر کر گرین لینڈ پہنچے تھے، اور اس وسیع جزیرے سے گزر کر ان کے جہاز آگے بڑھے تھے اور ایسی شہادتیں بھی موجود ہیں کہ تقریباً ایک ہزار عیسوی میں موجودہ ریاست ہائے متحدہ میں انھوں نے قدم رکھا۔ لیکن ان کا کوئی نقش پا نہیں ملتا اور نہ انھوں نے اپنے حالاتِ سفر کو کسی مستند شکل میں ترتیب دیا تھا۔ کمال تو یہ ہے کہ اطالوی باشندہ کرسٹوفر کولمبس جب ۱۴۹۲ء میں اسپین کے بادشاہ، فرڈی نینڈ اور ملکہ ازابیلا کی اجازت سے تجارت کے لئے نیا راستہ دریافت کرنے نکلا تو اُسے بھی یہ معلوم تھا کہ اس کے راستہ میں ایک بڑا براعظم حائل ہے اسی لئے اس نے ویسٹ انڈیز کو ایسٹ انڈیز سمجھا لیکن کولمبس نے امریکہ کے بارے میں کوئی خاص معلومات نہیں چھوڑی ہیں۔ امریکہ نام

پلنے اور بر اعظم کا منظر عام پر آنے کا سہرہ تو امریگو دیپاسی کے سر ہے جو ایک اطالوی باشندہ تھا اور جس نے اپنی سیاحت کے بعد سفر کے حالات کو اس تفصیل سے لکھا کہ دنیا کے نقشے میں جب امریکہ کی سمائی ہونے لگی تو امریگو کے لکھے ہوئے معلومات کا رہون منت ہونا پڑا۔

امریکہ کی دریافت کے بعد جب انگریز، فرانسیسی، اسپینی اور دوسرے باشندے اس نئی سرزمین میں داخل ہونے لگے تو ان کے احساسات میں شدت تھی اور وہ مختلف امیدوں قوتوں کے ماتحت اپنی اپنی قوم کے لئے مواقع تلاش کر رہے تھے۔ امریکہ میں ایک طرف سرسبز و شاداب درخت جھنڈ کے جھنڈ پھیلے ہوئے تھے۔ دوسری طرف صاف و شفاف پانی کے دریا تھے۔ بر اعظم کے مغرب میں شمال سے جنوب تک پہاڑوں کے سلسلے الگ کھڑے تھے۔ جن کے دامن میں سونے اور چاندی کی کانیں آنے والوں کا انتظار کر رہی تھیں جب سیاح آہستہ آہستہ آباد ہونے لگے تو سونے اور چاندی کی کشش نے لوگوں کے حوصلوں کو بڑھا دیا اور وہ گروہ کے گروہ سونا جمع کرنے کے شوق میں دیوانہ وار آنے لگے۔ گویا قدرت نے آنے والوں کے لئے ان کانوں کا منہ کھول دیا تھا اور پھر اس مالامال سرزمین پر بسنے والے جنگلی اور اصلی باشندے خوف زدہ ہو کر الگ اپنے بچاؤ کی تدبیریں سوچ رہے تھے۔ دلیسیوں نے حتی المقدور آنے والوں کا مقابلہ کیا لیکن مختلف قوتوں کے زیر اثر آخر کار انہیں لڑبھڑ کر مغرب کی طرف پسپا ہونا پڑا۔ امریکہ میں آج اصلی باشندے خال خال ملتے ہیں۔ ان کی اپنی زندگی محدود اور بے بس ہے۔ ان کا تمدن اور ان کی تہذیب کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ یعنی آج کا امریکہ جس کا ہر لحاظ سے بول بالا ہے ان اصلی باشندوں کو بھلا چکا ہے لیکن امریکہ کی سرزمین انہیں کیسے بھلا سکے گی۔ کیونکہ ان دیسی باشندوں نے پردیسیوں کی روک تھام میں اپنی پوری توانائیاں صرف کر دی تھیں جس کی کہانی طویل اور درد انگیز ہے۔

امریکہ جب دریافت ہوا تو مختلف ممالک کی ہوس ملک گیری نے انہیں مختلف داؤ پیچ اختیار کرنے پر مجبور کیا۔ انگلستان کی ملکہ الزبتھ اول کے دور میں انگریز بحری قزاق ہسپانوی جہازوں پر چھاپے مارتے تھے۔ تاجروں سے سونا چھین لیتے تھے۔ سمندری لڑائی

لڑتے تھے اور طوفان سے مقابلہ کرتے تھے۔ اسی طرح نیوفاؤنڈلینڈ اور کینیڈا پر قبضہ کیا۔ فرانس نے انگلستان کے خلاف برسوں امریکیوں کا ساتھ محض اس امید پر دیا کہ انھیں بھی کچھ علاقے مل جائیں چنانچہ ۱۷۵۸ء میں برطانیہ کو ولیم پٹ جیسا قابل جنرل مل گیا تو اس نے فرانسیسیوں کو شکست دی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ امریکن جن کی قوت اب تک منتشر تھی آپس میں متحد ہونے لگے اور انھوں نے اپنے مشترک مفاد کے لئے فوج کی از سر نو تنظیم کی۔ آخر کار امریکی انقلاب رونما ہوا۔

انگریزوں کا مقصد پوری طور پر تجارتی مفاد حاصل کرنا اور ساتھ ہی ساتھ مختلف مقامات پر قبضہ کرنا تھا لیکن وہ تجارت کے مدنظر ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے تھے حتیٰ کہ ایک مرتبہ امریکیوں نے اپنی پوری قوت جمع کر کے انگریزوں کی بھیجی ہوئی چائے کے جہازوں کو سمندر میں غرق کر دیا تھا جس پر انگلستان سے بڑا احتجاج ہوا۔ اس طرح امریکہ ایک صدی تک مختلف قوموں کا آماجگاہ بنا رہا۔ سونے چاندی کی کانوں اور تمباکو کی پیداوار نے بہت سے ملکوں میں ہلچل مچا دی۔ ہر قوم کی یہ دلی تمنا تھی کہ پرانی دنیا کے جھگڑوں سے بچ کر نئی دنیا میں آباد ہو جائیں اور پھولیں پھلیں۔ شاید بالکل اسی طرح، جس طرح کہ آج کا انسان، دنیا کی سرزمین کی الجھنوں سے گھبرا کر چاند اور مریخ پر کمند ڈال رہا ہے۔ امریکہ میں جب مختلف قوموں کی ریس ہونے لگی تو فاصلے کی دوری اور ناسازگار حالات کی ٹیڑھی ترچھی رفتار نے بہتوں کی گرفت ڈھیلی کر دی۔ آخر کار جب امریکی انقلاب رونما ہوا تو اس وقت ملک میں تیرہ نو آبادیاں الگ الگ حکومت کر رہی تھیں۔ یہ سب کے سب انگریز تھے۔ برطانوی حکام ایک مرکزی حکومت چاہتے تھے اور امریکن ایک متحدہ حکومت کے خواہاں تھے جو اگرچہ برطانیہ کی وفادار ہو، لیکن وہ اپنے معاملات میں بالکلیہ آزاد رہے، اس کشمکش میں اہل برطانیہ نے مختلف قسم کے تجارتی ٹیکس امریکیوں پر عائد کئے۔ دونوں طرف کی فوجوں میں جگہ جگہ ٹکر ہوئی۔ جب برطانیہ نے بھرپور اپنی طاقت کا استعمال کیا تو امریکیوں نے برطانوی مال کا بائیکاٹ کر کے اور مختلف دباؤ و اثرات کو کام میں لا کر آخر کار اپنے آپ کو آزاد کر لیا۔

مکمل آزادی کا سب سے پرجوش حامی ٹامس پین تھا جو ۱۷۷۴ء میں فلیڈلفیا میں آباد ہوا تھا۔ یہ پمفلٹ ۔۔۔ کا مصنف تھا جس نے اپنی تحریروں سے رائے عامہ کو اپنی طرف کر لیا۔ آخر کار

۴ جولائی ۱۷۷۶ء کو مکمل آزادی کا منشور شائع کر دیا گیا۔ امریکہ کی تاریخ میں یہی دن آزادی کا جنم دن سمجھا جاتا ہے۔ اس مجموعہ قوانین میں صاف الفاظ میں اعلان کر دیا گیا کہ نوآباد اپنے مادر وطن (انگلستان) سے کیوں قطع تعلق کرنا چاہتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی امریکہ کے سیاسی موقف کی بھی وضاحت کر دی گئی تھی۔ گویا جمہوریت کا یہ پہلا قدم تھا۔ حسن اتفاق سے امریکہ کو ایسے مخلص لیڈر ملے کہ واقعی اس کی اپنی ایک نئی دنیا مستحکم و مضبوط بن گئی۔ یہ قائدین واشنگٹن، جیفرسن، تھامسن اور ابراہام لنکن وغیرہ تھے جنھوں نے عوام کے دلوں میں قومیت کا احساس پیدا کیا اور ان کو بہتری کے راستے پر لگا دیا۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ بنا، جو آج دنیا میں ایک متحدہ نمایاں طاقت ہے۔ اس کی طرف دنیا کی نگاہیں لگی ہوئی ہیں، جو امن اور جنگ کے بارے میں تصفیہ کرنے میں دستِ راست کی حیثیت رکھتا ہے۔ جہاں چوٹی کے اہل علم و فن جمع ہیں، جن کے اطراف مختلف ممالک سے پروانوں کی طرح علم کے پیاسے جمع ہوتے ہیں جہاں کی عمارتیں نہایت شاندار اور جہاں کی لائبریریاں وسیع تر ہیں۔ جہاں ہزاروں قسم کے میگزین اور رسالے شائع ہوتے ہیں۔ سائنس میں مختلف موضوعات پر وسیع پیمانے پر تحقیق کا کام ہوتا ہے۔ جہاں کے فیشن کی نقل کی جاتی ہے۔ جہاں "ہالی وڈ" جیسا فلمی ادارہ ہے۔ جس میں صحت، تعلیم، سماج اور تحقیق سے متعلق پکچرز بنتے اور ملک ملک میں پھیلائے جاتے ہیں، جہاں مختلف بیماریوں کے علاج پر ریسرچ ہوتی ہے اور اکثر کارآمد نتائج دنیا کے سامنے پیش کئے جاتے ہیں۔ جہاں کی تصویر کشی اپنا جواب نہیں رکھتی۔ اور جہاں مختلف موضوعات پر سینکڑوں رسائل صبح و شام شائع ہوتے ہیں۔ جہاں ڈالر یعنی سونے کا سکہ چلتا ہے جہاں اخبارات کے سنڈے ایڈیشن ڈیڑھ ڈیڑھ سو صفحات پر مشتمل ہوتے ہیں۔ جہاں جمہوریت اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ بہار پر ہے۔

امریکہ کی تاریخ میں دورِ جدید کی ابتدا، جنگ عظیم کے بعد سے ہوتی ہے کیونکہ اس لڑائی کے دوران پہلی بار امریکہ کھل کر میدان میں آیا اور اسے اپنی سیاسی اہمیت اور دولت کی فراوانی کا احساس ہوا، آج دنیا کے تمام اہم ملکوں سے اس کے تجارتی اور ثقافتی

تعلقات ہیں جغرافیائی اور تاریخی صورت حال نے امریکہ کو اس کا موقع دیا ہے کہ اس کی صنعت و تجارت میں اضافہ ہو۔ امریکہ کا اقتدار اتنا بڑھ چکا ہے کہ وہ یورپ اور ایشیا کے اکثر ملکوں کا قائد بن گیا ہے اس میں بھی شک نہیں ہے کہ امریکہ کی زیادہ تر آبادی خوش حال ہے۔ وہاں کا کاشتکار فارغ البال ہے۔ عوام اپنی خوشحالی کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں، اس لئے پروپیگنڈہ اور اشتہار بازی کا کوئی حربہ نہیں چھوڑتے۔ امریکہ اپنے ملک کی تہذیب کو دلکش بنانے اور اس کی بھرپور نمائش کرنے پر پوری قدرت رکھتا ہے۔ یہاں فطرت کی فیاضی اور انسان کی محنت بارآور ہے لیکن چونکہ امریکہ ابھی کم عمر ہے، اس لئے اس کی تہذیب کی جڑیں بہت گہری نہیں ہیں۔

ٹیلی وژن

ادھر چند سال کے اندر اندر کئی ممالک میں ٹیلی وژن سے تعلیم کا کام باقاعدہ طور پر لیا جانے لگا ہے اور روز بروز اس کے امکانات بڑھتے جا رہے ہیں۔ اس وقت امریکہ، انگلستان، فرانس روس، اٹلی اور جاپان میں بہت سے طلبہ اس جدید ذریعے سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ ابتدائی مدارس سے لے کر اعلیٰ تعلیم کے اداروں تک سب ہی جگہ ٹیلی وژن کے فیض سے بہرہ اندوز ہونے کی سعی کی جا رہی ہے اور تعلیمی کارکنوں نے اسے تعلیم کا ایک مفید اور دلچسپ ذریعہ تسلیم کیا ہے اپنے حلقۂ اثر کے اعتبار سے اس معاملے میں امریکہ کو فوقیت حاصل ہے۔ وہاں اس طرف اب تک دوسرے ممالک کے مقابلے میں سب سے زیادہ توجہ دی گئی ہے اور درجے کی تعلیم میں اس کا عمل دخل کافی بڑھا دیا گیا ہے۔ ٹیلی وژن کے استاد کو باقاعدہ تربیت بھی دی جاتی ہے اور ایک عام استاد کے مقابلے میں اسے اور کئی سہولتیں حاصل ہیں۔ وہ دن بھر میں صرف ایک یا دو سبق پڑھاتا ہے۔ اسے ٹیلی وژن پر پیش ہونے سے قبل اپنے سبق کو دیکھنے کا موقع بھی ملتا ہے۔ اور سبق کی تیاری میں آرٹسٹ اور فلم لائبریرین کا تعاون بھی حاصل ہوتا ہے تاکہ توضیحی سامان کا انتخاب اور استعمال بحسن و خوبی کیا جا سکے۔

وہاں مالی اور فنی وسائل کی فراوانی ہے اور نئے نئے تجربے کرنے کی لگن۔ تاہم مدرسے کے اندر ٹیلی وژن سے خاطر خواہ استفادہ نہیں کیا جا سکا ہے۔ اور مختلف دشواریاں پیش آئی ہیں۔ اولاً خلوص نیت کے باوجود مدرسے کے نظامِ اوقات کے ساتھ ٹیلی وژن کا پروگرام ہم آہنگ نہیں کیا جا سکا۔ آپ جانتے ہیں کہ تعلیمی کام کی رفتار کارخانوں کے کام کی رفتار کی طرح ہر جگہ پابندیٔ اوقات کے ساتھ یکساں طور پر برقرار نہیں رکھی جا سکتی۔ ہر مدرسے اور جماعت کے اپنے انفرادی مسائل ہوتے ہیں۔ خواہ ایک ہی نہج پر کام کیوں نہ کیا جائے، ایک ہی وقت پر ایک سے نتائج حاصل نہیں ہو سکتے۔ اس بنا پر ٹیلی وژن کے پیش کردہ پروگرام سے تمام مدرسے یکساں فائدہ نہیں اٹھا سکے۔

اور اس کی افادیت بعض اوقات نغمۂ بے ہنگام ہونے کی وجہ سے مجروح ہو جاتی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ٹیلی وژن کے بندھے ٹکے پروگرام نے نصاب میں ردّ و بدل بھی دشوار کر دیا ہے۔ اور استاد کی جودتِ طبع تہہ داماں رہنے پر مجبور ہو گئی ہے۔ اب جائز حدود کے اندر بھی موقع کی مناسبت اور جماعت کی ضرورت کے پیشِ نظر تدریس کے کام میں تبدیلی کی گنجائش باقی نہیں رہی ہے۔ اساتذہ کو مجبوراً ٹیلی وژن کے ذریعے پیش کئے جانے والے مقررہ مرکزی پروگرام کے تحت اپنے اسباق اور عنوانات کو دن، تاریخ اور گھنٹے کی پابندی کے التزام کے ساتھ رکھنا پڑتا ہے۔ یہ پروگرام یکطرفہ معاملہ ہوا کرتا ہے اور ہمیشہ طلبہ کی سابقہ معلومات سے ہم آہنگ نہیں ہوتا اس لئے اس کا اثر اتنا گہرا نہیں ہوتا جیسا کہ استاد اور ہمیشہ طلبہ کی جماعت کے باہمی لین دین سے ہوتا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ٹیلی وژن ایک بے فیض ذریعہ تعلیم ہے اور اس کا استعمال ہمارے تعلیمی اداروں کے لئے فضول ہے۔ ٹیلی وژن بلا شبہ دورِ حاضر کی ایک نعمت ہے اور اس ایجاد سے نئے ذہنوں کی جلا کا کام ضرور لینا چاہیئے۔ تعلیم کے میدان میں توضیحی سامان کا ایک خاص مقام ہے۔ اس کی بدولت طلبہ کا نہ صرف ذوق و شوق ابھرتا ہے اور ان کے اندر آمادگیٔ کار پیدا ہوتی ہے بلکہ مسائل کی پیچیدگیاں بھی دور ہوتی ہیں۔ اور دقیق نکات کی وضاحت میں آسانی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس معاملے میں ٹیلی وژن کا درجہ اب تک کی تمام توضیحات سے بلند ہے۔ اپنے استعمال کے تنوع کے اعتبار سے ٹیلی وژن کا پروگرام ایک تعلیمی فلم کے مقابلے میں زیادہ "جاندار" کہلانے کا مستحق ہے۔ تعلیمی فلم کی تیاری کے لئے زیادہ مدت اور دولت درکار ہے اور پھر بھی وہ "جامد" ہو کر رہ جاتا ہے۔ لیکن ٹیلی وژن کا پروگرام اپنے اندر کم و بیش وہی لچک اور تڑپ رکھتا ہے جو ایک استاد کے درس میں ہوتی ہے۔ اس صورت میں طلبہ کو ایک استادِ مجازی مل جاتا ہے۔ اور مدرسے کے اساتذہ کو اپنا معیار قائم کرنے میں مدد ملتی ہے۔ ان کے سامنے اچھے اسباق کے نمونے آ جاتے ہیں جن کو پیشِ نظر رکھ کر آئندہ اپنے کام کو بہتر بنایا جا سکتا ہے۔ ٹیلی وژن کے ذریعے ان حالات کو پیش کیا جا سکتا ہے جو جماعت کی محدود فضا میں ایک عام استاد کی دسترس سے باہر ہوتے ہیں۔ مثلاً طلبہ کو دلیس پردلیس کی تہذیب اور رسم و رواج سے آشنا ہونے کا موقع حاصل ہو جاتا ہے۔ وہ اہم شخصیات سے متعارف

ہوجاتے ہیں اور وہ نادر اشیاء کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ اس طرح مشکل نکات اور خطرناک تجربات سے بھی طلبہ کو کماحقہٗ آگاہ کیا جاسکتا ہے۔ ایک عام مدرسے کے وسائل اور ایک عام استاد کے دائرۂ عمل کی حدود متعین ہوا کرتی ہیں لیکن ٹیلی وژن کے پروگرام کی مدد سے تدریس کے معیار کو بہت کچھ بلند کیا جاسکتا ہے۔ ٹیلی وژن پروگرام کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اسے ایک استاد کی تدریس کی مدت کے مقابلے میں نسبتاً کم وقت میں مکمل کیا جاسکتا ہے۔

ٹیلی وژن کی اس فیض رسانی کے باوجود یہ تو کوئی بھی نہیں چاہتا کہ استاد کی جگہ ٹیلی وژن سیٹ کو دے دی جائے اور مدرسے کی تعلیم کا سارا وقت اس طرح مرکزی پروگرام پیش کرکے ختم کردیا جایا کرے۔ مگر ٹیلی وژن کے پروگرام کو تعلیم کے کام میں ایک بڑے موثر محرک کی حیثیت سے استعمال کیا جاسکتا ہے اس طرح طلبہ کا وقت صرف کرکے ان کے جماعتی کام میں توانائی پیدا کی جاسکتی ہے اور استاد جماعت کے کام کو آسان اور وقیع بنایا جاسکتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ اچھے اساتذہ کے فیض کو عام بنانے کی صورت نکل آتی ہے۔ امریکہ میں بڑے پیمانے پر اس کام کو سنہ ۱۹۵۰ء میں شروع کیا گیا اور اسے بہر طور فروغ دیا جارہا ہے تاہم کشتِ زارِ علم کو اس ابرِ کرم سے کسی حد تک ہی فائدہ پہنچ سکا ہے۔ اور ٹیلی وژن کے استعمال نے اساتذہ کے لئے مختلف عملی دشواریاں اور اصولی مسائل پیدا کردیئے ہیں۔ ہمارے دیس میں دوسرے پنج سالہ قومی منصوبے کے آخر میں صرف دہلی کے لئے تجرباتی طور پر ٹیلی وژن کا انتظام کیا گیا اور منتخب ثانوی مدارس کے لئے اس کے ذریعے تعلیمی پروگرام کی سہولتیں بہم پہنچائی گئی ہیں۔ آئندہ تیسرے منصوبے کے اختتام پر چالیس لاکھ روپے کی لاگت سے بمبئی میں ٹیلی وژن کا اہتمام کرنے کا خیال ہے۔ بہت سے لوگوں کے نزدیک دیس کے موجودہ اقتصادی حالات کے پیشِ نظر اس قسم کی فروعات کی طرف قطعی توجہ نہیں کرنی چاہیئے اور قومی کلچر میں ہمیشہ ضرورت اور اہمیت کا لحاظ رکھنا چاہیئے۔ انھیں ٹیلی وژن کی افادیت سے انکار نہیں ہے لیکن ان کے نزدیک اس سے زیادہ اہم اور بنیادی ضرورتوں کی تکمیل کو نظرانداز کرنے کے بعد اس طرف توجہ کرنے سے ہم حقیقت پسندی سے بہت کچھ دور ہوجاتے ہیں۔ تعلیم کے مخصوص میدان میں یہ اعتراض کچھ زیادہ درست اور بجا معلوم ہوتا ہے۔ ابھی ہماری تعلیم کے تنِ لاغر کو قوتِ لایموت کی ہی فکر لاحق ہے۔ اولاً ہم اپنے اس فریضے سے عہدہ برا ہوجائیں،

اس کے بعد شستگی کے مراحل طے کرنے کا حوصلہ کرنا چاہیئے۔

اس اصولی اعتراض سے قطع نظر دہلی میں تعلیمی ٹیلی وژن کے شروع کرنے میں بڑی عجلت سے کام لیا گیا ہے اور بڑی حد تک اس کا آغاز غیر منظم طور پر ہوا ہے۔ اس باب میں پہلی ضرورت یہ تھی کہ دہلی میں اساتذہ کی تربیت کرنے والے اداروں کو اس نئے توضیحی سامان سے مستفید کیا جاتا اور اس کے ذریعے نئے اساتذہ کی تربیت کا انتظام کیا جاتا۔ اس کے ساتھ ساتھ دہلی کے اساتذہ کو ان نمونے کے اسباق کو دیکھنے کے مواقع فراہم کئے جاتے۔ کہیں یہ کام براہِ راست ثانوی مدارس کی منزل پر شروع کیا گیا اور اس غرض سے صرف چند اساتذہ کو وقتی ضرورت کے تحت کچھ معلومات بہم پہنچائی جا سکی ہیں۔ جب کہ امریکہ میں ٹیلی وژن کی برکت بلا زحمت اساتذہ اور طلبہ کو میسر نہیں آسکتی۔ اور اس کی بہت سی خامیاں محسوس ہو رہی ہیں، ہمارا کام تو ابھی محض ابتدائی منزل میں ہے۔ اس سے بے جا توقعات سے قائم نہیں کرنی چاہیں تاہم موجودہ وسائل سے پورے طور پر ضرور فائدہ اٹھانا چاہیئے اور دہلی کے برسرِ روزگار اساتذہ اور تربیت پانے والے اساتذہ کو اس سے پورے طور پر استفادہ حاصل کرنے کی تدابیر اختیار کرنی چاہئیں۔

"معلّم"

تعارف و تبصرہ

(تبصرہ کے لئے ہر کتاب کے دو نسخے بھیجنا ضروری ہے)

مولانا محمد علی — بحیثیت تاریخ ساز

مرتبہ: محمد سرور

سائز $\frac{20 \times 30}{16}$ حجم ۴۷۰ صفحات۔ مجلد۔ قیمت آٹھ روپے۔ تاریخ اشاعت: جنوری ۱۹۶۲ء

ناشر: سندھ ساگر اکادمی۔ انارکلی، چوک مینار۔ لاہور ۲ (پاکستان)

مرتب کتاب، پروفیسر محمد سرور صاحب نے لکھا ہے کہ "برصغیر پاک و ہند کی اسلامی سیاست کو اس صدی میں سب سے زیادہ تین شخصیتوں نے متاثر کیا ہے۔ ایک قائدِ اعظم محمد علی جناح، دوسری شخصیت رئیس الاحرار مولانا محمد علی اور تیسری مولانا ابوالکلام آزاد کی تھی"۔ ان تینوں شخصیتوں پر موصوف الگ الگ کتاب لکھنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ سب سے پہلے مولانا محمد علی مرحوم پر اس لئے لکھا ہے کہ ان کے نزدیک مرحوم "مسلمانانِ برصغیر کی سب سے بڑی عوامی یعنی عوام مسلمانوں کی ہمہ جہتی زندگی کی نمائندہ و ترجمان شخصیت تھی"۔ کتاب کی ترتیب میں سب سے زیادہ مدد مولانا محمد علی مرحوم کے مضامین اور خطوط کے ان مجموعوں سے لی گئی ہے جو کافی مدت ہوئی خود سرور صاحب نے مرتب کئے تھے، اس کے علاوہ مولانا مرحوم کی ایک نامکمل کتاب سے ان کی آپ بیتی کے حصے انتخاب کرکے شامل کئے گئے ہیں۔ فاضل مرتب اس کتاب کا دوسرا حصہ بھی لکھنے کا ارادہ رکھتے ہیں، جس میں خود ان کے الفاظ میں "مولانا کی سیاسی زندگی اور اس دور میں مرحوم و مغفور کا جو اہم اور تاریخی کردار رہا ہے، اس پر ایک تنقیدی نظر ڈالی جائے گی اور ان کی عظیم شخصیت کے پس منظر میں اس سارے دور کا جائزہ لیا جائے گا"۔

ہم نے پوری کتاب کو بڑی دلچسپی اور غور سے پڑھا ہے۔ واقعی اس سے مولانا مرحوم کے حالات اور ان کے ذہن کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے، اس دور کے سیاسی خلفشار کی ایک جھلک

بھی سامنے آتی ہے اور اُن اسباب پر بھی روشنی پڑتی ہے جن کی بنا پر مولانا محمد علی جیسا مخلص اور دل و دماغ کا آدمی اپنی زندگی میں بڑی حد تک ناکام رہا ہے۔ خدا کرے کہ فاضل مرتب دوسری موعودہ کتابیں جلد ہی مرتب کر کے شائع کر سکیں تاکہ اس دور کی، جو برصغیر کی تاریخ آزادی کا اہم ترین دور ہے، مکمل تصویر سامنے آ سکے۔

سخن مختصر　　　از معین احسن جذبی

سائز ۱۸×۲۲، حجم ۹۴ صفحات، طباعت خوب صورت ٹائپ میں کاغذ عمدہ، مجلد، قیمت دو روپے تاریخ اشاعت: ۱۹۶۰ء۔ ناشر: انجمن ترقی اُردو (ہند) علی گڑھ۔

جذبی صاحب ان چند نوجوان شعراء میں سے ہیں، جو پیشے کے طور پر شاعری نہیں کرتے، بلکہ اسی وقت کہتے ہیں جب وارداتِ قلب سے مجبور ہوتے ہیں۔ اس لئے کم کہتے ہیں اور جو کچھ کہتے ہیں وہ صحیح معنی میں ان کے دل کی آواز ہوتی ہے۔ اس مجموعۂ کلام میں ۳۱ نظمیں اور غزلیں شامل ہیں۔ جن میں بعض کافی طویل ہیں۔ باقی "سخن مختصر" کہی جا سکتی ہیں۔ جذبی ترقی پسند شاعر ہیں۔ چنانچہ اس مجموعہ میں متعدد جگہ اس کا اظہار ملتا ہے، مگر "میٹھے" قسم کے ہیں، اس لئے اظہار میں انتہا پسندی نہیں ملے گی۔ مثال کے طور پر "نیا سورج" پیش کی جا سکتی ہے، جو ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء سے متعلق ہے بہت سے ترقی پسند شعراء نے ہندوستان کی آزادی کو آزادی تسلیم نہیں کیا تھا، مگر جذبی کہتے ہیں:

بڑے ناز سے آج اُبھرا ہے سورج
ہمالہ کے اونچے کلس جگمگائے
پہاڑوں کے چشموں کو سونا بنایا
نئے بل، نئے زور ان کو سکھائے

لباسِ زری آبشاروں نے پایا
نشیبی زمینوں پہ چھینٹے اڑائے
گھنے اونچے اونچے درختوں کا منظر
یہ ہیں آج سب آبِ زر میں نہائے

اور جب۔ حرفِ شکایت زبانِ قلم پر لاتے ہیں تو اس سے ہمدردی اور خلوص کا اظہار ہوتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ شاعر ملک کی بھلائی کے لئے کہہ رہا ہے، نہ کہ محض اعتراض کی خاطر یا کسی مخصوص پالیسی کے ماتحت۔ مثلاً :

مگر ان درختوں کے سائے میں اے دل
ہزاروں برس کے یہ ٹھٹھرے سے پیڑے
ہزاروں برس کے یہ سمٹے سے پودے
یہ ہیں آج بھی سرد، بے حال، بے دم
یہ ہیں آج بھی اپنے سر کو جھکائے

اور ساتھ ہی یہ بھی کہتے ہیں :

ارے او نئی شان کے میرے سورج
تری آب میں اور بھی تاب آئے

اسی طرح ایک مسلسل غزل میں یوں شکایت کی گئی ہے :

آج بھی جسم اُسی طرح فگار و مجروح
آج بھی قلب اسی طرح تپاں ملتے ہیں
آج بھی دل ہیں کہ ہو حشر کا دھوکا جن پر
آج بھی لب ہیں کہ سرگرمِ فغاں ملتے ہیں

مگر اس غزل کا مطلع اور آخری شعر ملاحظہ ہو :

دل میں کچھ سوزِ تمنا کے نشاں ملتے ہیں
اس اندھیرے میں اجالے کے سماں ملتے ہیں
یوں گوارا ہے یہ خونبار اُفق کا منظر
اس کے پرتو میں ہمیں تازہ جہاں ملتے ہیں

اس مجموعے میں ایک نظم وطن کی تقسیم پر بھی ہے۔ اس موضوع پر بہت سے شعراء نے نظمیں کہی ہیں مگر جذبی کے یہاں جو سوز و گداز اور درد مندی ہے، وہ کسی اور کے یہاں مشکل ہی سے ملے گی۔ شروع کے چند شعر ملاحظہ ہوں:

کیا یہی انقلاب ہے؟ قلب اِدھر جگر اُدھر — نالۂ بےقرار اِدھر، شورشِ چشمِ تر اُدھر
اف رے سیاستِ چمن، رنگ کو بو سے سوءِ ظن — کو رہے نرگسِ وطن، نور اِدھر نظر اُدھر
ایک تبسمِ فرنگ، مردوا فق لہو ترنگ — نعش بدوش و نالہ زنگ، شام اِدھر سحر اُدھر

اس مجموعہ کی یہ ادا مجھے بہت پسند آئی کہ نہ کوئی تمہید ہے، نہ کوئی پیش لفظ اور نہ کوئی مقدمہ حتیٰ کہ شاعر کے پچھلے یا آئندہ مجموعہ کلام کا کوئی اشتہار بھی نہیں۔ اس سے تبصرہ نگار کی مشکل تو ضرور بڑھ جاتی ہے، کیونکہ وہ ان ہی کا سہارا لے کر لکھنے کا عادی ہے، لیکن یہ روایت اگر رائج ہو جائے تو لوگ نثری قصیدہ کے مطالعہ سے محفوظ ہو جائیں گے۔

اُردو کی تعلیم کے لسانیاتی پہلو — از ڈاکٹر گوپی چند نارنگ

سائز ۲۲×۱۸، حجم ۷۴ صفحات، کتابت، طباعت اور کاغذ عمدہ۔ غیر مجلّد قیمت: ڈیڑھ روپے۔ تاریخ اشاعت: جولائی ۱۹۶۱ء ناشر آزاد کتاب گھر کلاں محل دہلی ۶

جہاں تک مجھے معلوم ہے کہ دنیا کی ترقی یافتہ زبان کی طرح اُردو کی اعلیٰ تعلیم کا کوئی سائنٹفک طریقہ رائج نہیں ہے اور نہ ابھی تک اس طرف کوئی خاص توجہ کی جا رہی ہے۔ مکتبی تعلیم کے قدیم طریقے کے ختم ہونے اور عربی و فارسی کے زوال کے بعد اردو زبان و ادب کا معیار برابر گرتا جا رہا ہے۔ اس کے علاوہ موجودہ سیاسی حالات کے پیش نظر بیرونی ممالک میں اردو کی تعلیم کی طرف توجہ دی جا رہی ہے، اس لئے اردو کے لسانی مسائل کو سائنٹفک طریقوں سے حل کرنے کی شدید ضرورت ہے۔ وقت کی اسی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے زیر تبصرہ کتاب لکھی گئی ہے اور اس میں شبہ نہیں کہ اپنے مباحث کے اعتبار سے یہ مختصر کتاب بہت مفید ہے۔

اس کتاب کے مخاطب غالباً اعلیٰ تعلیم کے اساتذہ ہیں۔ اگر یہ صحیح ہے جب بھی اس کو انگریزی زبان کی غلامی سے آزاد رکھا گیا ہوتا تو اچھا تھا۔ سوا سات سطروں کا ایک اقتباس صرف انگریزی میں نقل کیا گیا ہے۔ ترجمہ دینے میں کیا قباحت تھی، یہ سمجھ میں نہیں آیا۔ اسی طرح انگریزی اور اردو کی گنگا جمنی بھی سمجھ میں نہیں آئی۔ ایسے چند فقرے ملاحظہ ہوں :

اُنسے LOW FRONT مصوتہ کہیں گے۔ اس طرح پیدا ہونے والی زبان کو MID FRONT مصوتہ کہتے ہیں۔ ایسی آواز کو HIGH FRONT مصوتہ کہیں گے۔ (صفحہ ۱۷)

بعض اصطلاحات کے ترجمے بھی قابلِ غور ہیں۔ مثلاً UNDERSTANDING کا ترجمہ افہام کے بجائے ادراک زیادہ بہتر ہے۔ چونکہ مولف کی رہنما کتابیں انگریزی میں تھیں، اس لئے کہیں کہیں عبارت میں ترجمہ پن پیدا ہوگیا ہے۔ مثلاً

"طالب علم استعمالِ زبان کی دوسری سطح پر پہنچتا ہے یعنی الفاظ اور افعال کا صحیح استعمال خودکار (AUTOMATIC) ہو جاتا ہے۔" (صفحہ ۴۳)

دیمک کی کہانی

از : عبدالبصیر خاں

سائز ۲۰×۳۰ / ۱۶ ، حجم ۴۳ صفحات۔ غیر مجلد۔ قیمت دو روپے۔ تاریخ اشاعت ۱۹۶۰ء

ناشر : انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ۔

اردو میں مختلف قسم کے حیوانوں، ان کے رہن سہن اور ان کے فائدے اور نقصانات کے بارے میں بہت کم کتابیں ہیں اور کیڑے مکوڑوں پر تو نہ ہونے کے برابر ہیں۔ انجمن ترقی اردو نے پیش نظر کتاب چھاپ کر ایک مفید خدمت کی ہے۔ اس میں دیمک کے متعلق مکمل معلومات دی گئی ہیں۔ اس کے فائدے اس کے نقصانات اور ان سے بچنے کے طریقے بھی بتلائے گئے ہیں غرضکہ بہت مفید کتاب ہے۔ زبان اگر اور آسان ہوتی تو اچھا تھا۔ کتاب میں دیمک کے متعلق چند تصویریں بھی شامل ہیں۔

ع ل ا

کوائف جامعہ

جامعہ کو یونیورسٹی کا درجہ مل گیا

جامعہ کے ہمدردوں اور بہی خواہوں کو اس اطلاع سے یقیناً بڑی خوشی ہوگی کہ حکومت ہند نے جامعہ کو یونیورسٹی کا درجہ اور بی اے اور بی ایڈ کی ڈگریاں دینے کا اختیار دے دیا ہے۔ یوں تو آزادی کے بعد ہی حکومت ہند نے ملازمت کے لئے جامعہ کی ڈگریوں کو دوسری یونیورسٹی کی ڈگریوں کے مساوی تسلیم کر لیا تھا اور بعض یونیورسٹیوں نے بھی انھیں متعلقہ پوسٹ گریجویٹ کلاسوں میں داخلے کے لئے منظور کر لیا تھا، لیکن اس سے اصل مسئلہ حل نہیں ہوا۔ ایک تو حکومت ہند کی یہ منظوری مستقل نہیں تھی۔ ایک معینہ مدت کے بعد منظوری کی توسیع کی جاتی تھی دوسرے مرکزی حکومت کی ایسی ملازمتیں بہت کم ہیں، جو ہمارے فارغ التحصیل طلبہ کو ان کی تعلیمی استعداد کے مطابق حاصل ہوسکیں۔ دراصل ضرورت اس بات کی تھی کہ جامعہ کی قانونی حیثیت تعلیمی اعتبار سے معیّن کی جائے۔ خدا کا شکر ہے کہ اب جامعہ کی حیثیت مقرر ہوگئی ہے۔ اس اعلانیہ کے بعد اب اسے یو۔جی سی ایکٹ (۱۹۵۶ء) کی دفعہ ۳ کے مطابق یونیورسٹی کا درجہ مل گیا ہے۔ ارباب جامعہ ایک طویل عرصے سے کوشش کر رہے تھے کہ جامعہ کو اعلیٰ تعلیم کا ایک آزاد ادارہ مان کر اس کو یونیورسٹی کی ڈگریاں دینے کا حق دے دیا جائے۔ بفضلہٖ ان کی یہ آرزو پوری ہوئی اور ان کی کوششیں بر آئیں۔

صبح ظفر از مشرق امید بر آمد
اصحاب غرض را شب سودا بسر آمد

انشاء اللہ اب جامعہ اپنے کام کو بہتر طور پر منظم کر سکے گی اور اس میں وسعت بھی پیدا کر سکے گی۔

طالب علموں کی تعداد میں بھی اضافہ ہوگا اور معیار تعلیم بھی بلند کیا جاسکے گا۔

اس خوشی کے موقع پر اس کا ذکر نامناسب نہ ہوگا کہ جامعہ مخصوص حالات میں قائم ہوئی تھی۔ اس نے آزاد تعلیم کا نعرہ بلند کیا تھا اور ہندوستانیوں خصوصاً مسلمانوں کی قومی تعلیم کا بیڑا اٹھایا تھا، اس کی راہ میں کٹھن سے کٹھن مرحلے آئے، مگر اس نے اپنی امتیازی خصوصیات کی ہمیشہ حفاظت کی اب ملک کے حالات یکسر بدل گئے ہیں اتنی بڑی تبدیلی آئی ہے کہ جامعہ کے قیام اور اس کے مقاصد طے کرتے وقت اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا مگر اس کے باوجود جامعہ کے لوگ اپنے اندر اس کا حوصلہ رکھتے ہیں کہ اس کی بنیادی خصوصیات کو باقی رکھنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھیں گے۔ ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب کو اس مژدۂ جانفزا کی خبر ملی تو انھوں نے قائم مقام شیخ الجامعہ ڈاکٹر سلامت اللہ صاحب اور اساتذہ و کارکنان جامعہ کو مبارک باد دیتے ہوئے لکھا کہ

"اس کامیابی کے ساتھ بڑی ذمہ داریاں، بڑی مشکلیں اور بڑے خطرے ہیں، جو ہمارا بڑا کڑا امتحان لیں گے۔ خدا ہمیں اس امتحان میں پورا اترنے کی توفیق دے"۔

شیخ الجامعہ صاحب کی مصروفیات

شیخ الجامعہ پروفیسر محمد مجیب صاحب نے وزیراعظم پنڈت جواہر لال نہرو کی خواہش پر قومی یکجہتی کونسل کی رکنیت قبول فرمائی اور ۲ و ۳ جون کو اس کا پہلا اجلاس منعقد ہوا تو اس کی کارروائیوں میں شرکت کی۔ اس موقع پر مجیب صاحب اس مخصوص کمیٹی کے ممبر بھی منتخب کر لئے گئے ہیں جو فرقہ واریت کی تعریف کے لئے بنائی گئی ہے۔

۷ جون کو ایک علمی کام میں شرکت کے لئے موصوف دوبارہ مغربی جرمنی تشریف لے گئے ہیں۔ انشاء اللہ جولائی کے پہلے ہفتہ میں واپس آجائیں گے۔

طابع وناشر: عبداللطیف اعظمی   مطبوعہ: یونین پریس دہلی   ٹائیٹل: دیال پریس دہلی

جامعہ

سالانہ چندہ
چھے روپے

قیمت فی پرچہ
پچاس نئے پیسے

جلد ۴۷ || بابت ماہ اگست سنہ ۱۹۶۲ء || شمارہ ۲

فہرست مضامین

خط و کتابت کا پتہ

رسالہ جامعہ، جامعہ نگر، نئی دہلی

فراق کا شعورِ غم

جناب سید عالم خوندمیری

فراق اردو شاعری کا ایک قیمتی سرمایہ ہیں اور اردو زبان کی یہ ایک خوش بختی ہے کہ اسے میرؔ، غالبؔ اور اقبالؔ کے بعد فراقؔ جیسا شاعر ملا۔ فراق صرف میرؔ اور غالبؔ کا تسلسل نہیں ہیں۔ بلکہ واقعی ارتقاء کی ایک کڑی ہیں صرف فراقؔ کی شاعری کے گہرے مطالعہ سے ہی یہ جاننا ممکن ہے کہ ہماری شاعری میں کن عناصر کی اور کونسے اجزا کی کمی تھی جس کی فراق نے تکمیل کی۔ اردو شاعری کی تاریخ کے اسٹیج پر جب فراقؔ نمودار ہوئے ہیں اردو شاعری کا دامن میرؔ اور غالبؔ کے آفاقی نغموں سے بھرا ہوا تھا اور اقبالؔ اس شاعری کو عالمی شاعری کا ایک پائیدار جزو بنانے میں مصروف تھے۔ اتنے دیو قامت فن کاروں کا مقابلہ تو بڑی بات ہے آنکھ سے آنکھ ملانا ایک بڑا کارنامہ تھا اور اس کارنامے کے لئے بڑی ہمت اور طاقت کی ضرورت تھی۔ فراقؔ نے اس مہم کو انجام دیا اور ان عظیم فن کاروں کی صف میں اپنی جگہ بنائی۔ فراقؔ نے بہت کچھ لکھا ہے اور میرا یہ دعویٰ نہیں ہے کہ ان کا ہر شعر ایک الہام ہے اور کس شاعر کے بارے میں یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے؟ لیکن ان کا امتیازی وصف یہ ہے کہ ان کی شاعری میں واقعی "الہامی" عنصر اس حد تک نمایاں ہے کہ اس کو غیر الہامی عنصر سے آسانی کے ساتھ علیحدہ کیا جا سکتا ہے۔ ان کی شاعری کے تمام لمحات تخلیقی نہیں ہیں بلکہ میں یہاں تک ماننے کے لئے تیار ہوں کہ واقعی تخلیقی لمحات بہت زیادہ نہیں لیکن ان کی شاعری کا ایک سرسری مطالعہ بھی ایک صاحبِ ذوق کو اس بات کے ماننے پر آمادہ کر دیتا ہے کہ اتنے پرخلوص اور حقیقی لمحات بہت کم فنکاروں کو نصیب ہوتے ہیں۔ وہ وجدان کے عروجی لمحے کو چھو لیتے ہیں اور پھر ان کی شاعری اس لمحے کی ترجمان بن جاتی ہے۔ انھیں اپنی اس معراج کا شعور ہے

اور اس لئے وہ اس بات کا اعلان کر سکتے ہیں کہ :

ہر جلوے سے اک درس نمو لیتا ہوں — چھلکے ہوئے صد جام و سبو لیتا ہوں
اے جان بہار! تجھ پہ پڑتی ہے جب آنکھ — سنگیت کی سرحدوں کو چھو لیتا ہوں

یہ جان بہار صرف ایک شخصی وجود نہیں ہے بلکہ کائناتی حسن کی ایک جھلک ہے۔ ایک ایسی جھلک جس میں جلال اور جمال دونوں پنہاں ہیں۔ فراق کے وجدان نے حسن کائنات یا کائناتی حسن کی ایسی کئی جھلکیاں دیکھیں لیکن ان کا وجدان اتنا بھرپور اور اتنا مکمل ہے کہ ان پر جذب کی سی کیفیت طاری نہیں ہوتی۔ وہ اس لمحہ میں گم نہیں ہوتے بلکہ اپنے آپ کو دریافت کر لیتے ہیں اگر وجدان کا یہ لمحہ ان پر طاری ہو جاتا اور وہ اس کیفیت میں گم ہو جاتے تو پھر ان کی شاعری میں وہ انسانی اور آفاقی عنصر باقی نہ رہتا جو ان کی شاعری کی امتیازی کیفیت ہے۔ انھیں سنگیت کی سرحدوں تک پہنچنے میں کامیابی ہوئی لیکن اس منزل پر بھی انھوں نے اپنے شخصی وجود کو اور اپنی انفرادیت کو باقی رکھا۔ اپنے شخصی وجود اور اپنی انفرادیت کو اس منزل پر کھو دینا آسان ہے لیکن باقی رکھنا صرف ایک عظیم فنکار ہی کا حصہ ہے۔ وہ اپنی ہستی کے قطرے میں "دجلہ" کو یا یوں کہئے "گنگا" کو دیکھ لیتے ہیں لیکن اس قطرے کی انفرادیت کو باقی رکھنے کی شعوری کوشش کرتے ہیں۔ اس قطرے کا کمال یہ ہے کہ اس میں حقیقت کی تصویر نظر آئی اور قطرے کو دریا میں فنا کر دینا قطرے کی عشرت کا سامان نہیں بلکہ قطرے کی موت ہے۔ ان کے نغموں میں اس اندیشے کی دھڑک بار بار سنائی دیتی ہے کہ کہیں یہ قطرہ "غرق دریا" نہ ہو جائے۔ اس لئے غالب کی طرح وہ بھی وصل میں "شب ہجراں" کی تمنا محسوس کرتے ہیں۔ ایک خود آگاہ اور عارف ذات وجود ہی اس تمنائی لمحہ میں ہجر کی "لذت" کو یاد کر سکتا ہے۔ "انا" کی معراج یہ ہے کہ اسے "وصل" کا یہ لمحہ نصیب ہو لیکن اگر یہ لمحہ ٹھہر جائے اور یہ ساعت منجمد ہو جائے تو پھر یہی معراج "انا" کی موت بن جاتی ہے۔ اس لئے فراق وصل کی ساعتوں کی تمنا کرتے ہوئے کم نظر آتے ہیں اور فراق کی گھڑیاں انھیں زیادہ محبوب ہیں۔ غالب کی شاعری کا یہ رجحان فراق کی شاعری میں پوری طرح ابھر آتا ہے لیکن اس فرق کے ساتھ کہ

فراق، غالب کی صدائے بازگشت نظر نہیں آتے بلکہ غالب کی شاعری کے اس لمحے کا نقطۂ عروج نظر آنے لگتے ہیں۔ غالب نے وصل کی ساعتوں میں جب ہجر کی تمنا محسوس کی تو ان کا رویہ ایک حد تک انفعالی تھا اور شاید اس لئے انھوں نے کہا "آئی شب ہجراں کی تمنا مرے آگے" لیکن فراق کا رویہ انفعالی نہیں بلکہ ان کے ہجر کے لمحات ان کی حیات عشق کا ایک بڑا انمول سرمایہ بن جاتے ہیں۔ انھیں کے الفاظ میں

جو تیرے ہجر میں گذری وہ رات رات ہوئی بہت دنوں میں محبت کو یہ ہوا معلوم

یا

تمام عمر میں بس ایک ہی تو رات ہوئی شب فراق میں اٹھے حجاب یاس وامید

ہجر کی اس عظمت کا اور فراق کے لمحات کی اس سعادت کا ذکر ہمیں صرف فراق کی شاعری میں نظر آتا ہے۔ ان کی شاعری میں ہجر کی یہ عظمت صرف ان کا انداز بیان نہیں ہے بلکہ حیات وکائنات کے گہرے مطالعہ کا نتیجہ ہے۔ انھوں نے یہ مطالعہ صرف عقل کی رہبری میں نہیں کیا بلکہ وجدان کی مدد سے یہ منزلیں طے کیں۔ فراق اپنے فلسفہ حیات میں نری عقل کو زندگی کی رہنمائی کے لئے کافی تصور نہیں کرتے بلکہ ادراک حسن کو وجدان کی ایک دین تصور کرتے ہیں۔ عقل صرف منزل تک پہنچا سکتی ہے لیکن منزل کے حسن کا ادراک اس کے بس کی بات نہیں۔ عقل کشتی حیات کو ساحل تک بامراد لے آسکتی ہے لیکن ساحل کے حسن کا شعور حاصل کرے، یہ اس کا منصب نہیں۔

منزل پہ پہنچ کے حسن منزل بھی تو دیکھ محفل میں پہنچ کے حسن محفل بھی تو دیکھ
ساحل پہ پہنچ کے حسن ساحل بھی تو دیکھ تو پیر گئی ہے بحر ہستی اے عقل

حسن محفل۔ حسن منزل اور حسن ساحل کا ادراک ایک بڑی ہمت کا طلبگار ہوتا ہے۔ یہ عشق کو مسرتوں سے مالامال نہیں کرتا بلکہ غم کی اتھاہ حقیقتوں سے روشناس کرتا ہے۔ اس ادراک سے حاصل ہونے والا غم نہ غم ذات ہے اور نہ غم جاناں غم دوراں

ہے اور نہ غم زمانہ بلکہ کائیناتی غم کائیناتی حسن کے ادراک کا حاصل ہے۔ حسن کے اس ادراک پر ہستی اگر حسن کی آگ میں جھلس کر رہ جاتی تو پھر غم کا مداوا ہو جاتا اور انسان غم ہستی سے نجات حاصل کر لیتا لیکن حسن کا یہ وجدان شعور ہستی کے حدود کو بڑھا دیتا ہے اور ماورائیت (TRANSCENDENCE) کے اس لمحے میں ہستی کے حدود منکشف ہو جاتے ہیں۔ یہ انکشاف مسرتوں کے دروازے وا نہیں کرتا بلکہ غم کے امکانات کو روشن کر دیتا ہے۔ فراق کی ایک غزل میں یہ راز عیاں ہوتا ہے اور ان کی زبان الہامی نظر آنے لگتی ہیں۔ "انا" کی محدودیت اور تمنا کی لامحدودیت کی یہ تصویریں دیکھئے:

میں دید کی حسرت بھی ہیں کیف تماشا بھی — کس شان سے پنہا ہوں کس رخ سے نمایاں ہوں
تکمیل کے ہاتھوں بھی میں ہو نہ سکا پورا — کس شوخ کا پیماں ہوں کس دل کا ارماں ہوں
بھولا ہوا افسانہ ٹوٹا ہوا پیمانہ — میں ہی غم جنت ہوں میں ہی دل انساں ہوں
منہ موڑ کے ہستی سے ٹھکرا کے عدم کو بھی — کیا جانئے اب کس سے میں دست و گریباں ہوں
وہ درد ہوں کم ہو کر جو اور بھی بڑھ جائے — میں یعنی فراق اپنی صبح شب ہجراں ہوں

اس کائنات میں انسان کی زندگی کا یہ استبعاد (PARADOX) ہی انسانی زندگی کے عنصری غم کا سرچشمہ ہے۔ انسان ازل سے منزل کا جویا رہا ہے لیکن سعی و جستجو کی کوئی منزل انسان کے لئے آخری منزل نہ بن سکی۔ منزل تک پہنچنے سے پہلے منزل تک پہنچنے کی امید انسانی قلب کو مسرتوں سے مالا مال کرتی رہی لیکن ہر منزل پر انسان نے یہ محسوس کیا کہ یہ ایک مرحلہ ہے منزل آخر نہیں۔ فراق کو انسان کی اس حزن آمیز جستجو کے راز کا عرفان حاصل ہے اور ان کے وجدان نے انسانی تاریخ کے اس المیئے تک رسائی حاصل کر لی ہے۔ فراق محسوس کرتے ہیں کہ شاید منزل کی ہر جستجو کا محرک انسان کا یہ جذبہ رہا ہو کہ اس بظاہر بے مقصد زندگی میں ایک مقصد کی تخلیق کی جائے لیکن کوئی منزل اس جذبہ رائگاں کو جس کا نام انسانی زندگی ہے معنی و مفہوم کا حامل نہیں بنا سکتی۔ اس لئے منزل پر پہنچنے کے بعد بھی جب انسان اپنی جستجو و سعی پر ایک نظر واپسیں ڈالتا ہے تو

یہ محسوس کرتا ہے :

منزلیں گرد کے مانند اڑی جاتی ہیں   وہی انداز جہان گذراں ہے کہ جو تھا

یہ المناک احساس "تاریخ کی جہنم" کی بھرپور سیر سے ہی حاصل ہو سکتا ہے اور کون کہہ سکتا ہے کہ فراقؔ نے اس جہنم کی سیر نہیں کی۔ فطرت کا حسن بھی اس "سیر" میں ساتھ چھوڑ دیتا ہے اور منزل جاناں پہ پہنچ کر شاعر رمز آشنا کی آنکھ بھر آتی ہے۔

فضا تبسم صبح بہار تھی لیکن   پہنچ کے منزل جاناں پہ آنکھ بھر آئی

اس عرفان کے بعد خزاں اور بہار کا فرق مٹ جاتا ہے اور حقیقت کے چہرے سے اعتبارات کے نقاب اٹھ جاتے ہیں۔ عرفان کے ایک ایسے ہی موڑ پر فراقؔ قدیم ہندوستانی عارف کے ہم زبان نظر آنے لگتے ہیں :

"نہ خزاں ہے کچھ نہ بہار کچھ   وہی خار وخس وہی رنگ و بو

فراقؔ نے تاریخ انسانی کی اس لاحاصل جستجو کے عرفان کے کرب کو مٹانے کے لئے "تاریخی ارتقاء کے بے جان لیکن عقلی فلسفے کو اپنانے کی بھی کوشش کی اور "سپاہ روس" کے برلن تک فاصلہ طے کرنے کا انتظار بھی کیا لیکن ایک ایسے لمحے میں بھی عرفان کا ازلی اور ابدی غم ان کا پیچھا کرنے لگتا ہے اور وہ حسن کے ادراک میں محو ہو جاتے ہیں۔ تاریخ کی تبدیلی کے جاں فزا ادراک سے کہیں زیادہ کائنات کا حسن ان کے لئے سہارا اور ذریعہ نجات بن جاتا ہے اور کائنات انھیں اپنے آپ میں ڈوبتی ہوئی نظر آتی ہے یہی وقت اور انسان کی یہ آنکھ مچولی تاریخ کے حزنیہ کا راز ہے اور اس لئے فراقؔ خود انسانی شخصیت کو انسانی سفر کی منزل قرار دیتے ہیں۔

فراقؔ تو ہی مسافر ہے اور تو ہی منزل بھی   کدھر چلا ہے محبت کی چوٹ کھائے ہوئے

اجتماعی عمل جس کا نام تاریخ ہے اور انفرادی عمل جس کا نام محبت ہے، انسانی عمل کے صرف دو پہلو ہیں اور دونوں کا مقصد زندگی کے المیئے کے بنیادی احساس کو دور کرنا ہے۔ تاریخ انسانی اجتماع کی ناکامی کی داستان ہے تو محبت انفرادی زندگی

کی ناکامی کا ایک دردناک واقعہ۔ ہم تاریخ کے کارناموں سے مرعوب ہو جاتے ہیں اور یہ محسوس کرنے لگتے ہیں کہ انفرادی حیثیت سے ناکام انسان تاریخی حیثیت سے ایک کامران وجود ہے لیکن تاریخ کا ہر پچھلا دور گہری نظر سے دیکھیے تو "عصری دور" نظر آنے لگتا ہے۔ انسان ناکامی اور کامیابی کی دو حدوں کے درمیان رقص کرتا ہے اور کسی کنارے پر اسے قرار نہیں۔ انسانی محبت بھی ہجر اور وصل کی ان دو انتہاؤں کے درمیان جھولتی رہتی ہے اور کسی انتہا پر وہ رک جائے یہ اس کی قسمت نہیں۔ وصل کا لمحہ محبت کے ادراک کا لمحہ نہیں اور اس لئے حیاتِ عشق میں ہجر اور فراق کے لمحات وصل کے لمحات سے کہیں زیادہ قیمتی بن جاتے ہیں۔ محبت کی منزلِ مقصود یقیناً فردیت کی موت ہے لیکن دو افراد کا ربط اصل میں دو باشعور ہستیوں کا ربط ہے اور دو ذی شعور ہستیوں کا ربط بنیادی طور پر رفاقت کا ربط نہیں ہوتا بلکہ ایک تصادم سے پیدا ہونے والا ربط ہوتا ہے۔ اخلاقی حیثیت سے یہ کہنا آسان ہے کہ اپنے ہمسائے سے اس طرح محبت کرو جیسے کہ تم اپنے آپ سے کر سکتے ہو لیکن کیا یہ ممکن ہے کہ انسان اپنے ہمسائے سے اسی طرح محبت کرے جیسا کہ وہ اپنے آپ سے کرتا ہے۔ کیا انسانی شخصیتیں کسی ایک نقطہ پر اس طرح مل سکتی ہیں کہ ایک شخص دوسری شخصیت میں پوری طرح ضم ہو جائے جسے شاعری کی زبان میں "وصل" کہا جاتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں کیا یہ ممکن ہے کہ انسانی زندگی میں المیہ کا عنصر پوری طرح ختم ہو جائے اور ایک لمحہ پوری زندگی بن جائے، خلوت کی گھڑی گزرنے ہی نہ پائے اور اگر خلوت کی گھڑی پائدار بھی ہو جائے اور اس لمحۂ وقت کی رفتار رک بھی جائے تو کیا شخصیتوں کے تصادم کا احساس ختم ہو جائے گا۔ اور واقعی دو شخصیتیں ایک وجود بن جائیں گی۔ بیدل کا شاعرانہ عرفان اس امکان کی نفی کرتا ہے۔

ہمہ عمر با تو قدح زدیم و نہ رفت رنجِ خمارِ ما　　　چہ قیامتے کہ نمی رسی ز کنارِ ما بہ کنارِ ما

وصل کے اس طرب آگیں لمحے میں ہی تنہائی کی غم ناک حقیقت منکشف ہوتی ہے اور انسان محبت ہی کے تجربہ میں اپنی بنیادی تنہائی کے تجربہ کا مکمل عرفان حاصل کرتا ہے کیونکہ اس تنہائی کے اندوہ کیں احساس اور "آنسوؤں کی اس وادی" میں جسے دنیا کہتے ہیں اپنے وجود کی کم مائیگی کو دور کرنے کے لئے اس نے محبت کی آغوش میں پناہ ڈھونڈی تھی۔ بڑے سے بڑے معنی آفریں اجتماع میں

جلاوطنی کا احساس ایک حساس ذہن کا تعاقب کرتا رہتا ہے اور اس جلاوطنی کے احساس پر قابو پانے کے لئے یا اس سے فرار حاصل کرنے کے لئے دو روحیں اور دو جسم ایک دوسرے کی رفاقت تلاش کرتے ہیں لیکن اس تلاش کا انجام فراق کی زبان میں

اک فسوں ساماں نگاہ آشنا کی دیر تھی اس بھری دنیا میں ہم تنہا نظر آنے لگے

محبت تنہائی کے احساس کی معراج بن جاتی ہے۔ ساز محبت جو آغاز میں "نغمۂ جنت" نظر آتا تھا۔ "سوز محبت" میں بدل جاتا ہے اور "سوز محبت" "نار جہنم" میں۔ "غیر" کو اپنانے کی آرزو نے محبت کا روپ دھارا تھا اور اب عشق کے تجربے میں یہ محسوس ہوتا ہے کہ "تھا حسن و عشق کے بھی درمیاں کوئی"۔ اس "غیر" کو سفر حیات سے خارج کرنا آسان نہیں کیونکہ ہر "انا" کے لئے دوسرا وجود "غیر" ہے۔ محبت ایک دوسرے کو فتح کرنے کی ایک کوشش کا نام ہے لیکن کوئی "انا" "مفتوح" بننے کے لئے تیار نہیں ہوتا اور اس لئے محبت کی تقدیر میں ناکامی ہے۔ فراق محبت کی اس "تقدیر" سے واقف ہیں اور اس لئے ان کے غم میں شکست کے احساس کی جھلک دکھائی نہیں دیتی۔ انھیں محبت کی ناکامی موت کی دعا کرنے پر بہت کم اکساتی ہے کیونکہ موت ایک بے معنی رشتہ کو اور بھی بے معنی بنا دیتی ہے۔ موت کی آرزو وہ کرتے ہیں جو آغاز میں محبت کی کامیابی کے منتظر رہتے ہیں اور ناکامی ایک بلائے ناگہانی کے طور پر ان کا سامنا کرتی ہے۔ ایسے میں ان کا غم گریہ و ماتم میں بدل جاتا ہے اور اب وہ بجائے محبوب کے "قضا" کا انتظار کرنے لگتے ہیں فراق اور فانی کے غم میں یہی بنیادی فرق ہے۔ فراق فانی کی طرح معصوم نہیں ہیں اس لئے وہ غمزدہ نہیں ہیں۔ فانی کی شاعری جہاں ایک غمزدہ انسان کی تصویر ہے جسے اچانک غم آ لیا، وہیں فراق کی شاعری ایسے غم کی تصویر ہے جو شاعر کے لئے کوئی انوکھی بات نہیں۔ فانی نے غم کو ایک ناگوار حقیقت کے طور پر قبول کیا اور اس کو گوارا بنانے کی کوشش کی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فانی نے محبت سے بڑی امیدیں باندھ رکھی تھیں اور وہ سب ناکام ہوئیں۔ ان کے غم میں مایوسی ہے اور فراق کے غم میں مایوسی کی جھلک نظر نہیں آتی وہ امید اور مایوسی دونوں سے بلند ہو جاتے ہیں کیونکہ محبت ان کے نزدیک بنیادی طور پر مہمل ہے اور پھر بھی نہ کی جائے،

یہ انسان کے بس کی بات نہیں۔

سوچیں تو عجیب نکتہ ہے حسن و محبت بھی　　　چپ رہیئے تو بے داغ کچھ کہیئے تو مہمل ہے

محبت میں کامیابی اور ناکامی فراق کے لئے بے معنی الفاظ ہیں محبت کی کامیابی یہ ہے کہ زندگی میں کامیابی کا "فسون" پیدا کرے۔

یہ زندگی کے کڑے کوس یاد آتا ہے　　　تری نگاہ کرم کا گھنا گھنا سایہ

یہ محبت کی تہذیب آموزی ہے "آنسوؤں کی اس وادی" میں مسکراہٹوں کے سامان فراہم کرنا خود وہ مسکراہٹیں کتنی ہی عارضی کیوں نہ ہوں محبت کی بڑی فتح ہے۔ یہ موت پر زندگی کی اور یاس پر امید کی فتح ہے۔ فراق محبت کے اس جاں نواز منصب کو بڑی اہمیت دیتے ہیں اس لئے ان کی محبت، کم از کم ان کی شاعری میں بہت کم جسمانی یا مادی سطح پر نظر آتی ہے۔ ان کی محبت کا یہی عنصر انھیں مومن اور حسرت سے ممتاز کرتا ہے وہ مومن سے زیادہ غالب کے قریب نظر آتے ہیں۔ غالب نے ہر رنگ میں بہار کا اثبات کرنے کی کوشش کی اور فراق بھی قریب قریب اس مقام پر پہنچ جاتے ہیں۔

کسی کا کون ہوا یوں تو عمر بھر پھر بھی　　　یہ حسن و عشق تو دھوکا ہی سب مگر پھر بھی

شاید یہ "اثبات فریب" فراق نے ہندی فلسفے سے حاصل کیا ورنہ وہ اس بلندی پر نہ پہنچ سکتے تھے۔ اس "اثبات فریب" کا نتیجہ ہے کہ دنیا انھیں رہنے کے قابل جگہ نظر آتی ہے۔ وہ ایک بے حس رجائیت پسند کی طرح جس کا والٹیر نے کاندید میں مذاق اڑایا ہے، دنیا کو بہترین دنیا نہیں کہتے۔ دنیا اپنی تمام ناتمامی کے باوجود اور زندگی اپنی ناکامی کے باوصف انھیں عزیز ہے کیونکہ یہ ناتمامی اور یہ ناکامی سعی اور جستجو کے لئے مواقع سے کم نہیں۔

رنج و راحت وصل و فرقت ہوش و وحشت کیا نہیں
کون کہتا ہے کہ رہنے کی جگہ دنیا نہیں

زندگی کی جدلیاتی ماہیت ــــــ کا یہی عرفان ہے جو انھیں ہر بار اس کائنات کو اور اس زندگی کو ایک نئے رنگ میں دیکھنے پر اکساتا ہے اور "رہگزر یار" انھیں ہمیشہ نئی نظر آتی ہے

کیونکہ انسانی تمنا ہی تو ہے جو اس "بوڑھی دنیا" کو ہمیشہ جوان دیکھنے کی طرف مائل کرتی ہے۔

ہزار بار زمانہ ادھر سے گزرا ہے — نئی نئی سی ہے کچھ تیری رہگزر پھر بھی

فراقؔ کا شعورِ غم زندگی کی اس جدلیاتی ماہیت کے عرفان کا آفریدہ ہے اور اس لئے ان کی شاعری خودکشی پر نہیں اکساتی اور نہ موت کو حسین بنا کر پیش کرتی ہے، بلکہ ناکامی کے لمحات کو بھی حسین پیکر عطا کر دیتی ہے۔ زندگی ایک جذبۂ رائیگاں سہی لیکن موت اس کا حل نہیں کیونکہ موت اس کو اور بے مقصد بنا دیتی ہے۔ محبت کی قسمت میں ناکامی سہی لیکن اس محبت کے چند لمحات حیات کو مقصد عطا کرتے ہیں اور انسان سے بے نیاز کائنات انسان کو اپنے آپ سے قریب کر لیتی ہے۔ زندگی کی منزل عشق کی منزل بن جاتی ہے۔ اور عشق مادی و جسمانی سطح سے بلند ہو کر ایک کائناتی حقیقت بن جاتا ہے۔

جو منزلیں ہیں تو بس رہروانِ عشق کی ہیں
وہ سانس اکھڑی ہوئی پاؤں ڈگمگائے ہوئے

وہی ہے رونقِ ہستی وہی ہیں جانِ نشاط
اداس بیٹھے ہیں جو تیری لو لگائے ہوئے

فراقؔ تو ہی مسافر ہے اور تو ہی منزل بھی
کدھر چلا ہے محبت کی چوٹ کھائے ہوئے

ہندوستان عربوں کی نظر میں

پروفیسر عبدالغفور

تیسری صدی ہجری میں آپ ایک عالم کے حجرے کا تصور کیجئے. بصرہ کی بین اقوامی بندرگاہ میں جہاں ہندوستانی بنیا اور سندھی ضیم عرب جہاز رانوں کی بھیڑ میں چلا جا رہا ہے اور ملیا تو مندجاٹ ہندوستان کے اصلی فولاد کی تلوار لگائے کھڑا ہوا خزانے کی حفاظت کر رہا ہے۔

آپ کو دکھائی دے گا کہ کوقلمی کتابوں کے ایک بڑے ڈھیر سے پٹا پڑا ہے، ان کے بیچ میں کتابوں کی اس وسیع دنیا میں کھویا ہوا ایک پستہ قد، نحیف الجثہ، ضعیف آدمی اس تیزی سے کچھ لکھ رہا ہے گویا وہ چند گھنٹوں کا مہمان ہے۔ یہ شخص دنیا جہان سے بے خبر اپنے کام میں اتنے انہماک اور یکسوئی سے لگا ہوا ہے کہ اس کے ارد گرد کتابوں کا جو بڑا انبار لگا ہوا ہے اگر وہ اس کے اوپر گر پڑے تو وہ اس کے اندر دب کر مر جائے اور اس کو مطلق خبر نہ ہو۔ چنانچہ ایک دن ان کتابوں نے اس کو اپنے آغوش میں ہمیشہ کے لئے سلا ہی لیا۔

یہ بڈھا آدمی جاحظ ہے جس کی آنکھیں باہر کو نکلی ہوئی ہیں اور ایک کتاب "کالی اور گوری نسلوں کی بحث" کے نام سے لکھ رہا ہے۔

شعوبیت کی مہیب لہروں نے ساری اسلامی دنیا میں ایک ہلچل سی مچا رکھی ہے، اور شعوبیہ تحریک نے پوری ملت اسلامیہ کو "عرب" اور "غیر عرب" دو مختلف فرقوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ عرب نعرہ لگاتے ہیں کہ ہم اور سب قوموں سے افضل و برتر اور خدا کے محبوب بندے ہیں۔ اور عجمی کہتے ہیں کہ برتری ایک فرد کو دوسرے فرد پر تو ہو سکتی ہے لیکن ایک قوم کو دوسری قوم پر نہیں ہو سکتی، اس کا معیار تو صرف دین داری اور نیکی ہے۔

یہ زبردست مظاہرہ نظم میں بھی ہوتا تھا اور نثر میں بھی، ہر فریق اپنی بیجا تعریف اور حریف کی

بجا مذمت کرتا، یہ مرض اس قدر پھیلا کہ اچھے سے اچھے اور شریف سے شریف لوگوں کو بھی لگ گیا۔

ان حالات میں جاحظ بڑی شان و شوکت سے اپنی بے پناہ علمیت وہمہ گیر اور غیر معمولی شخصیت، دل آویز اور دلکش طرز تحریر کے ساتھ اٹھا اور اس نے غیر عرب قوموں کی تعریف کا ڈنکا بجایا۔

جاحظ ان لوگوں میں سے نہ تھا جو چند پیسوں کی خاطر کسی کی وکالت کرتے ہیں۔ اس نے مناظرہ کی گرما گرمی کے زمانے میں بھی ایک متبحر عالم کی شان کو برقرار رکھا۔ اس نے اس موضوع پر جو کچھ لکھا ہے وہ کالی نسلوں کی صلاحیتوں کا ایک بے لاگ اندازہ ہے اور دونوں قوموں کا تقابلی مطالعہ۔

جاحظ جب کالی قوموں کے مخالفوں کو قائل کرنے کے لئے اور بہت سی دلیلیں ختم کر چکتا ہے تو آخر میں وہ ایک روشن مثال پیش کرکے ان کو خاموش کر دیتا ہے۔ وہ بڑے اعتماد سے پوچھتا ہے کہ "کیا ہندوستانیوں کو بھی جو کالے ہیں تم حقیر سمجھتے ہو؟ وہ ہندوستانی جنہوں نے سب سے پہلے بنی نوع انسان کو علم و معرفت کا سبق پڑھایا، جنہوں نے غور و فکر کے راستے کھولے اور سب سے پہلے سائنس کی تحقیق کی"؟

اس نے ہندوستانیوں اور ان کے کارناموں کو گوری قوموں کے مقابلہ میں بطور سند پیش کیا ہے اور اپنی دلیل میں وزن اور پختگی پیدا کی ہے، اس نے سب سے پہلے تمام اقوام کا ایک گہرا جائزہ لیا ہے، اس کے بعد ہندوستانیوں کی علمی، تہذیبی اور تمدنی خدمات کو بہت خوبی سے ایک جگہ جمع کیا ہے وہ کہتا ہے: "علم نجوم اور ریاضی کو ایجاد کرنے کا شرف ہندوستانیوں کو حاصل ہوا ہے۔ اس کے علاوہ دواؤں کے ایجاد کرنے اور فن طب کے اسرار کا پتہ چلانے میں بھی ساری دنیا سے سبقت لے گئے ہیں، ان کو ایسی دوائیں معلوم ہیں جو بہت خطرناک امراض میں مفید اور تیر بہدف ثابت ہوئی ہیں۔ ان کے یہاں ایک زمانہ سے ایک مخصوص ہندوستانی رسم خط رائج ہے، انھوں نے اپنے مخصوص فنون مثلاً سنگ تراشی، بت گری، اور تعمیرات کو منتہائے کمال تک پہنچا دیا ہے شطرنج جیسے کھیل کے ایجاد کرنے کا سہرہ ہندوستانیوں ہی کے سر ہے۔ اس کے علاوہ ان کو

کو دوسرے وسنشی اور تفریحی کھیلوں کے ایجاد کرنے کا بھی فخر حاصل ہے جن سے ذہن، دماغ، اور جسم کی اچھی تربیت ہوتی ہے وہ عمدہ قسم کی تلوار بناتے اور تیغ زنی کے سب داؤں جانتے ہیں وہ لوگ ایسے منتر بھی جانتے ہیں۔ جن سے زہر اور جسمانی درد اور تکلیف رفع ہو جاتی ہے"

جاحظ نے ہندوستانی موسیقی کی بھی بڑی تعریف کی ہے "ان کی موسیقی بہت دلکش ہے، ان کے یہاں ایک ساز ہوتا ہے جو ایک زخمہ کے ذریعے بجایا جاتا ہے۔ یہ زخمہ اس باجے کے تار پر وہی کام کرتا ہے جو مضراب بربط میں کرتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ لوگ جھانجھ بھی استعمال کرتے ہیں"

"ہندوستانیوں کے یہاں ناچنے اور تال سُر پر حرکت کرنے کے مختلف طریقے رائج ہیں۔ ان کو لونڈیوں کی قیمت لگانے کا بھی بڑا ملکہ ہے، وہ جادو کرنا جانتے ہیں اور بخورات جلانے کے طریقوں سے بھی خوب واقف ہیں۔ ان کے یہاں ایک ایسا عام رسم الخط ہے جو مختلف زبانوں میں استعمال ہو سکتا ہے اس کے علاوہ ملک میں دوسرے بہت سے رسم الخط رائج ہیں۔ ان کا سرمایہ شعر و شاعری بھی بہت وافر اور قیمتی ہے۔ ان کا طرز خطاب مکمل اور مؤثر ہے، وہ علم و ادب اور فلسفہ کے مالک ہیں"

"کلیلہ و دمنہ" جیسی شہرہ آفاق کتاب ہم نے ہندوستانیوں ہی سے حاصل کی۔ ہندوستانی بہت دانشمند اور بہادر لوگ ہیں۔ قدرت نے جو خوبیاں ان کو عطا کی ہیں اور جو عظیم الشان کارنامے انھوں نے کر دکھائے ہیں۔ ان سے چینی محروم ہیں"

"ان کی عادتیں اور سبھاؤ بھی بہت دلکش ہیں:۔

مثال کے طور پر ان کے یہاں مسواک کرنے، دانتوں کی صفائی، بالوں کے سنوارنے اور خضاب کے استعمال کرنے کے بہت خوشنما طریقے رائج ہیں، ان میں حسن و زیبائی و نرمی، سلامت روی اعتدال پسندی اور خوشبو ہوتی ہے، ان کی عورتیں ساری دنیا میں نمونے کی عورتیں سمجھی جاتی ہیں"

"عود جو بادشاہوں کے لئے ایک موزوں تحفہ ہے ہندوستان ہی سے آتا ہے۔ غور و فکر اور گیان دھیان کے طریقے سب سے پہلے انہیں لوگوں نے ایجاد کئے۔ ایسے تمام منتر اور جادو جن کے عمل سے زہر کا اثر ختم ہو جاتا ہے۔ ہندوستان ہی سے سارے عالم میں پھیلے، علم ہیئت کا سب سے پہلے ہندوستانیوں ہی

نے اکتشاف کیا اور پھر پوری دنیا کو سکھایا۔"

سعید قرطبہ کا رہنے والا تھا اور اس نے اقوام عالم کی تہذیب و تمدن پر ایک کتاب لکھی تھی۔ اس میں اس نے دنیا کی تہذیب و تمدن بنانے اور اس کے سنوارنے میں ہندوستانیوں کا جو حصہ ہے اس کی بڑی تعریف کی ہے۔ اور ان کے کارناموں کو بہت سراہا ہے۔

اسپین کے اس عالم نے دنیا کی سب مختلف قوموں کو دو قسموں میں تقسیم کیا ہے۔ ایک وہ قومیں جنھوں نے علم و معرفت اور فنون کی تلاش و جستجو میں اپنے آپ کو وقف کر دیا۔ اور دوسری وہ جن کا علوم و فنون غور و فکر کی فلسفہ کی تحقیق و کاوش میں کوئی نمایاں حصہ نہیں۔ چنانچہ اس نے ہندوستان کو مذکورہ قسموں میں سے پہلی قسم میں شمار کیا ہے، اور علم و فن کی تحقیق اور کھوج لگانے میں دنیا کی سب قوموں سے افضل و برتر مانا ہے۔

سعید کے خیال میں ہندوستانیوں کی ذہنی برتری اور دماغی تفوق، علوم و فنون کی گراں بہا خدمات کے انجام دینے اور دنیائے علم و معرفت اور گیان دھیان میں بیش بہا کارنامے پیش کرنے میں ملک کی مخصوص جغرافیائی حالت کا بہت دخل ہے۔ ہندوستان کی جائے وقوع ایسی سرزمین پر ہے جہاں نہ بہت سخت گرمی ہوتی ہے۔ نہ بہت سخت سردی۔ جن ممالک میں سردی بہت سخت ہوتی ہے وہاں کے باشندوں کے ذہنی قوی سرد، جسم موٹے اور بھدے، دماغ کند اور نازک خیالی اور دقیقہ سنجی ناپید ہوتی ہے۔ اسی طرح گرم ممالک میں بسنے والی قوموں میں غصہ، شعلہ مزاجی اور طبیعت میں جھگڑالوپن ہوتا ہے۔

لیکن ہندوستانیوں کا شمار خدا کی ان محبوب اور منتخب قوموں میں ہے جنھوں نے اپنے آپ کو علم و وجدان، فلسفہ و سائنس کی تحقیق و تفتیش اور اس کو ترقی دینے میں وقف کر دیا۔

چینیوں کو صنعت و حرفت اور آرٹ میں امتیاز حاصل ہے، اسی طرح ترک بہادری اور شجاعت میں مشہور ہیں۔ لیکن یہ سب گھٹیا قسم کے کام اور کم درجہ کے ہنر ہیں۔ اس قسم کے کام تو جانور بھی انسانوں سے اچھے کر لیتے ہیں۔ چنانچہ اس کی روشن مثال مکڑی کا جالا اور

پیٹے کا گھونسلا ہے جس کا مقابلہ چینی دستکاری نہیں کر سکتی، اسی طرح شیر کی بہادری اور اس کی طاقت سے نرکوں کی چال بازی اور بہادری کا کوئی مقابلہ نہیں ہے۔ لیکن اس قوم کا حریف اور مدمقابل کون ہوسکتا ہے جس نے سب سے اعلیٰ اور برتر علوم یعنی سائنس وحکمت کی بنیاد رکھی اور ساری دنیا میں اس کو پھیلایا۔

پچھلے لوگوں کو اعتراف ہے کہ ہندوستان عقل ودانش، اعتدال پسندی اور حق وصداقت کا سرچشمہ ہے، اور یہاں کے باشندے ثابت قدم، مستقل مزاج، عقلمند اور صائب الرائے ہوتے ہیں۔ اور اپنے عظیم الشان کارناموں کی وجہ سے دنیا کی سب قوموں میں مشہور ہیں۔

گو رنگت کے اعتبار سے یہ لوگ کالے ہوتے ہیں۔ لیکن خدا نے ان کو کالی قوموں کے عیبوں سے پاک رکھا ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ دوسری گوری اور کالی قوموں کے مقابلہ میں ان کو بلندی اور برتری عطا کی ہے۔

اس مصنف کے خیال میں جغرافیائی حالت اور ستاروں کی گردش ہندوستانیوں کے لئے کچھ ایسی سازگار رہی ہے کہ ان میں بہت سی عجیب اور عظیم الشان صلاحیتیں پیدا ہوگئیں ہیں۔ اس کے نزدیک ہندوستانیوں کی طبیعت پر زحل اور عطارد کا اثر پڑا ہے۔ چنانچہ سیارہ زحل نے ان کے ذہن میں ذکاوت وتیزی، علم ومعرفت میں گہرائی، اور دماغی صلاحیتوں میں پاکیزگی وشائستگی پیدا کی ہے۔ اور عطارد نے ان کو وضاحت فکر عطا کی ہے۔

اس کے علاوہ ان مصنفوں نے بھی جن کا میلان عربوں کی برتری اور فوقیت ثابت کرنے کی طرف رہا ہے، ہندوستانیوں کی تہذیب وتمدن کو بڑی قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ مسعودی نے حبشیوں کی دس خصوصیات کا ذکر کرتے ہوئے حبشیوں کی خوب خبر لی ہے۔ اور اپنی تائید میں مشہور حکیم یعقوب بن اسحاق کندی کا خیال پیش کیا ہے کہ کس طرح گردوپیش کے ماحول اور آسمانی سیاروں کے بُرے اثرات حبشیوں پر پڑے ہیں، اسی سلسلے میں اس نے ایک مشہور عالم کا حوالہ دیا ہے کہ حبشی کے ہاتھ کے ذبح کئے ہوئے جانور کے گوشت کو بالکل نہیں چھوتے تھے۔ اسی طرح اسلام کے مشہور خلیفہ الراضی باللہ کی عادت لکھی ہے کہ وہ ایسے دسترخوان

کی کسی چیز کو ہاتھ نہ لگاتا تھا جس کو کسی سیاہ رنگ کے غلام نے لگایا ہوا۔

کالی قوموں کے خلاف اس نفرت اور حقارت کے اظہار کے باوجود مسعودی یہ کہتا ہے کہ اس گھٹاٹوپ اندھیرے میں روشنی کی ایک کرن چمکتی دکھائی دیتی ہے اور وہ ہندوستان کی تہذیب و تمدن ہے۔

اس کے الفاظ ہیں کہ "کالی نسل کے لوگوں میں ہندوستانی فہم وفراست، صنعت وحرفت ضابطہ وقانون۔ فلسفہ وحکمت اور سلامت طبع کے اعتبار سے بالکل مختلف اور سب سے ممتاز ہیں"

ہند کی برتری کا اعتراف صرف گوری قوموں کے مقابلہ میں ہی نہیں بلکہ ان کے علاوہ اور سب قوموں کے مقابلہ میں بھی کیا گیا ہے۔

ہند اور چین دونوں ایک عرصہ سے قدامت کے طلسمی کہر میں لپٹے رہے ہیں، اور دونوں بندرگاہیں جہاں تجارت کا بازار گرم تھا، عرب سوداگروں اور سیاحوں کو اپنی طرف کھینچتی رہی ہیں، یہ سیاح اور تاجر چین کے آباد شہروں کو اور ان کی صناعی اور ہنرمندی کو حیرت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ لیکن ہندوستان کے علوم وفنون نے ان کو زیادہ متحیر کیا۔

مذکورہ بالا دونوں ملک مشرق میں عرب تاجروں کے تجارتی مرکز تھے۔ اس لئے عرب سیاحوں کو دونوں قوموں کے تقابلی مطالعہ کا خوب موقع ملا۔

"ہندوستان کو اس کا فخر اور امتیاز حاصل ہے کہ سب سے پہلے اس علم وحکمت کا انکشاف کیا، عرب سیاحوں نے چینیوں کے حوالے سے یہ بات بیان کی ہے کہ ان کا مذہب اور سائنس ہندوستانیوں سے ماخوذ ہے"

"چینیوں کے یہاں علوم طبیعی کا وجود نہیں ہے، ان کا مذہب اور ان کے اکثر قوانین ہندوستانیوں سے لئے گئے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ مورتی پوجا انھیں ہندوستانیوں نے سکھائی۔ اور ہندوستانی قوم بڑی مذہبی قوم ہے"

عرب سیاحوں کے خیال میں ہندوستانی علم طب اور علم ہیئت میں بہت ترقی یافتہ تھے۔

اور ان کے مقابلہ میں چینیوں کا علم ناکمل اور ابتدائی حالت میں تھا۔

علم طب اور فلسفہ کا ہندوستانیوں میں بہت رواج تھا۔ چینیوں کو تھوڑا بہت خارجی علاج کا اثر معلوم تھا لیکن وہ صرف گرم لوہے سے داغنے تک محدود تھا، علم ہیئت سے بھی وہ تھوڑے بہت واقف تھے لیکن اس فن میں ہندوستانی ان سے بہت آگے تھے۔

"ہندوستانی جسمانی صفائی اور حفظان صحت کے اصولوں کی پابندی میں بہت مشہور اور اپنی اس خصوصیت کی وجہ سے سب قوموں میں ممتاز تھے۔ ہندوستانی کھانے سے پہلے صرف ہاتھ منہ دھونے پر بس نہیں کرتے بلکہ پورے جسم کا غسل کیا کرتے ہیں۔ وہ چینیوں کی طرح صرف کاغذ سے پونچھ لینا کافی نہیں سمجھتے ہیں۔

بزرگ بن شہریار کو یہ بات سن کر بہت تعجب ہوا کہ ہندوستانی صفائی کے معاملہ میں اتنے محتاط ہوتے ہیں کہ تالاب میں نہاتے وقت صرف اس وجہ سے اس کے اندر کلی نہیں کرتے کہ تالاب کا پانی کلی سے ناپاک ہو جائے گا۔

دوسری قومیں ہندوستان کو ہمیشہ سے نوادر اور قیمتی اشیاء کا خزانہ، عجوبۂ روزگار اور پراسرار ملک سمجھتی رہی ہیں۔ بزرگ بن شہریار جس نے اس ملک کے حالات لکھے ہیں، اپنی کتاب کو اس طرح شروع کرتا ہے۔

"خدا نے روئے زمین پر دس عجائبات پیدا کئے ہیں، جن میں سے نو مشرق کے حصے میں آئے ہیں، اور ایک بقیہ دنیا کے حصے میں۔ مشرق کو جو عجائبات ملے ہیں ان میں سے آٹھ صرف ہند اور چین کے حصے میں آگئے۔

بزرگ بن شہریار کے استعجاب میں انسانیت کے ساتھ ایک تاجر کی وسیع اور گہری دلچسپی بھی تھی۔ لیکن ان مغربی سرمایہ داروں کی دلچسپی نہیں جو روپیہ پیسہ کی پوجا کرتے ہیں اور جن کی فطرت میں افادیت اس قدر رچی بسی ہوئی ہے کہ اگر وہ میلو کے وینس کے مجسمہ کو بھی دیکھیں تو یہ سوچیں گے۔ آیا اس کے بازو میں اتنی طاقت ہے کہ اس سے موسل کا کام لیا جا سکے۔

اسلام کے روائتی لٹریچر میں ہندوستانیوں نے اتنی اہم حیثیت حاصل کر لی تھی کہ اس کے

متعلق اس قسم کے عجیب و غریب خیالات بعد میں بھی خاصے نمایاں رہے، اور اس کی وجہ یہ تھی کہ خود آں حضرت صلعم نے اپنے اقوال میں ہند کا بار بار ذکر کیا ہے ان کے بعد ان کے خلفاء نے بھی اسے یاد رکھا، اور جو لوگ ان کے جانشین ہوئے وہ بھی اس بھولے ہوئے گلنے کے ٹیپ کے بند کو مزے لے لے کر الایا کرتے تھے۔

عرب حقیقت پسند تھے انھوں نے ہندوستان کے متعلق جو عجیب و غریب خیالات قائم کئے تھے وہ محض واہمہ پر مبنی نہ تھے بلکہ انھوں نے ان کو اپنی آنکھوں سے دیکھا اور خود پرکھا تھا ہندوستان کی یہ خصوصیت تھی کہ یہاں جس خیال اور مقصد کے لوگ مثلاً تاجر، سائنس داں، جغرافیہ داں، اور مذہبی طلبا آئے ان سب کو اپنے مفید مطلب اور اپنے موضوع سے متعلق مختلف قسم کے مواد مل جاتے اور وہ اپنا اطمینان کر لیتے، چنانچہ جغرافیہ دانوں اور ابن حوکل جیسے نقشہ نویسوں کے لئے ہندوستان کی ارضی ساخت، اس کے دربار، اور یہاں کے پہاڑوں کی بناوٹ کا مطالعہ خاصا دلچسپ اور معلومات افزا تھا۔ اور بغداد کے مسعودی جیسے فلسفی اور مورخ کے لئے جو علم کی تلاش میں نہائی صدی تک سفر کرتا رہا، ہندوستان فلسفہ و حکمت اور غور و فکر کا سرچشمہ، اور انسانی تہذیب و تمدن اور کلچر کے دائمی اصولوں کا گہوارہ تھا۔ (ترجمہ)

غزل

جناب غلام ربانی تاباںؔ

تمام عمر کٹی ایک بے نوا کی طرح
چمن میں خاک اڑاتے پھرے صبا کی طرح

چراغ حسرتِ پابوس کا جلائے ہوئے
تمھاری راہ میں ہم بھی ہیں نقشِ پا کی طرح

دلوں کا درد کبھی لب پہ آ ہی جاتا ہے
کسی پکار کی صورت کسی صدا کی طرح

نشانِ راہ نہ پایا تو دشتِ غربت میں
ہم اپنی راہ بناتے چلے ہوا کی طرح

غمِ شکست نے ہر ہر قدم پہ ساتھ دیا
کسی رفیق کسی درد آشنا کی طرح

الٰہی غم کی ہوائیں کسی کے دامن تک
پہنچ نہ پائیں مرے دستِ نارسا کی طرح

خوشی کا نام تو اکثر سُنا کئے تاباںؔ
مگر وجود نہ پایا کہیں ہُما کی طرح

قدیم اُردو صحافت کا جائزہ

مرتبہ : عابد رضا بیدار

(۱)

ظفر علی خاں کے دکن ریویو کے جنوری ۔ فروری ۱۹۰۷ء کے شمارے میں فرضی نام سے میر محفوظ علی کا ایک مضمون نکلا تھا، "اردو ماہواری رسائل پر ایک نظر"۔ خاصا طویل مضمون ہے اور رسالے کے اکتیس صفحوں میں آیا ہے ۔ ۱۹۰۷ء سے پہلے کے جاری ہونے والے رسالوں پر ایک اہم دستاویز ہے (یہ مضمون پاکستان کی انجمن ترقی اردو کی شائع کردہ "مضامین محفوظ علی" میں بھی شامل ہے) مضمون نگار نے رسالوں کو موضوعات کے لحاظ سے تقسیم کر دیا ہے ۔ چند رسالوں کا تذکرہ کیا ہے، ان کے نام اور ان کے بارے میں ضروری معلومات اس طرح ہیں :

رسالے جن کا موضوع **مذہب یا مذہبی مناظرہ ہے :**

(۱) ضیاء الاسلام ، ایڈیٹر محمد فضل حسین بسمل، مراد آباد ۔

" اس پرچے کے مقاصد، اسلام کی برکات اور خوبیوں کا اظہار، دیگر مذاہب پر اس کی فضیلت ثابت کرنا، سائنس اور فلسفے کے حملوں سے اسلام کو بچانا، اور الزامات کے گرد و غبار کو اسلام کے منور چہرے سے بدلائل عقلی و نقلی نہایت متانت سے دور کرنا۔ مشاہیر اسلام کی سوانح عمریاں اور نتیجہ خیز قصص، علمی، تاریخی، تمدنی، معاشرتی اور صنعت و حرفت کے متعلق نتیجہ خیز مضامین، اسلامی معلومات و خبریں وغیرہ و مذہبی نوٹس "

(۲) انوار الاسلام ، سیالکوٹ ، مہینے میں دو بار ۔

" اس نے اپنا مقصد مخالفین اسلام کے اعتراض کا رد قرار دیا ہے "

(۳) تجلی لاہور : پنجاب رلیجیس بک سوسائٹی کے رسالہ ترقی کا مذہبی حصہ ہے؟

پالٹکس :

(۴) بھارت ماتا، لاہور۔ (پہلا نمبر : جنوری ۱۹۰۷ء)

سوشل اصلاح

(۵) ٹمپرنس گائیڈ، امرت سر

مختلف قوموں اور جماعتوں کے پرچے

(۶) قریشی میگزین، امرت سر (نمبر ۶ جنوری ۱۹۰۷ء)

(۷) کشمیری میگزین، لاہور، ایڈیٹر محمد الدین فوق

(۸) کشمیر درپن، الہ آباد۔ ایڈیٹر پنڈت تیج بہادر سپرو۔

(۹) دلیش ہتکاری، میرٹھ۔

(۱۰) ہمدرد قوم، میرٹھ۔

(۱۱) اصلاح، کھجوہ (ضلع سہارن پور)

(۱۲) شیعہ، بازار بنڈی (ضلع سہارن)

علم و حکمت

(۱۳) الندوہ، لکھنؤ (۱۴) المشرق، ڈھاکہ (۱۵) الکمال، جے پور (۱۶) الرفیق، رنگون (۱۷) الاخلاق، آگرہ (۱۸) ترقی، لاہور (پنجاب رلیجیس بک سوسائٹی، ۵ سال سے جاری) (۱۹) خاتون، علی گڑھ (۲۰) آفتاب، جالندھر (۲۱) نشتر، لاہور (۲۲) ید بیضا، سکندر آباد (ضلع بلند شہر) (۲۳) دبدبۂ آصفی، حیدرآباد (۲۴) صحیفہ، حیدرآباد (۲۵) سائنس و تعلیم، لاہور (۲۶) رہنمائے تعلیم، لاہور (۲۷) منروا، امرت سر۔ ایڈیٹر غلام قادر فرخ، (۲۸) دلچسپ، امرت سر (۲۹) حکمت، لاہور (ابھی حال ہی میں نکلا ہے) (۳۰) دارالشفا، الہ آباد (عرصے سے نکل رہا ہے)

(۲)

دکن ریویو ہی کے ۱۹۰۸ء کے فروری۔ مارچ نمبر میں اس عرصے میں جن مزید ماہناموں کا اضافہ ہوا تھا ان کا ریویو نکلا یعنی یہ پرچے ۱۹۰۷ء یا ۱۹۰۸ء کے آغاز میں نکلے :۔

(۱) شمس بنگالہ، کلکتہ۔ ایڈیٹر بدر الزماں (۲) زبان، دہلی۔ ایڈیٹر مائل دہلوی (پہلا نمبر جنوری ۱۹۰۸ء تصویر حسن نظامی۔ (۳) مرقع قادیانی، امرت سر۔ ایڈیٹر ثناء اللہ امرت سری۔ (۴) الشیا۔ ایڈیٹر حکیم فیروز الدین امرتسری (پانچ نمبر نکل چکے ہیں) (۵) المجدد، لاہور۔ ایڈیٹر تاج الدین احمد مجددی نقشبندی (پہلا نمبر جنوری ۱۹۰۸ء) (۶) آزاد، لاہور۔ ایڈیٹر شبن سہلوئے آزاد۔

(۳)

'زاویہ نشین'، کے قلم سے زمانہ اکتوبر، نومبر ۱۹۰۷ء کے شمارے میں ایک طویل مضمون کے متعلقہ اقتباسات :۔

"....یورپ اور امریکہ میں بہت سے اخبار ہیں جن کی روزانہ اشاعت بیس بیس لاکھ ہے ہندوستان میں کسی ایک روزانہ اخبار کی اشاعت بیس ہزار نہیں ہے۔ اردو کی نسبت بیان کیا جاتا ہے کہ وہ ہندوستان کے بیشتر حصہ میں بولی جاتی ہے۔ لیکن اردو اخبارات میں روزانہ اخبارات تو درکنار ہفتہ وار اخباروں میں بھی "ہندوستان" لاہور کے سوا کوئی اخبار پندرہ ہزار سے زیادہ اشاعت کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ سوال ہو سکتا ہے کہ اردو اخبار کی اس پست حالت کا ذمہ دار کون ہے؟ ...... اس کا سبب اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ اردو داں سوسائٹی نے ابھی اتنی ترقی ہی نہیں کی کہ اس کو اخبارات کی ضرورت محسوس ہو اور اہل دماغ اس فن کی طرف اپنا خیال مائل کریں۔"

فن اخبار نویسی کا تکملہ صرف ایک باقاعدہ تعلیم اور تربیت سے ممکن ہے لیکن ہندوستان میں اخبار نویسی گداگری کا ایک آلہ ہے جس سے لوگ صرف اپنا پیٹ پالنا چاہتے ہیں.... اردو اخبارات کی موجودہ پست حالت کے ذمہ دار وہ انگریزی داں حضرات بھی ہیں جو اردو زبان

کو کچھ سمجھتے ہیں اور جن کا خیال ہے کہ اردو زبان کی کتابیں یا اخبار پڑھنا انگریزی نہ جاننے کی دلیل ہے۔

بنگال میں اس وقت صدہا انگریزی اور بنگلہ زبان کے اخبار نکلتے ہیں لیکن جو اثر اور اشاعت بنگلہ زبان کے اخباروں کی ہے وہ انگریزی زبان کے اخباروں کی نہیں ہے۔ بنگال میں ہائی کورٹ کے جج اور کونسل کے ممبر بھی دو بنگلہ اخبار ضرور خریدتے اور پڑھتے ہیں۔ یہاں اکثر انگریزی خواں حضرات کو جن کی دوسری زبان اردو ہے اردو سے ایک طرح کی چڑھ ہے اور اس کا مطالعہ کفر سمجھتے ہیں جب وہ اردو اخبارات کے مطالعہ میں اپنی کسر شان سمجھتے ہیں تو ان کو اس میں مضمون لکھنے کی کیونکر ترغیب ہو سکتی ہے۔ جب قوم کے وہ افراد جن کی دماغی قابلیت سے قوم کو فائدہ پہنچ سکتا ہے اردو زبان سے اس درجہ متنفر ہوں تو ان چند اردو اخبارات کے ایڈیٹر بھی تن تنہا کیا کر سکتے ہیں۔ جو ملک سے اخبار بینی کی بد مذاقی دور کرنے کے لئے جد و جہد کر رہے ہیں.... لیکن اس موقع پر شکر گزاری کے ساتھ یہ امر بھی بیان کرنے کے قابل ہے کہ لاہور کے مخزن، کان پور کے زمانہ علی گڑھ کے اردوئے معلیٰ اور چند دوسرے ماہوار رسالوں نے اردو کی جانب انگریزی تعلیم یافتوں کی توجہ اور عملی ہمدردی حاصل کرنے میں بہت کچھ کامیابی حاصل کی ہے....

اردو اخبارات کی پست حالت کا سبب وہ ذلیل رقابت بھی ہے جو ان میں شدت سے پائی جاتی ہے۔ اس کا ایک ثبوت اخبار انڈیا کے مقدمہ سے مل سکتا ہے جس کے سلسلہ میں ہندوستان لاہور کا ایڈیٹر اس لئے پھنس گیا کہ بعض ناکام رقیبوں نے محض اس کی ترقی روکنے کے لئے صحیح یا غلط طور سے مخبری کی کہ اخبار انڈیا کا وہ پرچہ جس میں باغیانہ مضامین چھپے تھے ہندوستان پریس میں طبع ہوا تھا.....

ہندوستان میں اردو زبان کے روزانہ اخبار اودھ اخبار، اخبار عام اور پیسہ اخبار ہیں ان میں اودھ اخبار سب سے پرانا ہے۔ سابق کی بہ نسبت اس کی پالیسی نہایت آزاد ہے لیکن اب بھی اس میں اینگلو انڈین اخبارات کے تراجم پر زیادہ زور دیا جاتا ہے، مگر اس کے ساتھ ہی تصویر کا دوسرا پہلو دکھانے کے لئے دیسی زبان کے اخبارات کی رائیں بھی ترجمہ ہو کر شائع کی جاتی ہیں۔ اردو

روزانہ اخباروں میں شاید اودھ اخبار ہی ایک ایسا اخبار ہے جو فی الاصل اخبار کے نام سے موسوم کیا جا سکتا ہے۔ اس لئے کہ اخبار کا جو مقصد ہے وہ اس سے ایک حد تک حاصل ہوتا ہے۔ اس میں اس امر کا انتظام ہے کہ نہ صرف ہندوستان کے واقعات بالالتزام شائع کئے جاتے ہیں بلکہ ممالک غیر کے حالات و واقعات بھی بہت شرح و بسط کے ساتھ درج کئے جاتے ہیں۔ جو اور اردو اخبارات میں نہیں ہوتے ہیں...... اودھ اخبار میں ہندوستان کی کونسلوں کی تقریروں کا پورا پورا ترجمہ شائع کیا جاتا ہے۔ اور اخبارات میں یہ انتظام نہیں ہے..... عموماً اودھ اخبار کے اڈیٹوریل مضامین حتیٰ کہ تراجم بھی اس قدر صاف اور سلجھے ہوئے ہوتے ہیں کہ ان کے سمجھنے میں کوئی دقت نہیں معلوم ہوتی ..... کیا بلحاظ مضامین اور کیا بلحاظ حجم اودھ اخبار اردو زبان کے اور اخباروں میں سربرآوردہ ہے۔

اودھ اخبار میں ایک خاص خوبی جس کا اور اخبار ابھی تک انتظام نہیں کرسکے" یہ ہے کہ اس میں ان بیش قیمت مضامین کے ترجمے بھی چھپتے رہتے ہیں جو ہندوستان کے ماہوار انگریزی رسائل میں نامی اہل ہند کے قلم سے شائع ہوتے ہیں۔ اس سلسلے نے اُردو انشاء پردازوں کی تحریروں میں ایک نئی رُوح پھونک دی ہے .....

اخبار عام لاہور سے نکلتا ہے، علاوہ اس کے کہ اس کا حجم بہت چھوٹا ہے، زبان بھی شستہ نہیں ہے لیکن حجم و زبان کو قطع نظر کرکے مضامین پر غور کیا جائے تو ان میں سے اکثر بنگالی اخباروں کے چربے اور نقلیں ہوتی ہیں ...... اب تک اس کی پالیسی کسی قدر آزاد تھی لیکن جب سے گورنمنٹ نے اخباروں کے ساتھ سخت گیرانہ پالیسی برتنی شروع کی ہے، اخبار عام بھی اینگلو انڈین اخباروں سے اپنا سُر ملانے لگا ہے ......

تیسرا روزانہ اخبار پیسہ اخبار ہے۔ اس کو جاری ہوئے صرف چند سال ہوئے اس کا غرور اتنا بڑھا ہوا ہے کہ وہ اپنے ناظرین کو ہمہ دانی سکھلانے کا دعویٰ کرتا ہے.....

اخبار عام جس طرح زیادہ تر بنگالی اخبارات کا تتبع کرتا ہے اسی طرح پیسہ اخبار، اینگلو انڈین اخبارات سے الہام حاصل کرتا ہے۔ اس کی پالیسی کا سمجھنا دشوار امر ہے۔ کبھی وہ سدیشی کی

طرفداری کرتاہے، کبھی اس کے خلاف لکھا رتا ہے۔ ایک جگہ وہ محترم بزرگ، دادا بھائی نوروجی کا مداح ہے، دوسری جگہ لکھتا ہے کہ کانگریسی مسلمانوں کے دشمن ہیں، طرہ یہ کہ خود ایڈیٹر پیسہ اخبار کانگریسی بیان کئے جاتے ہیں ....

پیسہ اخبار کے مضامین برائے زنی بیکار ہے۔ مجھے ان میں کوئی جدت نہیں معلوم ہوئی۔ اس اخبار کا ایک بڑا حصہ مذہبی مباحثوں کے لئے وقف ہے لیکن پیسہ اخبار کا مذاق سلیم ظاہر کرنے کے لئے وہ شعر کافی ہے جو اس نے اپنی کسی پیشین گوئی راست آتے پر لکھا تھا اور وہ یہ تھا:

نصیحت گوش کن جاناں کہ ز جاں دوست تر دارند

جوانان سعادت مند پند پیر دا را

پیسہ اخبار کی خصوصیات میں ایک روزانہ کارٹون ہے جو وہ عموماً ہندی پنچ یا ولائتی تصویردار رسالوں سے لیتا ہے۔ یہ انتظام اور اخباروں میں نہیں ہے ..... وہ باموقع تصویریں اور اہل تصویر کے حالات پہلے سے جمع رکھتا ہے ..... پیسہ اخبار میں علاوہ ایڈیٹوریل کے ایک عنوان ہے مضمون خاص، سمجھ میں نہیں آیا کہ ایڈیٹوریل میں اور مضمون خاص میں کیا فرق ہے لیکن اس عنوان کے ذیل میں جو مضامین شائع ہوتے ہیں۔ ان میں مراسلات حتیٰ کہ منقولات بھی پائے جاتے ہیں۔ یہ بھی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ مضمون خاص کے ذیل میں بہت سے مضامین کیوں چھاپتا ہے۔

ہفتہ وار اخباروں میں کئی قسم کے اخبار ہیں مگر زیادہ تر وہ ہیں جن میں پالٹکس تمدن مذہب اور سب چیزیں ملی جلی ہیں۔ لیکن بعض اخبار اپنے آپ کو قومی اخباروں کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ اگرچہ لفظ قومی کا اطلاق نہایت وسیع ہے مگر اس قسم کے اخباروں میں حد درجہ کا تعصب پایا جاتا ہے۔ ان کا زیادہ تر مقصد یہ ہوتا ہے کہ ہندو مسلمانوں میں نفاق ہو اور ان کے خریدار جوش مذہب میں آکر ان کی جیب بھریں .....

اگرچہ آریہ اخبار نے اپنے صفحات مسلمانوں کے متبرک صحائف کی تردید کے لئے وقف کردیئے ہیں لیکن شاذ و نادر کوئی اخبار کسی پولیٹکل بنا پر اپنے حریف کو زک پہنچانے کی کوشش کرنا پسند

کرتا ہے ..... بعض اخبارات ہندوستان کے لئے آزادی کے خواہاں نہیں ہیں لیکن مصر میں قومیت پھیلانے کے خیال کے طرفدار ہیں۔ انھیں مصطفےٰ کامل پاشا کے خیالات سے ہمدردی ہے لیکن وہ مسٹر گوکھلے کو ناپسند کرتے ہیں جو ہندوستانیوں کے لئے آزادی چاہتے ہیں۔ اس طرح حال میں شیعہ اور سنیوں کے بعض فریقی اخبار شائع ہونے لگے ہیں۔ جن کا مقصود یہ ہے کہ ایک دوسرے کو برا بھلا کہہ کر اپنے اپنے خریداروں کا حلقہ وسیع کریں۔

یہ سب باتیں اخبارات کی پستی اور اردو جاننے والوں کی بدمذاقی کی علامتیں ہیں۔ ہفتہ وار اخباروں میں چند اخبار قابل ذکر ہیں۔ سب سے پہلے ہندوستانی نے ایک قلیل قیمت میں مفید پولیٹیکل آگاہی کا ایک معقول ذخیرہ بہم پہنچانے کا بندوبست کیا۔ ہندوستانی میں زیادہ تر ایڈووکیٹ کے ترجمے ہوتے ہیں لیکن دونوں کا ایڈیٹر ایک ہے۔ ہندوستان بنگالی اخباروں کے ڈھنگ پر چلتا ہے مگر اس کی ایک خاص پالیسی ہے جس کو وہ بہت خوبی سے نباہتا ہے ہندوستان، لاہور کی اشاعت سے اس کا ہر دلعزیز ہونا ثابت ہوتا ہے..."

زاویہ نشین

زمانہ اکتوبر و نومبر ۱۹۰۷ء

یہ دو مضمون ہیں پہلے کے مصنف تیرتھ رام ہیں، مشہور ناول نگار تیرتھ رام فیروز پوری اور دوسرے پر اڈیٹر، آدیب کا نام درج ہے۔ اتفاق سے جس پرچہ میں یہ مضمون چھپا اسی سے اڈیٹر حسیر عظیم آبادی کا نام آنے لگا۔ لیکن چونکہ پیارے لال شاکر جو اس سے پہلے اسے ترتیب دیتے رہے تھے اس کے مالک بھی تھے اس لئے قیاس ہے کہ یہ مضمون بھی شاکر ہی کا ہوگا۔

(۴)

" .... پہلا روزانہ انگریزی اخبار جو ہندوستان میں شائع ہوا وہ "ہرکرہ" (ہرکارہ) تھا جو ۲۷ اپریل ۱۸۰۹ء کو..... چھپنا شروع ہوا اور جس کا مقام اشاعت کلکتہ تھا یکم جنوری ۱۸۳۴ء کے بعد اسے انڈین ڈیلی نیوز میں ملا دیا گیا.....یکم اکتوبر ۱۸۳۴ء کو اس میں انڈیا گزٹ اور بنگال کوریر کو (بھی) ملا دیا گیا.....

ذیل کی فہرست سے ان اخبارات کی تعداد معلوم ہوسکتی ہے جو ۱۸۷۵ء میں ہندوستان کے مختلف حصوں سے شائع ہوتے تھے۔

نام صوبجات	انگریزی اخبارات کی تعداد	ورنیکلر اخبارات کی تعداد	انگریزی اور ورنیکلر (دونوں زبانوں میں)
بمبئی	۳۵	۶۲	۲۱
مدراس	۳۶	۲۳	۲۵
بنگال	۳۵	۵۹	۵
صوبہ مغربی و شمالی	۹	۵۹	۵
پنجاب	۱۰	۳۰	۱
اودھ	۴	۷	۸
صوبجات متوسط	۳	۴	۲
برہما	۱۴	۵	۰
سندھ	۹	۳	۱
راجپوتانہ	۰	۲	۴
میزان	۱۵۵	۲۵۴	۷۲

ہندوستان میں آج کل اخبارات کی جو حالت ہے وہ اخبار سرمۂ روزگار بابتہ ۲۴ فروری ۱۹۱۰ء کے اقتباس ذیل سے معلوم ہوسکتی ہے:

"تمام ہندوستان میں ۲۵۷۱، چھاپہ خانے ہیں جنمیں ہر قسم کی کتابیں چھپتی ہیں۔ گزشتہ دس سال کے اندر ۲۵ فیصدی کا اضافہ ہوا ہے۔ اخباروں کی تعداد ۷۳۵ ہے ان میں بھی تقریباً دس فیصدی اضافہ ہوا ہے۔ ۱۰۶۲ رسالے شائع ہوتے ہیں.... بمبئی میں سب سے زیادہ اخبار اور رسالے شائع ہوتے ہیں اور اس لحاظ سے بمبئی کے بعد دوسرا نمبر

پنجاب کا ہے۔"

یہ اعداد اخبار مذکور نے غالباً کسی معتبر انگریزی رپورٹ سے حاصل کئے ہوں گے اور اگر ایسا ہے تو یقیناً ان کی صحت میں کلام نہیں ہو سکتا۔ اس میں شک نہیں کہ انگریزی اخبارات اور رسالوں نے کیا بلحاظ عمدگی مضامین اور کیا بلحاظ تعداد اشاعت بہت ترقی کر لی ہے۔ لیکن اگر ورنیکلر اخبارات بھی کوشش کریں تو اپنی حالت میں بہت کچھ اصلاح کر سکتے ہیں۔

یہ امر قابل افسوس ہے کہ سارے ہندوستان میں اردو زبان کے، جسے اکثر اس ملک کی لنگوا فرنیکا کہا جاتا ہے، صرف ۶ روزانہ اخبار ہیں..... ان ۶ اخباروں میں سے ۲ لاہور ایک لکھنؤ، ۲ بمبئی اور ایک حیدر آباد (دکن) سے نکلتا ہے۔ ہماری بدقسمتی سے ہندی میں جو اردو کی برابری کا دعویٰ رکھتی ہے۔ ایک بھی روزانہ اخبار موجود نہیں۔ گو اب سنا گیا ہے کہ صوبجات متحدہ کے ایک اخبار کو، جس کا نام عمداً درج نہیں کیا گیا، روزانہ کرنے کی تجویز ہو رہی ہے، اور ورنیکلر میں اگر کسی زبان کے عمدہ روزانہ پرچے نکل رہے ہیں تو وہ گجراتی ہے۔ اور گو کچھ عرصے پہلے بنگالی کے چند روزنامہ اخبار نکلا کرتے تھے لیکن اب غالباً ہت بادی کے علاوہ اور کوئی معتبر پرچہ روزنامہ نہیں چھپتا۔ مرہٹی زبان میں چند پرچے روزانہ نکلتے ہیں لیکن وہ ابھی عرصہ دراز میں بمبئی سماچار، جام جمشید اور سانجھ ورتمان ایسے گجراتی روزنامہ اخباروں کا مقابلہ کرنے کے قابل ہو سکیں گے۔ پنجاب کی تازہ ایڈمنسٹریشن رپورٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ آج کل اس صوبے میں جس قدر اخبارات شائع ہوتے ہیں ان کی مجموعی تعداد ۲۵۲ ہے۔ جس کی تفصیل درج ذیل ہے:

انگریزی (۳۸) انگریزی فارسی اردو (۱) اردو (۱۸۲) اردو ہندی (۱) ہندی (۱۱) اردو گورمکھی (۱) گورمکھی (۱۸) اور ۱۹۰۸ء - ۱۹۰۹ء میں تین نئے انگریزی اور ۱۵ ورنیکلر اخبارات جاری ہوئے....."

ادیب، ستمبر ۱۹۱۰ء صفحہ ۱۲۰ تا صفحہ ۱۲۶،

"اخبار نویسی کی ابتدا"

(۵)

"....اب سے پیشتر جس کو تقریباً پندرہ سال ہوئے ادیب کا ہمنام ایک رسالہ فیروز آباد سے شائع ہوا تھا جس کے کل بارہ پرچے نکلے تھے اور دوسرے سال بند ہو گیا (اس نام کے دو رسالے جاری ہوئے تھے .... ایک تو حیدرآباد سے نکلتا تھا اور دوسرا غالباً ۱۸۹۸ء میں فیروز آباد سے جاری ہوا تھا جس کے اڈیٹر سید اکبر علی صاحب تھے ..... یوں تو ۱۸۸۷ء میں پہلے پہل رسالہ دل گداز مولانا عبدالحلیم شررؔ نے نکالا تھا اس لئے اولیت کا فخر ممدوح کو ہے. اور اودھ ریویو ۱۸۹۶ء میں شائع ہوا۔ لیکن ہندوستان میں موجودہ طرز کے رسائل کا پیشرو ادیب ہی تھا۔ اس سے پہلے چند گلدستے بھی نکلتے تھے جن میں فقط مشاعروں کی غزلیں ہوا کرتی تھیں۔ اس مذاق کا قدیم ترین رسالہ پیام یار ہے۔ سید اکبر علی صاحب کے رسالہ کی دیکھا دیکھی گلدستوں میں بھی نثر کے مضامین بطور ضمیمہ شائع ہونے لگے. ۱۹۰۱ء میں بالکل ادیب کے طرز پر لاہور سے مخزن جاری کیا گیا اور مشہور اہل قلم کی نگاہیں جو ادیب کو ڈھونڈ رہی تھیں، یک بیک مخزن کی طرف اٹھ گئیں۔ رفتہ رفتہ ملک میں رسالوں کی ضرورت محسوس ہونے لگی، پھر تو بیسیوں رسالے نکل پڑے۔ دکن ریویو، اردوئے معلیٰ، العزیز، عالمگیر کمال دہلی، الحکم، فصیح الملک، صحیفہ، زمانہ، زبان، ادیب الاطفال، الناظر، المشرق، الشمس، کشمیری میگزین، تنویر المشرق، صلائے عام، یار شاطر، علی گڑھ منتھلی، خلاصہ عصمت، خاتون، الحجاب، معارف وغیرہ) حسن اتفاق سے اس کی پہلی اشاعت میں جوٹی کا مضمون عنوان بالا کا جزو داخل تھا، یعنی اخبار کے معنی کیا ہیں۔ جہاں تک ہمیں خیال ہے اس بحث کا اصلی ماخذ زیادہ تر انسائیکلوپیڈیا کا وہ مضمون تھا جو نیوز پیپر کے تحت میں ہے....."

ہندوستان میں مطابع اس وقت قائم ہوئے جب کمپنی کی یہاں حکومت تھی۔ اس زمانہ میں ایک آدھ اخبار بھی نکلتا تھا لیکن اس کی کوئی ایسی وقعت نہ تھی.

عہد لارڈ ولسلی سے کچھ پیشتر کلکتہ سے آٹھ یا اثر اخبارات نکلتے تھے۔ ان میں کی

کلکتہ گزٹ جو حقیقت میں بنگال گورنمنٹ کا اخبار تھا اب تک جاری ہے اگرچہ صورت و اغراض میں تبدیلی واقع ہو گئی ہے۔ اخبار ہرکارو اور انڈین گزٹ دونوں کو ایک کر کے انڈین ڈیلی نیوز نام رکھ دیا گیا۔ جو اس وقت ہندوستان کے ممتاز اخباروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ بقیہ پانچ جو معدوم ہو گئے ان کے نام یہ تھے۔ دی کلکتہ کوریر، دی بنگال جرنل، دی ایشیاٹک مرر، دی ورلڈ، دی ٹیلیگراف۔ لارڈ ولسلی پہلے گورنر جنرل تھے جنھوں نے ۱۷۹۹ء میں قانونِ مطابع جاری کیا جس کا ایک دفعہ یہ تھا کہ باغی و سرکش اڈیٹر جلا وطن کر کے یورپ بھیج دئے جائیں گے۔ اسی زمانہ میں اس پر عمل بھی کیا گیا۔

۱۸۱۸ء میں مارکوئس آف ہسٹنگز نے قانون مطابع کو منسوخ کر دیا اور اخبارات پھر جاری ہونے لگے۔ یہاں تک کہ ۱۸۳۲ء میں ان کی تعداد گیارہ تک پہنچ گئی یعنی چھ یورپین اور پانچ دیسی اخبارات تھے ان میں سے تین روزانہ، ایک ہفتہ میں دو بار، اور دو ہفتہ وار شائع ہوتے تھے۔ اس کے بعد سر چارلس مٹکاف کا زمانہ آیا۔ یہ بڑے علم دوست اور علم نواز حاکم تھے۔ چنانچہ کلکتہ کی امپیریل لائبریری (سابق مٹکاف ہال) ان ہی کی یادگار ہے......
آزادیٔ مطابع کا وہ مشہور قانون جس کا مسودہ مکالے جیسے مدبر زمانہ نے تیار کیا تھا خود چارلس مٹکاف نے ۱۸۳۵ء میں بحیثیت گورنر جنرل نافذ کر دیا.... ملک میں اس کے مفید نتائج نمایاں ہونے لگے۔ یہاں تک کہ غدر ۱۸۵۷ء کی وہ بدنصیب گھڑی آ پہنچی اور جان و مال کی تباہی کے ساتھ علم و فن کی ترقی بھی ایک حد تک رک گئی۔ اسی سال لارڈ کیننگ نے قانون مطابع پھر جاری کر دیا جس سے اخبارات ایک حد تک پابند ہو گئے.....

۱۸۵۳ء میں جب زبان اردو، پر گارسن ڈی ٹاسی اپنی سالانہ تقریر کرنے لگا تو اس نے کہا تھا کہ ہندوستان میں ۲۷، اخبارات جو قسم قسم کے ہیں اس وقت بزبان اردو شائع ہوتے ہیں اور ان کے مفصل حالات بھی بیان کئے تھے، پھر ۱۸۶۰ء میں دوبارہ اسی نے بیان کیا کہ "اس تعداد میں ۱۷، اخبارات کا اور اضافہ ہوا ہے۔ اگرچہ ان کی اشاعت و ادبی مراتب نسبتاً کم ہیں۔ اس پر بھی ان میں سے ایک کی اشاعت چار ہزار پرچوں تک پہنچ گئی ہے۔"

.....۱۸۵۸ء میں اودھ اخبار شائع ہوا۔ جو اس وقت تک جاری ہے۔ ۱۸۶۶ء سے آخر تک سرسید کے مضامین، جو اخلاقی، تمدنی اور ملکی انشاپردازی کے بہترین نمونے ہیں، علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں شائع ہوتے رہے۔ ۱۸۷۶ء میں اودھ پنچ شائع ہونے لگا۔ ..پھر ۱۸۷۷ء میں ہندی کا قدیم تر اخبار بھارت متر نکلا جو اب تک جاری ہے۔ سرسید مرحوم نے ... رسالہ تہذیب الاخلاق جاری کیا جو غالباً سب سے پہلا رسالہ ہے۔ دوسرا اخبار اردو گائیڈ کلکتہ سے شائع ہوتا تھا۔ ... (اس کا) پایہ بھی کچھ کم نہیں۔ سرسید کی سلامت روی کی داد دینے والا، ان کی حمایت کرنے والا، اور ناصح مشفق کی طرح ان کی غلط روی سے ان کو متنبہ کر دینے والا انکا ہی معاصر تھا جس کے خلوص کا شکریہ خود سرسید نے جا بجا ادا کیا ہے۔ تہذیب الاخلاق رفتہ رفتہ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں شامل کر دیا گیا۔ رہا اردو گائیڈ، وہ اخبار دار السلطنت کلکتہ کے ہاتھوں بکا.... ہم نہیں کہہ سکتے کہ انھیں دو اخبارات نے اخبار کا حق ادا کیا لیکن یہ امر مسلم الثبوت ہے کہ اس زمانہ کی روش کے مطابق ان دونوں نے ملک وقوم کی ضرورتوں کا کچھ برا اندازہ نہ کیا تھا

ان دونوں کے بعد ہندوستان میں اور زبانوں کے علاوہ اردو اخبارات کی بھی کثرت ہوگئی۔ چنانچہ ۱۸۸۲ء میں حساب کیا گیا تو معلوم ہوا کہ یہاں کے اخبارات کی تعداد ۳۷۳ تھی جن میں ہر زبان کے اخبار شامل تھے .....“

(اخبار اور اخبار نگاری؛ از اڈیٹر" ادیب

ادیب، جنوری ۱۹۰۳ء ص۴۳، ص۴۵)

مہاوت

جناب ہنسراج رہبر

"دوسرے جو چاہیں کریں، میرے گھر کا یہ دستور نہیں ہے اور سن رکھو، میرے جیتے جی ایسا نہیں ہوگا۔" بہل نے فیصلہ کن انداز میں کہا، اور عینک چڑھا کر خود لکھنا شروع کر دیا۔

لکشمی خاموش بیٹھی پتی کی طرف دیکھتی رہی۔ اس کے ہونٹ بھنچے ہوئے تھے اور آنکھوں کی چمک ماند پڑ گئی تھی۔ بہل نے نظر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا تک نہیں۔ وہ خط لکھنے میں مصروف تھا۔ اسے مکمل کر کے پتہ لکھا:- بمقام لدھیانہ ڈاک خانہ خاص ضلع خاص محلہ بیری دالان میں پہنچ کر عزیز دیودت بہل کو ملے۔"

دیودت اس کا بڑا لڑکا تھا جو پہلی بیوی سے پیدا ہوا تھا، لدھیانہ میں اس کا ہوزری کا کاروبار تھا اور وہ اپنے کنبے کے ساتھ مدت سے وہیں رہتا تھا۔ خط وکتابت یا شادی غمی میں شرکت کے علاوہ بہل کا اس سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ پہلی بیوی سے ایک لڑکی بھی تھی وہ بھی اپنے گھربار اور بچوں میں خوش تھی۔ بہن بھائی میں کافی میل جول اور محبت تھی۔ ان کا رہن سہن باپ سے مختلف تھا۔

لکشمی دوسرے بیاہ کی بیوی تھی اور وہ تین بچوں کی ماں تھی۔ یہ بچے بھی اب بچے نہیں تھے سب سے چھوٹی لڑکی ارملا نے چار سال ہوئے میٹرک پاس کیا تھا۔ منجھلی کی شادی ہو چکی تھی۔ ان دونوں سے بڑا ویدبرت نام کا لڑکا تھا جس کی عمر اس وقت چھبیس ستائیس سال تھی۔ وہ ایک بسکٹ فیکٹری میں کام کر رہا تھا۔ ڈیڑھ سو پونے دو سو تنخواہ ملتی تھی۔ سعادت مندی کا یہ عالم تھا کہ ہر مہینے پوری پوری تنخواہ باپ یا ماں کو لا کر تھما دیتا تھا۔ اس نے اپنی مرضی سے کبھی چار پیسے کا پان بھی خرید کر نہیں کھایا۔ کبھی گھنٹہ، دو گھنٹے دیر سے آنا ہوتا تو گھر والوں کو

پہلے سے مطلع کر جاتا۔ اس کا باپ روپ چند بہل کنبے کا بزرگ اور سرپرست تھا۔ اسے ملازمت سے ریٹائر ہوئے چھ سات سال ہو چکے تھے مگر گھر میں اس کی حکمرانی تھی۔ شوہر جو چاہتا کرتا تھا لکشمی اسے قسمت کے لکھے کی طرح بے چوں چرا قبول کر لیتی تھی۔ شوہر اس کی کوئی بات ماننے نہ ماننے ضد، بحث یا تکرار کرنا اس کی سرشت میں شامل نہیں تھا۔ آج وہ خاموش ضرور تھی مگر اس کی آنکھوں میں التجا تھی ـــ ایک ایسی التجا جسے ہم کسی بیکس کا اصرار ہی کہہ سکتے ہیں۔

بہل عینک صرف لکھتے پڑھتے وقت استعمال کرتا تھا اس لئے خط لکھنے کے بعد اس نے عینک اتار دی اور اسے خول میں بند کر کے حسب عادت سرہانے کے نیچے رکھ لیا۔ اسے حیرت ہو رہی تھی کہ لکشمی اس کا فیصلہ سن کر بھی وہیں بیٹھی ہے وہ اٹھ کر گئی کیوں نہیں؟ وہ چند منٹ بیوی کی طرف دیکھتا رہا اور پھر بولا:۔

"یاد ہے، پچھلے سال جب محلے کی عورتیں گڑھ مکھیتشور نہانے جا رہی تھیں تو تم نے انھیں جواب دیا تھا کہ جب تک وہ ساتھ نہ ہوں میں نے آج تک گھر سے باہر قدم نہیں رکھا۔ اب بھی ان کے بغیر کہیں نہ جاؤں گی۔" بہل فخر سے مسکرایا لیکن بیوی کی آنکھوں میں جو التجا تھی اس نے ایک کربناک سوال کی صورت اختیار کر لی۔ اس لئے بہل نے مزید کہا: "تم میری عادت کو جانتی ہو۔ میرے مزاج کو سمجھتی ہو پھر بھی یہ امید کرتی ہو کہ میں جوان جہان لڑکی سے نوکری کراؤں گا"

"سوچ لو، کوئی ہرج تو ہے نہیں۔" بیوی نے کہا اور وہ اٹھ کر چلی گئی۔

بہل اپنی جگہ بیٹھا سوچتا رہا۔ لکشمی نے اپنی بات گو نہایت آہستہ سے کہی تھی مگر اس کے الفاظ کمرے میں گونج رہے تھے۔ بہل انھیں گونجتے ہوئے سن رہا تھا اور اس کے دل و دماغ میں سوئیاں سی چبھ رہی تھیں۔ لکشمی نے زندگی میں پہلی بار اصرار کیا تھا اور بہل اپنے آپ کو پہلی بار عاجز محسوس کر رہا تھا جیسے نوکری کی طرح گھر کی حکمرانی بھی اس کی گرفت سے نکل چکی ہو، دنیا میں اس کی کچھ بھی قدر و منزلت نہ رہی ہو۔ اسے اپنے آپ پر غصہ آیا اور وہ جھلا کر بولا:۔

"ہرج کیوں نہیں؟ میں جو کہتا ہوں ہرج ہے، ہرج ہے، بہت ہرج ہے۔"

لیکن اس کی حالت اس مسافر جیسی تھی جو گاڑی نکل جانے سے جھلاّ اٹھا ہو اور پلیٹ فارم پر کھڑا دل کی جھوٹی تسلّی کے لئے کہہ رہا ہو "کوئی ہرج نہیں، میں کل چلا جاؤں گا"۔ بہل کو اپنی تردید بالکل بے معنی معلوم ہو رہی تھی اور لکشمی کے الفاظ پہلے سے کہیں زیادہ شدت کے ساتھ فضا میں گونج رہے تھے اور گزشتہ دو تین سال کے واقعات سے ان کی تصدیق ہوتی تھی۔

مسئلہ تھا اُرملا کی شادی کا۔ بہل اپنی اس بیٹی کی شادی بھی اس طرح کر دینا چاہتا تھا جس طرح پہلی دو شادیاں کی تھیں۔ ویسے وہ دور اندیش تھا چنانچہ اس مقصد کے لئے پہلے ہی سے پانچ ہزار روپیہ فکسڈ ڈیپازٹ میں جمع کرا رکھا تھا۔ اس کے علاوہ ہزار دو ہزار اور بھی خرچ کرنے کو تیار تھا۔ مگر پچھلے دو تین سال کی دوڑ دھوپ نے ثابت کر دیا تھا کہ اتنے روپے میں اچھا بر ملنا ممکن نہیں ہے۔ جہاں بھی بات چلی وہیں مایوسی کا منہ دیکھنا پڑا۔ کچھ لوگ تو ایسے تھے جن سے برسوں پرانی جان پہچان تھی اور جن پر روپ چند بہل کو پورا بھروسہ تھا۔ مثلاً ایک صاحب ہیرانند تھے انھوں نے اس تجویز پر بڑے تپاک سے کہا : بھائی صاحب، یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے۔ آپ کی بیٹی میری بیٹی اور میرا لڑکا آپ کا عزیز ہے۔ مگر آپ جانتے ہیں کہ ایسے معاملوں میں عورتوں سے صلاح مشورہ ضروری ہے۔ اس لئے بات پکی کرنے سے پہلے میں آپ کی بھابی سے پوچھ لینا ضروری سمجھتا ہوں یا پھر یوں کیجئے پرسوں شام کو غریب خانہ پر تشریف لے آیئے۔ میں بھی ہوں گا آپ کی بھابی بھی ہوں گی اور چائے پیتے وقت بات یوں چلایئے جیسے مجھ میں آپ میں اس سلسلہ کی کوئی گفتگو ہوئی ہی نہ ہو۔ آپ مجھ سے مخاطب ہونے کے بجائے اپنی بھابی سے کہیئے۔ ان کا رخ دیکھ کر میں بھی حامی بھر دوں گا"

بہل گیا، بات چیت چلی اور آخر وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ بیوی کا تو محض بہانہ ہے دراصل ہیرانند خود یہ رشتہ قبول کرنے کو تیار نہیں کیونکہ بیٹے کے بیاہ سے انھوں نے جو امیدیں وابستہ کر رکھی ہیں۔ انہیں وہ پورا نہیں کر سکتا۔

"دیکھو، یہ حالت ہے" بہل نے گھر لوٹ کر بیوی سے شکایت کی "کوئی کسی کا کیا

اعتبار کرے لوگ کہتے کچھ ہیں اور کرتے کچھ ہیں۔"

"دنیا میں سب ہی طرح کے لوگ بستے ہیں گھبراؤ نہیں۔ لڑکا مل جائے گا۔ پہلے بھی تو شادیاں کی ہیں۔ پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں۔" بیوی نے تسلی دی۔

"کھانے کے وقت پانچوں برابر ہو جاتی ہیں۔" بہل طنزاً مسکرایا۔

کوشش اس کے بعد بھی جاری رہی لیکن بات نہیں بنی کبھی لڑکے میں نقص ہوتا اور کبھی لڑکے والے اعتراض کرتے کہ لڑکی کے نین نقش تو اچھے ہیں لیکن رنگ سانولا ہے اور کوئی کہتا کہ تعلیم تھوڑی ہے۔

آخر دیودت نے اپنی جان پہچان کا ایک لڑکا بتایا جس کا نام ہربنس تھا اور وہ بنک میں ملازم تھا۔ صحت اچھی تھی اور عمر بھی مناسب تھی۔ اس پر طرہ یہ کہ وہ اپنی مرضی سے بیاہ کر سکتا تھا اور اسے جہیز دہیز کا بھی کوئی لالچ نہیں تھا۔

بہل اس سے مل کر بہت خوش ہوا۔ ہربنس کو گھر پر بلایا بیوی نے دیکھا، لڑکی نے دیکھا اور لڑکا سب کو پسند آیا۔ جہاں وہ روپ رنگ اور ڈیل ڈول میں موزوں تھا وہاں بات چیت بھی سمجھداری اور سلیقے سے کرتا تھا۔

جب اس کے سامنے بیاہ کی تجویز رکھی گئی تو اس نے نہایت حلیمی سے کہا: "میں نے دیودت کے پاس کام کیا ہے ان کا مجھ پر بڑا احسان ہے۔ آپ ان کے بزرگ ہیں تو میرے بھی بزرگ ہیں۔ میں آپ کی بات ٹال نہیں سکتا۔ مگر مجھے جو تنخواہ ملتی ہے ماں باپ کا گزارہ بھی اسی پر ہے۔ اس کے علاوہ میرا ایک چھوٹا بھائی ہے اسے پڑھانے کی ذمہ داری بھی مجھ پر ہے۔ ان حالات میں میں اور کوئی ذمہ داری اپنے اوپر لینے کو تیار نہیں ہوں۔" "تو کیا بیاہ نہیں کروگے؟" بہل نے ہنس کر کہا۔

"ایسا تو خیر کوئی ارادہ نہیں ہے۔" اس نے قدرے جھینپتے ہوئے کہا: "سال دو سال انتظار ہو سکتا ہے اور میرا خیال ہے کہ جہاں دو ڈھائی سو میں کماتا ہوں سو ڈیڑھ سو لڑکی بھی کمائے ورنہ آپ جانتے ہیں مہنگائی کے اس زمانہ میں گرہستی چلانا آسان نہیں ہے۔"

بہل کی امیدوں پر اوس پڑ گئی۔ اسے بے حد افسوس ہوا لیکن جواب کیا دے۔ حقیقت کو منطق سے کیسے جھٹلائے؟

"آپ میرے بزرگ ہیں، میرا آپ کو کوئی صلاح دینا چھوٹا منہ بڑی بات ہے۔" ہربنس نے پھر کہا۔ "لیکن بہتر یہی ہے کہ آپ لڑکی کو ٹیچرز ٹریننگ سکول میں داخل کرادیں۔ آپ نے بیاہ کے لئے جو روپیہ رکھ چھوڑا ہے اس میں سے خرچ کریں۔ بعد میں آپ کو لڑکا ڈھونڈنے میں کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔ اور اس میں خود لڑکی کی بھلائی ہے۔"

ہربنس کی صاف گوئی نے بہل سے زیادہ لکشمی کو متاثر کیا اور فطرت کا تقاضا بھی یہی ہے کیونکہ اختیار اور دانشمندی کا زعم مرد میں ضد اور ہٹ دھرمی پیدا کرتا ہے اس کے برعکس عورت اپنے جائز حقوق سے بھی محروم ہے وہ زندگی کو جنم دیتی ہے اس کی نشوونما کے لئے ہر طرح کا ایثار کرتی ہے اور ارتقاء پذیر قدروں کو غیر شعوری طور پر ہی مرد کی بہ نسبت جلد قبول کر لیتی ہے۔ چنانچہ جب ہربنس چلا گیا تو لکشمی بولی:۔

"بات تو وہ ٹھیک کہتا ہے۔ ہمارے پڑوس میں چوپڑہ ہی کی مثال لے لو ان کی پشپا ہماری اسلا سے سال ڈیڑھ سال چھوٹی ہے اس کے لئے وہ کتنے فکرمند تھے پر جب سے ٹائپ سیکھ لیا ہے اور دفتر جانے لگی ہے ماں باپ بھی خوش ہیں اور لڑکی بھی خوش ہے اب انھیں بیاہ کی ذرا بھی فکر نہیں ہے۔"

جولا واہل کے اندر کھول رہا تھا بیوی کی بات سن کر باہر نکل پڑا اور وہ چلایا:۔

"دوسرے جو چاہیں کریں مگر میرے گھر کا یہ دستور نہیں ہے....."

اس کے بعد اسے رات بھر چین نہیں آیا۔ وہ بہت دیر تک کروٹیں بدلتا اور سوچتا رہا۔ دمے کا مرض جو کچھ دنوں سے دب گیا تھا یکایک پھر عود کر آیا۔ دو اپنی بیوی نے روئی سے چھاتی پر سینک کیا۔ تب کہیں آدھی پچھلی رات آنکھ لگی۔

صبح جب ٹہلنے نکلا تب بھی پریشان تھا اور کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کرے اور کیا نہ کرے۔

"بہل آج کچھ اداس معلوم ہوتے ہو" سیر کے ساتھی تیرتھ رام سونی نے پوچھا۔ "اداس ہی نہیں بہت پریشان ہوں" بہل نے جواب دیا۔

"کیوں، بات کیا ہے؟"

سونی اس کا ہم عمر تھا اور اس کے ساتھ ہی ریلوے کی ملازمت سے ریٹائر ہوا تھا۔ دونوں ایک ساتھ سیر کو جاتے تھے اور آپس میں دکھ سکھ کی باتیں کرتے تھے۔ چنانچہ بہل نے اپنی بپتا بیان کرتے ہوئے کہا:۔

"میں اس لڑکی کے مارے جتنا پریشان ہوں اتنا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ پھر دیکھو، شادی تم نے بھی کی تھی اور میری بھی دو شادیاں ہوئیں۔ ہم لوگ تو صرف یہی دیکھتے تھے کہ لڑکی شکل صورت سے اچھی اور گھر کے کام کاج میں سگھڑ ہو مگر آج کل کے لڑکوں کو تو پر نکل آئے ہیں اور بالکل ہواؤں میں اُڑتے ہیں۔" اس کا دم اکھڑ گیا لیکن کھانسنے کے بعد پھر بولا: "دیکھتے دیکھتے زمانہ کتنا بدل گیا ہے۔ پہلے یہ رواج چلا کہ لڑکیوں کو پڑھایا جائے۔ چلو، مان لیا خط پتر لکھنے اور کتاب جانچنے کے لئے تھوڑی بہت پڑھائی بھی ضروری ہے۔ مگر اب تو لوگ یہ چاہتے ہیں کہ عورتیں نہ صرف پڑھیں بلکہ مردوں کے برابر نوکری بھی کریں۔ بتاؤ تو یہ کہاں کی سمجھ ہے۔ کیا عورت کے لئے کرنے کو گھر میں کام تھوڑا ہوتا ہے؟"

"لیکن دوست، ہماری تمہاری سمجھ تو اب پرانی ہو گئی۔ ہمیں اب کون پوچھتا ہے۔ دور جانے کی ضرورت نہیں میں اپنے ہی گھر کی بات کہتا ہوں۔ پچھلے سال پرکاش کی شادی ہوئی۔ بہو بی۔ اے بی ٹی ہے۔ تمہیں سوچو کہ جو لڑکی بی اے بی ٹی ہے وہ گھر میں کیسے بیٹھے گی۔ لڑکوں کی بھی یہ رائے تھی کہ وہ نوکری کرے۔ میں نے کچھ دخل نہیں دیا۔ اپنے من میں سوچ لیا اچھا بھئی ٹھیک ہے۔"

"لیکن مصیبت تو یہ ہے کہ ایک دوسرے کی دیکھا دیکھی سب چاہتے ہیں کہ میاں بھی کمائے اور بیوی بھی کمائے۔"

"اور زمانہ جدھر چلے ادھر چلنا ہی پڑتا ہے۔ کوئی نہ چلے تو وہ اڑیل ٹٹو کہلاتا ہے۔"

بہل نے چونک کر سونی کے منہ کی طرف دیکھا وہ سنجیدہ اور گمبھیر تھا اس نے یونہی قاعدے کی ایک بات کہی تھی مگر "اڑیل ٹٹو" میں طنز کا جو ڈنک تھا وہ اس کے گھاؤ میں چبھ گیا اور وہ درد کو سینے سے چھپا کر چپ ہو رہا۔

"ویسے آدمی دنیا میں سب سے زیادہ طاقت ور ہے لیکن دوست، زمانہ اس سے بھی زیادہ زبردست ہے" سونی نے سلسلہ جاری رکھا جس طرح ربڑ کی سیٹی والی گیند کا سوراخ پھٹ کر پھیل جاتا ہے اس کی بائیں باچھ قدرے پھیلی ہوئی تھی جس سے بات کچھ بکھر جاتی تھی اور سونی بولتے ہوئے بچے کی طرح معصوم دکھائی دیتا تھا۔ اب بھی اس نے نہایت معصومیت سے کہا: "سنو بہل، ہم نے تو جو کچھ دیکھا سنا اور پڑھا ہے اس سے بس ایک ہی نتیجہ نکلتا ہے"

"کیا؟" بہل چلتے چلتے رک گیا اور اسے یوں محسوس ہوا کہ سونی جس صداقت کا انکشاف کرنا چاہتا ہے اسے سننے کے لئے پیڑ پودے اور پرندے بھی ہمہ تن گوش ہیں۔

"ہاتھی کو مہاوت ہانکتا ہے اور آدمی کو وقت....."

سونی نے جواب دیا اور وہ کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ اس کی آنکھوں میں غیر معمولی چمک تھی۔ جو کہیں دور روح کی گہرائیوں سے آرہی تھی۔

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ میں لڑکی کو داخل کرا دوں؟"

"کوئی ہرج نہیں" سونی نے آہستہ سے جواب دیا۔

اور وہ دونوں اپنی آخری منزل نہر کے پل پر بیٹھے تھے موسم نہایت خوشگوار تھا۔

اعلیٰ تعلیم اور جامعہ

انگریزوں کے اقتدار کے ساتھ ساتھ مغربی تہذیب اور معاشرت ہماری زندگی پر اثر انداز ہونے لگی سب سے پہلے گورنر جنرل وارن ہیسٹنگز نے مسلمان شریف زادوں کو ذمہ دارانہ اور اعلیٰ منصب کے لئے تیار کرنے کی غرض سے کلکتہ مدرسہ قائم کیا اور چند ہی سال کے بعد اسی غرض سے بنارس میں باحیثیت ہندوؤں کی تعلیم کے لئے ایک مدرسہ کھولا گیا۔ ۱۸۳۵ء میں لارڈ ولیم بنٹنگ کے دور میں میکالے کی وہ مشہور تجویز منظور ہوئی جس کی بدولت مشرق کے علم و فضل کا ٹمٹماتا ہوا چراغ محفل سے قطعی طور پر ہٹا دیا گیا اور انگریزی ادب و فن کی ترویج و ترقی کو حکومت وقت نے ایک اہم مقصد قرار دیا۔ یہ سہارا پاتے ہی انگریز پادری اپنے مذہب اور اپنی تہذیب کی اشاعت کا کام پوری تن دہی سے کرنے لگے۔ انھوں نے جگہ جگہ مدرسے اور کالج کھولے اور مغرب کے جدید علوم اور انگریزی زبان کو ہندوستانی عوام کے پاس بڑے خلوص اور جذبے کے ساتھ پھیلانے لگے۔ ۱۸۵۴ء میں کمپنی کے ڈائریکٹروں کے نام سر چارلس وڈ کا ایک اہم مراسلہ آیا۔ اس مراسلے کی رو سے نصاب تعلیم بنایا گیا۔ مقصد کی اس وضاحت کے بعد کلکتہ کے اندر ۱۸۵۷ء میں پہلی یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا اور اسی سال بمبئی اور مدراس کی یونیورسٹیاں بنیں۔ یہ یونیورسٹیاں، لندن یونیورسٹی کے نمونے پر تشکیل کی گئی تھیں اور ان کا کام در اصل امتحان لینا اور اس بنا پر اسناد تقسیم کرنا تھا۔ ان کی ذمہ داری براہِ راست تعلیم و تربیت نہیں تھی۔ ۱۸۸۲ء میں پہلا اعلیٰ تعلیم کا کمیشن مقرر ہوا۔ اس وقت تک پنجاب اور الٰہ آباد یونیورسٹیاں وجود میں آچکی تھیں۔ اور اس کے بعد اعلیٰ تعلیم کی ترقی کا دور شروع ہوا۔ ۱۹۰۲ء میں دوسرا کمیشن مقرر ہوا۔ جس نے اعلیٰ تعلیم کے اداروں میں نظم و نسق کو بہتر بنانے پر زور دیا اور جس کی سفارش کی بنا پر ۱۹۰۴ء کے یونیورسٹی

ایکٹ کی تشکیل ہوئی۔ ۱۹۱۶ء میں کلکتہ یونیورسٹی کمیشن مقرر ہوا اور اس کے بعد ملک کے اندر مختلف یونیورسٹیوں کی داغ بیل پڑی۔ ان یونیورسٹیوں میں ایک دوسرے کے ساتھ رابطہ قائم رکھنے کی غرض سے ۱۹۲۵ء میں انٹر یونیورسٹی بورڈ قائم ہوا۔ اس طرح جدید مغربی علوم کی اعلیٰ تعلیم کا نظام ہمارے دیس میں مستحکم ہو گیا۔

میدان علم میں بدیسی حکومت کی اس مصلحت آمیز عنایت سے قطع نظر، تحریک آزادی کے ابتدائی دور میں اعلیٰ تعلیم کے کئی ادارے قائم ہوئے جنھوں نے جذبہ حریت کی بیداری اور خدمتِ وطن کو اپنا نصب العین قرار دیا۔ اگرچہ ان سب کو طرح طرح کی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا اور بعض ان کی تاب نہ لا کر ختم ہو گئے، پھر بھی ان میں سے چند اپنے آپ کو برقرار رکھنے میں کامیاب ہوئے۔ ان منتخب اداروں میں جامعہ ملیہ اسلامیہ دشوا بھارتی وشو ودیالیہ گروکل کانگڑی اور جادو پور کا انجینئرنگ کالج شامل ہیں۔ یہ سب ادارے یا تو براہِ راست تحریک آزادی کی دین تھے یا بالواسطہ اس سے متاثر تھے۔ آزادی سے قبل یہ قومی ادارے اپنے کارکنوں کی جاں نثاری اور عوام کی فیاضی کے بدولت اپنے فرائض کو حکومتِ وقت کی بے نیازی اور بعض اوقات اس کے عتاب کے باوجود کسی طور پر پورا کرتے رہے۔ حصولِ آزادی کے بعد یہ سب ادارے قومی حکومت سے کسی نہ کسی عنوان سے مالی امداد پانے لگے۔

دوسری عالم گیر جنگ کے دوران حکومت ہند نے ملک کی تعلیم کا جائزہ لیا اور اس کی آئندہ ترقی کا ایک خاکہ تیار کیا۔ اس رپورٹ میں جو سارجنٹ رپورٹ کے نام سے مشہور ہو چکی ہے، اعلیٰ تعلیم کے سلسلے میں یونیورسٹی گرانٹ کمیٹی کے قیام کی سفارش کی گئی اور یونیورسٹی کی پہلی ڈگری کے لئے سہ سالہ سندی نصاب تجویز کیا گیا۔ ساتھ ہی ساتھ اعلیٰ تعلیم کی توسیع کا ایک واضح خاکہ سامنے رکھا گیا۔ اس کے بعد دوسرا اہم قدم دسمبر ۱۹۴۸ء میں یونیورسٹی ایجوکیشن کمیشن کے قیام کی شکل میں اٹھایا گیا۔ اس کمیشن کی سفارش پر ۱۹۵۳ء میں یونیورسٹی گرانٹس کمیشن، وجود میں آیا اور پارلیمنٹ کے ایک

ایکٹ کے ذریعے ۱۹۵۶ء میں اُسے ایک خودمختار ادارہ قرار دے دیا گیا۔ اب اعلیٰ تعلیم سے متعلق بیشتر امور اسی ادارے کے دائرہ اختیار میں آتے ہیں۔ یہی ادارہ اعلیٰ تعلیم کے معیار کا محافظ ہے یہی مالی امداد بہم پہنچاتا ہے اور یہی مختلف اداروں میں اپنے دلیں کی روایات و ضروریات کے پیش نظر وحدت کار اور اشتراک عمل کی راہیں استوار کرتا ہے۔ ادھر چند سال کے اندر اس ادارے کی بدولت اعلیٰ تعلیم کے میدان میں غیر معمولی وسعت پیدا ہوگئی ہے۔ اس توسیع کا کچھ یوں اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ۱۹۵۱ء میں پورے ملک میں صرف ستائیس یونیورسٹیاں تھیں ۱۹۵۶ء میں پانچ یونیورسٹیوں کا اضافہ ہوا۔ ۱۹۶۱ء میں ان کی تعداد بڑھ کر اکسٹھ ہوگئی۔ اب تیسرے قومی منصوبے کے دوران میں تقریباً بارہ نئی یونیورسٹیاں اور قائم کی جائیں گی اور ہر سال اسی کے لگ بھگ نئے کالج کھلا کریں گے۔ اب ثانوی منزل کے بعد کی تعلیم علوم و فنون کے کالجوں، مخصوص پیشوں کے لئے تیار کرنے والے کالجوں، کسی خاص نوعیت کی تعلیم دینے والے اداروں اور تحقیقی اداروں کے ذمے ہے۔ ان تمام درسگاہوں کے نصاب، امتحان اور سند دینے کے کام کی ذمہ داری یونیورسٹیوں کے سر ہے۔ یہ یونی ورسٹیاں تین طرح کی ہیں۔ کچھ صرف امتحان لیتی اور سند دیتی ہیں، خود براہِ راست تعلیم کا انتظام نہیں کرتیں۔ کچھ اپنے ایک مخصوص اور محدود دائرے میں صرف تعلیم کا انتظام کرتی ہیں اور کچھ دونوں فرائض انجام دیا کرتی ہیں۔ ان باضابطہ قائم شدہ یونیورسٹیوں کے علاوہ اعلیٰ تعلیم کے چند ادارے اور بھی ہیں۔ یہ بیشتر تحقیقی کام کے ادارے ہیں اور اپنے معیار کے مطابق یونیورسٹی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ علاوہ ازیں انٹر یونیورسٹی بورڈ نے "سائنٹفک ریسرچ" کے کئی اداروں کو اعلیٰ درجے کی تحقیق کرنے والا ادارہ تسلیم کر لیا ہے۔ ان میں سے چند تعلیم کا کام کرتے ہیں۔ اسی طرح وہ قومی ادارے ہیں جن کی اسناد کو حکومت نے ملازمت کے لئے تو ایک یونیورسٹی کی سند کے مساوی قرار دے دیا ہے لیکن انھیں دستوری طور پر یونیورسٹی کا درجہ حاصل نہیں ہے۔ چند دن پہلے تک اسی فہرست میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کا بھی شمار تھا لیکن یہ خوشخبری اب آپ سن ہی چکے ہیں کہ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کی سفارش پر مرکزی سرکار نے جامعہ کو اپنی اسناد

تقسیم کرنے کا استحقاق عطا کر دیا ہے اور جامعہ باضابطہ طور پر یونیورسٹیوں کی صف میں شامل ہوگئی ہے۔

جامعہ کے سفرِ حیات کی اب چوتھی منزل کا آغاز ہو رہا ہے۔ ۲۹ر اکتوبر ۱۹۲۰ء کو مہاتما گاندھی، علی برادران اور دیگر محبان وطن کے ایما پر چند اساتذہ اور طلبا محمڈن اینگلو اورینٹل کالج علی گڑھ سے علیحدہ ہوئے اور انھوں نے ایک قومی ادارے کی بنا ڈالی۔ ۱۸۷۵ء میں سرسید احمد خاں نے وقت کے تقاضوں کو پہچان کر مسلمانوں کی تعلیم کے لئے اینگلو اورینٹل کالج علی گڑھ قائم کیا تھا تاکہ حکومتِ وقت کی عنایت سے مسلمان محروم نہ رہ جائیں اور اس کی اعانت میں دوسروں سے پیچھے نہ رہیں۔ اس کالج نے ۱۹۲۱ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی شکل اختیار کر لی۔ اس عظیم درسگاہ کے بطن سے ایک ایسا ادارہ پیدا ہوا جس کا مقصد قوم پرور اور حریت پسند مسلمان بنانا قرار پایا، اور یہ ادارہ، جامعہ ملیہ اسلامیہ کہلایا۔ شروع کے پانچ سال جامعہ ملیہ نے علی گڑھ ہی میں جوں توں گزار دئے۔ ۱۹۲۵ء میں مسیح الملک حکیم اجمل خاں کی زیرِ سرپرستی جامعہ، دہلی منتقل ہوگئی۔ یہاں پر مسیح الملک اور ڈاکٹر انصاری کے زیرِ سایہ اس درس گاہ کی زندگی کا دوسرا دور شروع ہوا۔ اس منزل پر چند اساتذہ اور طلبہ ہی اس کا اثاثہ تھے۔ استادوں نے بیس سال تک بے لوث خدمت کا حلف اُٹھایا اور قلندرانہ زندگی بسر کرنے لگے۔ مالی وسائل کی تنگی بلکہ فقدان کے باوجود یہ مجاہد میدانِ عمل میں اپنا دائرہ عمل برابر وسیع کرتے رہے۔ ابتدائی اور ثانوی مدرسوں نے ایک معیاری شکل اختیار کر لی جس کی بدولت اعلیٰ تعلیم کی بنیاد استوار کی جا سکتی تھی۔ جامعہ کالج، اگرچہ وسعت کے لحاظ سے بہت چھوٹا تھا لیکن اپنے اساتذہ کے علم و فضل اور تصانیف کے اعتبار سے ایک قابلِ تقلید نمونہ ٹھیرا۔ عام روش سے ہٹ کر تعلیم بالغان کی طرف بھی جامعہ متوجہ ہوئی۔ اس نے سارے دیس کو تعلیم بالغان کے صحیح تصور سے روشناس کرنے کا افتخار حاصل کیا۔ ملک کو سماجی تعلیم کی منزل پہنچانے میں جامعہ کے ادارہ تعلیم ترقی نے قابلِ قدر خدمت انجام دی ہے۔ جامعہ نے بچوں اور

انوں کے ادب کی اشاعت کو اپنے تعلیمی پروگرام میں خاص جگہ دی اس کام کو تعلیم کا ایک نہایت ہی اہم اور اولین جزو سمجھ کر ملک کی رہنمائی کی۔ ان منظم کارگزاریوں کے ساتھ ساتھ کچھ نہ کچھ تحقیق کا کام بھی برابر ہوتا رہا۔ سنہ ۱۹۳۸ء میں بنیادی تعلیم کے اصول کے مطابق اساتذہ تیار کرنے کی غرض سے جامعہ نے استادوں کا مدرسہ، قائم کیا، جس کی مالی امداد کئی سال تک ہندوستانی تعلیمی سنگھ کرتا رہا۔ حصول آزادی کے ساتھ جامعہ کا دوسرا دور ختم ہوا۔ اس دور کے اختتام پر جس تنگ نظری، درندگی اور جہالت کا اظہار ملک بھر میں ہوا، جامعہ کی فضا اس سے قطعی پاک رہی۔ اس موقع پر جامعہ نے اپنے کردار سے ان صفات کا ثبوت پیش کیا جو اعلیٰ تعلیم کی اقدار کہلاتی ہیں۔ قومی حکومت کے برسرِ اقتدار آنے کے ساتھ کارکنانِ جامعہ کو چاہ کندن اور آب برآوردن کی تگ ودو سے نجات حاصل ہوئی لیکن جامعہ کو اب بھی باضابطہ طور پر ایک یونیورسٹی کا منصب حاصل نہ تھا۔ سنہ ۱۹۴۸ء کے یونیورسٹی کمیشن نے اگرچہ جامعہ کو ایک دیہی یونیورسٹی بنانے کی سفارش کی تھی مگر اس پر بوجوہ عمل نہ کیا جا سکا۔ اور اس وجہ سے اعلیٰ تعلیم کی توسیع کا کام خاطر خواہ نہ ہو سکا۔ جامعہ نے اپنے محدود وسائل کے باوجود اس زمانے میں آرٹ کی تعلیم دینے والے اساتذہ کی تربیت کے لئے انسٹی ٹیوٹ قائم کیا جو آج بھی اپنی مثال آپ ہے۔ مزید برآں بنیادی تعلیم کے میدان میں تحقیقی کام شروع کیا اور ادارہ دیہی معاشیات نے اس باب میں عملی تحقیق کی داغ بیل ڈالی۔ تعلیم بالغان کے سلسلے میں بھی تصنیف و تالیف کے علاوہ چند تحقیقی منصوبے مکمل کئے گئے۔

اس طرح جامعہ اپنے مقصد اور اپنے دائرہ عمل کے اعتبار سے ایک حد تک اعلیٰ تعلیم کے منصب کو پورا کرتی رہی ہے اگرچہ اس کے وسائل نہایت محدود تھے۔ جامعہ نے ایک طرف مخصوص کردار کو برقرار رکھنے کی پرخلوص کوشش کی ہے اور دوسری طرف تقاضائے وقت کا بھی لحاظ رکھا ہے۔ بدیسی سامراج کے عہد میں سیاسی مصلحتوں کے پیش نظر تعلیم کو متعینہ حدود کے اندر رکھا گیا۔ لیکن جامعہ اس دورِ استبداد میں بھی آزادی

فکر و عمل کی علمبرداری رہی۔ اس نے اپنے کام میں تنوع پیدا کیا اور تعلیم کے نئے میدانوں میں پیش قدمی کو اپنا شعار بنایا۔ جامعہ کی یہ چالیس سالہ زندگی قومی یک جہتی اور اخوت و مروت کی ایک خوشگوار داستان ہے۔ یہاں پر حصولِ علم کے ساتھ تہذیب کی شمع بھی روشن رہی ہے۔ افراد کو شخصیت کے احترام کا درس ملا ہے۔ شخصی آزادی کی حمایت بھی سکھائی گئی ہے۔ اور قومی فرائض کی ادائیگی کی ترغیب بھی دی گئی ہے۔ آج جبکہ جامعہ کو باضابطہ طور پر ایک یونیورسٹی کا منصب عطا ہو گیا ہے، اس کے سفر کی تیسری منزل ختم ہوتی ہے۔ اب انشاء اللہ جامعہ اپنے فرائض کو بخوبی پورا کر سکے گی اور اس کا دائرہ عمل روز بروز وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا جائے گا۔ اس وقت اس کے سامنے وہی کٹھن منزل آ گئی ہے جبکہ آئینِ نو، سے ڈرنے اور طرزِ کہن، پر اڑنے کا سوال اُٹھ کھڑا ہوتا ہے مگر اس کی اپنی روایات یہ یقین دلاتی ہیں کہ اگلا قدم صحیح اٹھے گا۔ جامعہ اپنی انفرادیت برقرار رکھ سکے گی۔ اس کی ذات اعلیٰ تعلیم کے اداروں میں محض تعداد کا اضافہ بن کر نہ رہ جائے گی بلکہ تعلیمی معیار کی برتری کی ضامن بھی ہو گی اس کی غور و فکر کی آزادی برقرار رہے گی اور وہ تعلیم کے میدان میں برابر نئی راہیں تلاش کرتی رہے گی کیونکہ یہی اجتہاد و تنوع، آزادئ خیال اور وسعتِ قلب و نظر، قومی ذہن کے بیدار ہونے کی علامت ہیں اور یہی وہ صفات ہیں جنھیں اعلیٰ تعلیم کی روح قرار دیا گیا ہے۔

"معلم"

حالات حاضرہ

غیر ملکی امداد — افسانہ اور حقیقت

جناب ظفر پیامی

پچھلے دنوں پارلیمنٹ میں اخباروں میں اور لیڈروں کی عام بات چیت میں ایک خوف کا خاص طور پر چرچا رہا۔ وہ یہ ہے کہ اگر غیر ملکی امداد نہیں ملی تو ہمارے تعمیری پروگرام ٹھپ ہوکر رہ جائیں گے۔ غیر ملکی امداد کی اس اہمیت کے پیش نظر مطالبہ ہورہا ہے کہ خارجہ پالیسی کا تعین کرتے وقت اہل کرم کے مزاج کا لحاظ رکھ لینا چاہیئے۔ غیر ملکی امداد کا یہ ایک ایسا طلسم ہے جس میں صرف مغرب نواز عناصر ہی گرفتار نہیں ہیں، ان کے مخالفوں کا بھی کہنا ہے کہ اگر غیر ملکی مدد ہمیں نہ ملی تو آگے بڑھنے کے بجائے ہم صدیوں پیچھے جا پڑیں گے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اس سلسلے میں وہ امریکہ کی نہیں بلکہ روس کی سابقہ کارگزاریوں کو فخر کے ساتھ پیش کرکے یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ مغربی بلاک کے بجائے اگر مشرقی بلاک کے سامنے ہم جھولی پھیلائیں تو زیادہ اچھا رہے گا۔ حزب مخالف کی اکثر پارٹیوں نے بھی حکومت پر نکتہ چینی کرتے وقت اس بات کو خاص طور پر اہمیت دینا چاہی ہے کہ جو بھی ترقی ہورہی ہے وہ غیروں کے داد و دہش کی مرہون منت ہے۔

افسوس یہ ہے کہ حکومت کے اکثر ارکان (وزیر اعظم کے سوا) نے بھی اس نکتہ چینی کا صحیح ڈھنگ سے جواب دینے کی کوشش نہیں کی۔ مثلاً وزیر خزانہ نے اکثر اسی پر زور دیا ہے کہ غیر ملکی امداد ضروری بھی ہے اور بے ضرر بھی۔ یہ ثابت کرنے کی کوشش بھی ہوتی رہی ہے کہ دنیا کا کوئی ملک آج تک غیر ملکی مدد کے بغیر ترقی نہیں کرسکا۔ مثلاً اگر روس کو انقلاب کے شروع کے برسوں میں امریکی سرمایہ داروں کا تعاون حاصل نہ ہوتا (جو یورپین ملکوں کی تجارت کی راہ میں زیادہ سے زیادہ رکاوٹیں پیدا کرنا چاہتے تھے) تو شاید سوویت یونین کی صنعتی صورت کافی حد تک مختلف

ہی ہوتی۔ اس میں بھی شبہ نہیں کہ ہندوستان ایسے ملک کے لئے یہ مدد اور بھی ضروری ہے۔ ہم انتظار نہیں کر سکتے کہ برطانیہ کی طرح تین صدیاں اپنے صنعتی انقلاب کی تکمیل میں صرف کردیں صدیوں کا کام اگر برسوں میں کرنا ہے تو باہر کی مدد کا سہارا لینا ہی پڑے گا۔

حکومت کی جانب سے اسی لئے باہر سے ملنے والی ہر مدد کو ایک بہت بڑا کارنامہ کہہ کر پیش کیا جاتا ہے۔ اگر کوئی چھوٹے سے چھوٹا ملک بھی ہماری تعمیری ترقی کے لئے کچھ دینے پر رضامندی ظاہر کرتا ہے تو اسے اُن لوگوں کا بہت بڑی کارگذاری کا نام دیا جاتا ہے جنھوں نے اس ملک کو یہ عنایت کرنے کی ترغیب دی تھی۔

یوں ایک عام خیال پیدا ہوا ہے کہ ہماری تعمیری ترقی اور غیر ملکی امداد لازم و ملزوم ہیں یہ خیال نہ صرف واقعاتی طور پر قطعاً غلط ہے بلکہ ہمارے ملک کے ان کروڑوں انسانوں کیساتھ ناانصافی کے مترادف ہے جنھوں نے اسے ملک کی تعمیر کے لئے کسی بھی قسم کی قربانی سے کبھی گریز نہیں کیا۔ حقایق پر نظر ڈالئے تو احساس ہوگا کہ ہندوستان کو ملنے والی امداد کو نہ تو بہت زیادہ کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی اس پر ہماری قومی ترقی کا دارومدار سمجھنا چاہیئے۔

منصوبہ بندی کی شکل میں ہماری قومی تعمیر کا کام پہلے پانچ سالہ پلان کی صورت میں ۱۹۵۰ء میں شروع ہوا۔ اس پلان کا سب سے بڑا نشانہ یہ تھا کہ ملک میں زرعی پیداوار بڑھے اور صنعتی ترقی کے کاموں کو شروع کرنے کے لئے ایک بنیاد بنے۔ یہ پلان کس حد تک کامیاب ہوا، اس سے فی الحال بحث نہیں ہے۔ لیکن یہ جاننا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ اس پر کل ملا کر ۱۹۶۰ کروڑ روپے خرچ ہوئے۔ اس میں سے ۱۷۷۲ کروڑ روپے ملک کے اندر سے فراہم کئے گئے۔ غیر ملکوں سے آنے والی امداد کی کل رقم ۱۸۸ کروڑ روپے تھی۔ گویا کل خرچ میں غیر ملکی مدد کا تناسب ۱۰ فیصدی سے بھی کم رہا۔

اس کے پانچ برسوں بعد دوسرا پلان شروع ہوا۔ اس کا اہم ترین نشانہ یہ تھا کہ ملک میں بنیادی صنعتوں کی بنیاد رکھ دی جائے۔ ہمارے ملک کے حالات میں یہ بات ایک صنعتی انقلاب سے کم نہ تھی۔ اس لئے تمام بڑے منصوبوں کے لئے ہم باہر سے مال خریدنے پر مجبور تھے۔ اس کے باوجود

اس پلان میں بھی غیر ملکی امداد کو کوئی بنیادی حیثیت حاصل نہ ہو سکی۔ ہم نے کل ملا کر ۴۶۰۰ کروڑ روپے خرچ کئے۔ ان میں سے ۳۵۱۰ کروڑ روپے کی رقم قومی ذرائع ہی سے حاصل کی گئی۔ غیر ملکی امداد میں اس بار وہ اخراجات بھی شامل تھے جو امریکہ سے "مفت" اناج منگوانے کی زد میں آئے لیکن اس کے باوجود ان پانچ برسوں میں مغرب اور مشرق کے سب ہی ذرائع سے ملا کر ہم نے صرف ۱۰۹۰ کروڑ روپے ہی حاصل کئے۔ ان میں سے ۷۰ فیصدی سے زیادہ رقمیں قرضوں کی صورت میں حاصل کی گئیں جن پر ہمارا ملک اتنا ہی سود دیتا ہے جتنا کہ عالمی بازار میں کوئی بھی ساہوکار کسی بڑی رقم پر دے گا۔ اسی میں وہ اخراجات بھی شامل تھے جو ماہرین کی تنخواہ اور صلاح کاروں کے الاؤنس وغیرہ کی صورت میں ہمارے نام ڈال دیئے گئے۔ ان سب کے باوجود دوسرے پلان میں غیر ملکی مدد کا تناسب ۲۴ فیصدی سے بڑھ نہیں سکا۔

اب تیسرے پلان کی طرف آیئے۔ آج کل عام چرچا ہے کہ غیر ملکی مدد ہی پر اگلے تین برسوں میں مکمل ہونے والے منصوبوں کی کامیابی کا دارومدار ہو گا۔ اس سلسلے میں بنیادی طور پر سمجھنے کی بات یہ ہے کہ ہمیں دِقت غیر ملکی مدد کی نہیں ہے بلکہ غیر ملکی سکّے کی ہے۔ فرق یہ ہے کہ ضروری نہیں ہے کہ سب ہی غیر ملکی مدد غیر ملکی سکّے ہی کی صورت میں ہو۔ مثلاً روس اور دوسرے کمیونسٹ ملک تمام کاروبار اور صنعتی تعاون ہندوستانی روپے ہی سے کرتے ہیں۔ دوسری جانب یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ غیر ملکی سکّے کی تمام ضرورتیں امداد اور قرضوں ہی سے پوری کی جائیں۔ کافی حصہ ہماری اپنی اشیائے برآمد سے پورا ہو سکتا ہے۔ بہرحال یہ بھی ایک الگ موضوع ہے جس پر پھر کبھی بحث ہو گی۔ ہاں تو جہاں تک تیسرے پلان کا تعلق ہے اس پر موجودہ تخمینوں کے مطابق کل ملا کر ۱۲۰۰۰ کروڑ روپے کے لگ بھگ خرچ آئے گا۔ اس میں سے غیر ملکی امداد کا زیادہ سے زیادہ ۲۲۰۰ کروڑ روپے رکھا گیا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ یہ رقم بھی پہلی نظر میں کافی زیادہ معلوم ہو گی۔ لیکن یہ بھی نہ بھولئے کہ ہماری تعمیری کوششوں میں مشکل سے کل خرچ کے پانچویں حصے کے برابر ہو گی۔ اس میں سے ہمیں اصل میں صرف ۱۹۰۰ کروڑ کے لگ بھگ رقم ہی حاصل ہو گی۔ بقیہ رقم پرانے قرضوں کے سود، غیر ملکوں میں مقیم متعلقہ غیر ملکی عملے کی تنخواہوں اور دوسرے متفرق

اخراجات میں پہلے ہی کٹ جائے گی۔

ان تمام رقموں کو "امداد" سمجھنا ہی غلطی ہوگی۔ ان کا ۸۰ فیصدی حصہ قرضوں کی صورت میں دیا جاتا ہے۔ اس پر ہم باقاعدہ سود بھی ادا کرتے ہیں۔ یہ سود عالمی شرح سے کسی بھی طرح کم نہیں ہوتا۔ گویا بنیادی طور پر ہم مدد نہیں لے رہے بلکہ صرف "سرمایہ" خرید رہے ہیں جس کی ادائیگی ہم دھیرے دھیرے کریں گے۔

یہ رقم ان چیزوں کی خرید کے لئے ضروری ہے جو ہمارے ملک میں ہیں ہی نہیں۔ لہٰذا اگر دس میں سے دو روپے کی کمی بھی ہمیں محسوس ہوتی ہو تو اس کی وجہ سے کافی دقتیں پڑ سکتی ہیں۔ لیکن پھر بھی صورتِ حال اس قدر خراب نہیں ہے جتنی کہ بعض بڑے اخبار اور بعض سیاسی عناصر چند مخصوص مصلحتوں کی بناء پر دکھلانے کی کوشش کر رہے ہیں۔

غیر ملکی امداد کبھی بھی کسی یکمشت رقم کی صورت میں حوالے نہیں کی جاتی۔ اکثر اس کا دستور یہ ہوتا ہے کہ وہ خاص خاص پروجیکٹوں کے لئے ہر خرچ کا باقاعدہ تخمینہ بنا کر مہیا کی جاتی ہے۔ مثلاً تیسرے پلان میں غیر ملکی امداد کا زیادہ تر حصہ لوہے فولاد، کوئلے، تیل، بجلی، آبپاشی اور مشین سازی کے منصوبوں کو بڑھاوا دینے کے لئے استعمال ہوگا۔ اس میں سے جو منصوبے قومی ملکیت میں ہیں (تقریباً ۶۶ فیصدی)، ان کے لئے جتنی مدد درکار ہے اس کا تقریباً تین چوتھائی حصہ طے ہو چکا ہے۔ یہ رقم یا تو ہمیں مل چکی ہے اور یا اگلے برسوں میں مل جائے گی۔ اس میں تقریباً آدھا حصہ غیر ملکی امداد کا تقریباً ۱۵ فیصدی حصہ اس مدد کا بھی شامل ہے جو سوویت بلاک کی جانب سے ہمیں ملے گی۔

اس کے علاوہ پرائیوٹ ملکیت کے منصوبوں کے لئے بھی جس غیر ملکی مدد کی ضرورت ہوگی اس کا ۵۴ فیصدی حصہ طے ہو چکا ہے۔ ان حالات میں پریشانی یا گھبراہٹ کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی، سوائے اس کے کہ اس سے خواہ مخواہ سیاسی یا نظریاتی فائدہ حاصل کرنے کی کوشش کی جائے۔

غیر ملکی سکّے کا معاملہ کچھ الجھا ہوا ضرور ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ہم نے اب تک پاؤنڈ اسٹرلنگ ہی کے ساتھ اپنے آپ کو وابستہ رکھا تھا۔ اس علاقے میں ہماری چیزوں کی مانگ گھٹنے اور ان کی چیزوں کے بھاؤ بڑھنے سے ہماری راہ میں مشکلیں پیدا ہوتی ہیں۔ اس سال ہماری ضروریات بھی ایسی تھیں جو اگلے برسوں کے لئے بنیادی حیثیت رکھتی ہیں۔ اس لئے اندازہ ہے کہ

اس سال کل ملا کر ہمیں ۵ ارب روپے کے غیر ملکی سکے کی قرض اور امداد کی شکل میں ضرورت ہوگی۔ اس میں سے ۳ ارب کے بارے میں کوئی جھگڑا ہی نہیں۔ بقیہ رقم کے بارے میں صورت یہ ہے کہ امریکہ تقریباً ایک ارب روپے کی رقم مزید دینے کو تیار ہے بشرطیکہ دوسرے مغربی ملک بھی اتنی ہی رقم مہیا کر دیں۔ یہ ملک یہ رقم دیتے ہیں یا نہیں اس کے بارے میں فی الحال کچھ نہیں کیا جا سکتا۔ ہو سکتا ہے وہ یہاں پر اپنی سیاسی ناراضگی کا اظہار کرنے کے لئے کچھ حیل و حجت کریں۔ لیکن یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ ہندوستان کی تعمیری جنگ دولت مند ملکوں کے بنکوں اور سرکاری خزانوں کے سہارے نہیں لڑی جا رہی ہے۔ اس کی کامیابی کا دارومدار ان کی داد و دہش پر نہیں بلکہ اس بات پر ہوگا کہ ہم اپنے پیروں پر آپ کھڑا ہونے کے لئے کس حد تک محنت اور قربانی کے راستے پر کس حد تک جانے کے لئے تیار ہیں۔

یہ سمجھنا بھی بہت بڑی غلطی ہوگی کہ غیر ملکی امداد "امداد دہندگان" کی بڑی قربانی کا نتیجہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دوسری جنگ عظیم کے بعد سے جہاں پسماندہ ملکوں میں سیاسی آزادی آئی ہے وہاں آگے بڑھے ہوئے ملکوں اور پچھڑے ملکوں کے درمیان اقتصادی فاصلے اور بھی بڑھ گئے ہیں۔ یوں یہ خیال غلط ثابت ہوتا جا رہا ہے کہ غیر ملکی امداد اور پچھڑے ملکوں کی صنعتی ترقی کی بدولت دنیا میں اقتصادی مساوات کے راستے کھل جائیں گے۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ترقی یافتہ ملک اپنے عوام کا پیٹ کاٹ کر ہمیں مدد دے رہے ہیں تاکہ حاتم طائی کی روایتیں تازہ ہو سکیں انھیں اصل حقائق کا پتہ ہی نہیں۔

مثلاً جنگ کے فوراً بعد امریکہ میں فی کس سالانہ آمدنی ایک ہزار ڈالر (ایک ڈالر = چار روپے ۷۵ نئے پیسے) تھی۔ اب ڈھائی ہزار ڈالر ہے۔ گویا پندرہ برسوں میں ڈھائی گنا اضافہ ہوا۔ اس کے مقابلے میں افریقی ایشیائی پسماندہ ملکوں میں پندرہ سال پہلے فی کس اوسط آمدنی ایک سو ڈالر سالانہ تھی۔ اب تک وہ مشکل سے ڈیڑھ سو ڈالر ہو پائی ہے۔ گویا صرف ۵۰ فیصدی اضافہ ہوا۔ ہندوستان میں اضافے کا یہ تناسب تقریباً دگنا ہے۔ لیکن یہاں پر پہلے ہی آمدنی دنیا بھر میں سب سے کم تھی۔ (تمام حسابات ۱۹۴۶ کی قیمتوں کے مطابق ہیں)

جنگ کے خاتمے کے بعد دنیا کی کل تجارت میں پسماندہ ملکوں کا حصہ ۴۰ فی صدی تھا۔ ۱۹۵۳ء میں وہ ۳۱ فی صدی رہ گیا۔ پچھلے برس کے خاتمے تک عالمی تجارت میں افریشیائی ملکوں کا حصہ ۲۹ فیصدی بھی نہ رہا۔

اس فرق کی بڑی وجہ یہ تھی کہ ان ملکوں نے اپنے مشینی مال کی قیمتیں تو بڑھادیں لیکن ہم سے خریدے جانے والے کچے مال کے بھاؤ گھٹا دیئے۔ جہاں ۱۹۴۶ء کے مقابلے میں مشینی مال کی قیمتوں میں ۱/۲ ۳۳ فیصدی اضافہ ہوا وہاں کچے مال کی قیمتوں میں ۱۱ فیصدی کمی ہوگئی۔ قیمتوں کے اس ہیر پھیر کا نتیجہ یہی تھا کہ ۱۹۵۶ء - ۵۹ کے برسوں میں صرف ایشیا ہی کے سات ملکوں (ہندوستان، پاکستان، لنکا، برما، انڈونیشیا، افغانستان، نیپال) کو کل ملاکر ہر سال بارہ ارب روپے سالانہ کا نقصان ہوتا رہا۔ ظاہر ہے کہ اس میں بڑا حصہ ہندوستان کا ہوگا۔

اب اس پر طرہ یہ کہ ترقی یافتہ ملکوں نے آپس میں گروہ بندیاں کرلی ہیں۔ گویا وہ ہمیں اپنے منہ مانگے داموں پر مال بیچنا اور ہم سے کچا مال من مانی قیمتوں پر خریدنا چاہتے ہیں۔ یورپ کی مشترکہ منڈی میں برطانیہ کی شمولیت سے ہماری تجارت کو اسی لئے نقصان پہنچے گا کہ اب تک ہماری تجارت برطانوی ضروریات ہی کے مطابق تھی۔ اب یکایک ہمارے مال پر پابندیاں لگنے کی وجہ سے ہماری غیر ملکی آمدنی کم ہو جائے گی۔ اس سے غیر ملکی امداد کے لئے ہماری ضروریات اور بڑھ جائیں گی۔ ان حالات میں اگر ترقی یافتہ ممالک کچھ حد تک ہماری مشکلیں حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو اسے کوئی بہت بڑا احسان نہیں کہا جا سکتا۔ اگر واقعی ہمارے ملکوں کو دی گئی مدد ان کے لئے تکلیف دہ ہوتی تو انھیں پہلے کی نسبت کچھ کم امیر اور ہمیں کچھ کم غریب ہونا چاہیئے تھا۔ اب صورت یہ ہے کہ ہماری غربت تو کچھ حد تک کم ضرور ہوئی ہے لیکن وہ اس سے بھی کئی گنا زیادہ امیر ہو گئے ہیں۔ تجارت کی عالمی تاریخ میں اتنی بڑی شعبدہ بازی کی کوئی اور مثال مشکل ہی سے ملے گی۔

تعارف و تبصرہ

(تبصرہ کے لئے ہر کتاب کے دو نسخے بھیجے جائیں)

مکاتیب سر سید احمد خاں

مرتبہ مشتاق حسین

سائز ۲۰×۳۰/۱۶ حجم ۴۰۴ صفحات۔ مجلد، قیمت ساڑھے چھ روپے تاریخ طباعت: اکتوبر ۶۰ء
ناشر: فرنڈس بک ہاؤس۔ سول لائن۔ مسلم یونی ورسٹی۔ علی گڑھ۔

۱۹۵۶ء کی بات ہے میں دو سال کے لئے مسلم یونیورسٹی گیا، تو مشتاق حسین صاحب (اڈمنسٹریٹیو اسسٹنٹ یونیورسٹی لائبریری) سے ملاقات ہوئی، پھر اکثر ہوتی رہی۔ ان ملاقاتوں میں معلوم ہوا کہ وہ سر سید مرحوم کے خطوط جمع کر رہے ہے۔ جب ان سے تفصیلات معلوم ہوئیں اور ان کی جانفشانی اور دیدہ ریزی دیکھی تو کام کی اہمیت کا اندازہ ہوا۔ چند برسوں کے بعد مکاتیب سر سید پر ہماری زبان "میں ان کے چند مضامین پڑھے تو ان کی اہلیت اور وسعتِ معلومات کا اعتراف کرنا پڑا مگر ان کے ذوق و شوق اور ان کی تحقیق و تفتیش کا صحیح اندازہ اس وقت ہوا جب کتاب شائع ہو کر سامنے آئی۔

اس کتاب سے قبل سر سید مرحوم کے خطوط کے تین مجموعے شائع ہو چکے ہیں، جن کی تفصیل مشتاق صاحب کے الفاظ میں حسب ذیل ہے:-

"سب سے پہلا مجموعہ وحید الدین سلیم کا مرتب کردہ ہے، جو سر سید کے لٹریری اسسٹنٹ تھے۔ یہ مجموعہ حالی پریس پانی پت سے تقریباً ساٹھ سال پہلے شائع ہوا تھا۔ اب اس اشاعت کے نسخے نایاب ہیں۔ دوسرا مجموعہ راس مسعود مرحوم نے ترتیب دیا تھا۔ اس میں مرحوم نے وحید الدین سلیم کے مجموعے کے تمام خطوط جو تعداد میں پچپن تھے، شامل کر لئے (سوائے ان خطوط

کے جن میں مکتوب الیہ کا نام نہیں تھا)۔ تیسرا مجموعہ شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی نے مرتب کیا ہے جو جون ۱۹۵۹ء میں مجلس ترقی ادب لاہور سے شائع ہوا ہے۔ شیخ صاحب کے مجموعہ میں کل ۳۴۶ خط ہیں، جن میں سے ۲۴۶ خط راس مسعود والے مجموعے کے ہیں، کچھ خطوط وہ جو رسالہ معارف پانی پت کے بغیر مکتوب الیہم کے نام کے بااقساط شائع ہوئے تھے۔ ان کے علاوہ شیخ صاحب نے ان اقتباسات اور حوالوں کو بھی مستقل خط قرار دیا ہے جو مولانا حالی نے جا بجا حیات جاوید میں دئے ہیں"۔

مشتاق صاحب کے اس مجموعہ کے دو حصے ہیں۔ پہلا حصہ ۱۱ خطوط پر مشتمل ہے اور ان میں سے ایک خط بھی مذکورہ بالا تینوں مجموعوں میں نہیں ہے، دوسرے حصے میں وہ خطوط ہیں جو شیخ صاحب کے مجموعے میں بھی ہیں۔ ان کی تعداد ۴۴ ہے۔

بقول ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب" امید ہے کہ اس زمانے میں جب ہماری تعلیم اور تہذیب ایک بحرانی دور سے گزر رہی ہے، ہمارے عہد جدید کے معلم اول کے خیالات اور جذبات جو ان خطوط کے ذریعے ہم تک پہنچ رہے ہیں، ہمارے ذہن کو روشنی، دل کو حوصلہ اور دست و بازو کو وہ قوت بخشیں گے، جس سے ہم آج کے نازک اور اہم مسائل کو سمجھ سکیں اور حل کر سکیں"۔

برگِ سبز   از بانو طاہرہ سعید (بی۔ اے)

سائز ۲۰×۳۰/۱۶، حجم ۱۶۸ صفحات۔ قیمت دو روپے۔ تاریخ اشاعت: جنوری ۱۹۶۲ء
ناشر: مکتبۂ سعدی، ۱۳۴، نیو بلڈنگس۔ اعظم آباد۔ حیدرآباد دکن ۲۰

اس مجموعۂ کلام کی شاعرہ صاحبہ کا ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ نے ان الفاظ میں تعارف کرایا ہے: "بانو طاہرہ سعید صاحبہ کو حیدرآباد کے چمنستانِ ادب میں گلِ صد برگ کی حیثیت حاصل ہے۔ یہ اردو، فارسی اور انگریزی تینوں زبانوں پر ادیبانہ دسترس کی حیثیت رکھتی ہیں اور ایک باغ و بہار شخصیت کی مالک ہیں۔ چونکہ خطرطاز (اس کا املا اسی طرح کتاب میں چھپا ہے) شاعر

پیدا ہوئی ہیں، اس لئے اپنے مزاج کی رنگینی اور طبیعت کی شگفتگی کے باعث ہر محفل میں محبوب اور مقبول رہا کرتی ہیں.... ایرانی نژاد ہیں.... ایک عرصے تک وہ ایران میں تہران ریڈیو میں شعبۂ اردو کی نگراں کار اور اناؤنسر بھی رہ چکی ہیں۔" پروفیسر ہارون خاں شروانی نے موصوفہ کی شاعری کا تعارف کراتے ہوئے لکھا ہے کہ "جیسا اس انتخاب کے نام سے ظاہر ہوتا ہے، شاعرہ کو جنگل، کوہسار، پہاڑ، دریا اور فطرت کے دوسرے گوناگوں کرشموں اور مظاہروں سے دلی شغف ہے اور ان کا رجحان غزل کی بجائے نظم کی طرف زیادہ ہے۔ اس رجحان کے باعث ان کی بہت سی غزلوں میں بھی نظم کا پرتو نظر آتا ہے۔" اس تعارف کے بعد اب موصوفہ کے کلام کا انتخاب پیش کیا جاتا ہے۔ ملاحظہ ہوں:

دشمنی بس ہو چکی اب پیار کی باتیں کریں — کاش قومیں یوں نہ گیر و دار کی باتیں کریں
جس کے دامن میں بہار بے خزاں ہو جاگزیں — آؤ اک ایسے نئے گلزار کی باتیں کریں
پھول، شبنم، کہکشاں، مہتاب کیا عنواں ہیں کم — بدمذاقی ہے اگر تلوار کی باتیں کریں
طاہرہ ہرگز نہ ہوگی ختم اس کی داستاں — حشر تک بھی گر جمالِ یار کی باتیں کریں

ایک دوسری غزل کے چند شعر سنئے:-

ہاں اے جنوں نواز ہوائے بہار کیا — میری طرح سے تو بھی غزلخواں ہے آج کل
پھر وضعِ احتیاط سے اکتا گیا ہے دل — دستِ جنوں میں اپنا گریباں ہے آج کل
پھر آ رہی ہے آہ اسی بے وفا کی یاد — پھر لذتِ تصورِ جاناں ہے آج کل
پھر اس کی آرزو ہے دلِ چاک چاک میں — سینے میں آہ پھر وہی طوفاں ہے آج کل

ایک نظم بھی ملاحظہ ہو۔ اس کا عنوان ہے "اندھیرا":

کتنا گمبھیر گھٹا ٹوپ اندھیرا ہے یہاں
داغِ دل سے بھی اجالا نہیں ہونے پاتا
شعلۂ آہ بھی دیتا نہیں لو ہلکی سی
زندگی جلتی ہے مشعل نہیں جلتی کوئی

آنسو پگھلی ہوئی آتش کی طرح بہتے ہیں
ایسی آتش کہ نہیں جس میں ذرا سی بھی دمک
پر تپش ایسی کہ دوزخ بھی جھلس کر رہ جائے
کیسا اندھیر ہے، ویرانی ہے، اندھیارا ہے
رات ہی رات ہے راتوں مگر حُسن نہیں
کوئی تارا نہیں، جگنو نہیں مہتاب نہیں
اس جزیرہ میں مرا گھر ہے یہ بدبختی ہے
اور اطراف جزیرے کے ہے کالا ساگر
ڈوب جاتے ہیں سفینے جہاں امیدوں کے
کتنا گھمبیر گھٹاٹوپ اندھیرا ہے یہاں

موجِ نسیم از اختر مسلمی

سائز ۲۰×۳۰/۱۶، حجم ۱۱۲ صفحات، کتابت وطباعت عمدہ۔ مجلد، قیمت: ڈھائی روپے
تاریخ طباعت: ۱۹۶۱ء (لیکن ۶۲ء میں شائع ہوئی ہے) جناب شاعر سے پھولپور ضلع اعظم گڈھ کے پتہ پر مل سکتی ہے اعظم گڈھ رقبہ اور آبادی کے لحاظ سے ایک چھوٹا سا ضلع ہے، مگر علم وادب کی خدمت کے لحاظ سے بہت سے صوبوں پر بھاری ہے۔ اختر مسلمی صاحب اسی ضلع کے ایک ہونہار شاعر ہیں۔ ان کی شاعری کی عمر کچھ زیادہ نہیں ہے مگر ان کے کلام کی سلاست، روانی، سادگی اور خیالات وجذبات کی لطافت اور پاکیزگی کو دیکھ کر یقین ہے کہ ان کا مستقبل شاندار ہوگا۔ چند شعر ملاحظہ ہوں:-

ہے ذوقِ غم سلامت کہ اب آرزو ہے اختر — کوئی بجلیاں گرائے میں بناؤں آشیانہ
جلا کے دل میں تری شمعِ آرزو اے دوست! — ہر اک چراغِ تمنا بجھا دیا میں نے
ہائے رے ان کی نگاہِ خشمگیں — آرزوؤں کو پسینہ آگیا
اختر اب آپ کر چکے دیر وحرم میں جستجو — منزلِ عشق کا نشاں دار ورسن سے پوچھئے

طابع و ناشر: عبداللطیف اعظمی　　مطبوعہ: یونین پریس دہلی　　ٹائیٹل: دیال پریس دہلی

جامعہ

سالانہ چندہ
چھ رُوپے

قیمت فی پرچہ
پچاس نئے پیسے

جلد ۴۷ | بابت ماہ ستمبر ۱۹۶۲ء | شمارہ ۳

فہرست مضامین

خط و کتابت کا پتہ

رسالہ جامعہ، جامعہ نگر، نئی دہلی

اِک شمع رہ گئی تھی ....

ایک تقریر

جناب ضیاء الحسن فاروقی

سُننے والے نہ تھے تم سے میرے دن رات کے شکوے
کفن سرکاؤ میری بے زبانی دیکھتے جاؤ

۲ اگست کو نمبر ا کیننگ لین (نئی دہلی) میں نہ معلوم کیوں اس وقت یہ شعر میری زبان پر بے اختیار آگیا جب ہندوستان کی ایک مقتدر ہستی جس کے ہاتھوں میں اس وقت زمام اختیار ہے اپنے ایک ساتھی اور جنگ آزادی کے بہادر سپاہی کے جنازہ کے سامنے خاموش کھڑے ہوکر عقیدت کے پھول پیش کر رہی تھی، آپ جانتے ہیں کہ اس سے میری مراد کیا ہے اور میں نے کس کی 'بے زبانی' کی طرف اشارہ کیا ہے —— اس کی بے زبانی جو گفتار ہی کا غازی نہیں بلکہ کردار کا غازی بھی تھا، اور جس کی شخصیت پر مجاہد ملت کا خطاب اسی طرح زیب دیتا تھا جس طرح مولانا حسین احمد مدنی، اور مولانا ابوالکلام آزاد کی شخصیتوں پر شیخ الاسلام اور امام الہند کا۔

حضرات! مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن کا انتقال ہوگیا یعنی وہ شمع خاموش ہوگئی جس کی روشنی میں ہمارا درماندہ کارواں اب دھیرے دھیرے آگے بڑھ رہا تھا، وہ انسانی سہارا جاتا رہا جو حالات کی اندھیاریوں میں امید کی کرن بن کر چمکتا تھا، لوگوں کی مصیبتوں کو سن کر تڑپ جانے والا ایک دل تھا جو ٹھہر گیا، آزادی اور دیانت کی ایک آواز تھی جو ڈوب گئی، فکر و عمل کا ایک آفتاب تھا جو غروب ہوگیا۔

مولانا مرحوم کا جنازہ کیننگ لین سے قوم اپنے کاندھوں پر اٹھا کر فیروز شاہ کوٹلہ

کے بڑے میدان میں لائی اور پھر اُسے مہندیوں کے احاطے میں محصور اُس شہر خموشاں میں سپرد خاک کردیا جہاں شاہ ولی اللہؒ اور ان کے خانوادہ اور سلسلہ کے لوگ ابدی نیند سو رہے ہیں؛

پہنچی وہیں یہ خاک جہاں کا خمیر تھا

ہزاروں انسانوں کا ایک ہجوم تھا جو ملت کے اِس مجاہد رہنما کو دل کی تمام سوگواریوں کے ساتھ رخصت کرنے آیا تھا، اور اس ہجوم میں میری نظر تصور یہ بھی دیکھ رہی تھی کہ مولانا مرحوم کے جنازہ کے ساتھ دو سو سال کی تاریخ بھی تھی جو اسے نئی دہلی سے مہندیوں کے احاطہ تک رخصت کرنے آئی تھی، یہ اس لئے کہ مولانا اس عہد میں اسی سلسلہ کی ایک کڑی تھے جو شاہ ولی اللہ کے افکار وخیالات سے شروع ہوتا ہے اور جس کا دامن ان گنت انقلابی سیاسی، تعلیمی اور مذہبی تحریکوں پر پھیلا اور پھیلا ہوا ہے۔

مولانا نے ابتدائی تعلیم اپنے وطن سیوہارہ (ضلع بجنور) میں پائی اور اس کے بعد وہ دنیائے اسلام کی مشہور درسگاہ دار العلوم دیوبند میں داخل ہوگئے۔ یہ پہلی جنگ عظیم کا زمانہ تھا اور اگرچہ شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی انقلابی تحریک ناکام ہوچکی تھی لیکن دار العلوم دیوبند کی فضا اس کی گرمی سے معمور تھی، اس فضا کا مولانا کے حساس دل ودماغ پر گہرا اثر پڑا، اور ان میں آزادی اور اس کی برکتوں کا شعور پوری طرح جاگ اٹھا یہاں تک کہ جب ۱۹۲۰ء کی تحریکیں شروع ہوئیں تو مولانا عہد شباب کے پورے جوش وخروش کے ساتھ ان میں شامل ہوگئے اور قید وبند کی منزل سے گذرے، قید فرنگ سے آزاد ہوئے تو پہلے انھوں نے دار العلوم کے نصاب کی تکمیل کی اور پھر وہیں ایک بوریئے پر بیٹھ کر درس دینے لگے، لیکن اس زمانے میں بھی وہ اپنے بزرگوں کے نقش قدم پر چلکر، کانگرس، خلافت اور جمعیۃ العلماء ہند کے تحت مختلف تحریکوں میں حصہ لیتے رہے، کہا جاتا ہے کہ ان کی عمر کے پندرہ سال درس وتدریس میں، پانچ سال قید فرنگ میں اور باقی حصہ ملک وملت کی خدمت میں گذرا۔

مولانا کی شخصیت کا کمال یہ رہا ہے کہ اس میں دین ودنیا، مذہب اور عقل، یعنی

دوسرے لفظوں میں جام شریعت، اور سندان عشق، کا ایک ایسا خوشگوار امتزاج پیدا ہوگیا تھا جو اس زمانہ میں خال خال اشخاص کے یہاں ملتا ہے، انھوں نے ایک طرف علماء دیوبند کی پُروقار مجاہدانہ روایات کے ساتھ، گاندھی جی اور جواہر لال نہرو کے دوش بدوش مل کر، آزادی کی لڑائی لڑی تھی، آزادی کے بعد پنڈت نہرو کا ایک بازو بن کر، سوشلزم کی بنیادوں پر نئے ہندوستان کی تشکیل و تعمیر میں لگے ہوئے تھے، سیکولرزم کے حامی تھے اور اس کا جرأت کے ساتھ پرچار کرتے تھے، دوسری طرف وہ جمعیۃ العلماء جیسی مذہبی جماعت کے ناظم اعلیٰ ہی نہیں بلکہ روح رواں تھے، مکاتب، مدارس اور دینی تعلیم کے پروگراموں کو چلاتے تھے، مسجدوں، خانقاہوں اور قبرستانوں کو واگذار کراتے تھے اور ان سے متعلق اوقاف کو بچانے میں رات دن مصروف رہتے تھے، ایک طرف وہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اور جامعہ ملیہ اسلامیہ جیسے تعلیمی اداروں میں جہاں دنیوی تعلیم دی جاتی ہے، اپنی شخصیت کا سایہ ڈالتے رہتے تھے تو دوسری طرف دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے ایک بہت ہی اہم رکن تھے، اس طرح وہ بیک وقت مختلف النوع مذہبی و سیاسی، تعلیمی و ثقافتی، لسانی، تصنیفی انجمنوں اور اداروں کے فعّال رکن تھے اور ہر جگہ قائد کی حیثیت رکھتے تھے، آزادی سے پہلے بھی اور آزادی کے بعد خاص طور سے ملک و ملت کی تاریخ پر ان کی شخصیت ان کی ان تھک جد وجہد، اُن کی ذہانت، ان کی معاملہ فہمی اور ان کی گہری اور اثر آفریں انسانیت کی چھاپ ہے، اس تاریخ کا مطالعہ ان کی شخصیت کے مطالعہ کے بغیر نامکمل رہے گا۔

مولانا کی شخصیت کی سب سے نمایاں خصوصیت اُن کی جرأت اور بے خوفی تھی، حقیقت یہ ہے کہ وہ خدا کے سوا اور کسی سے نہیں ڈرتے تھے، ہم سب مذہبی انسان یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم خدا کے سوا اور کسی سے نہیں ڈرتے، لیکن حق یہ ہے کہ ہم خدا کے سوا سب سے ڈرتے ہیں، اُس زمانہ میں جب کہ بڑے بڑے قومی رہنما گوشہ نشین ہوگئے تھے اور اپنی کمزوریوں پر حالات کی ناساعدت یا مصلحت کا پردہ ڈال کر مطمئن ہو بیٹھے تھے،

ایک آواز بھی جو ملک کے گوشہ گوشہ میں گونجتی تھی، ایک عشق تھا جو بے خطر تغیرات و انقلابات کی آگ میں کود پڑا تھا، ۱۹۴۷ء اور اس کے بعد کے پیچیدہ اور نازک زمانے میں ایک شخص تھا جو بہادری سے کہتا تھا کہ وہ مسلمان ہے اور ہندوستانی ہے، ۱۹۴۷ء کے فسادات میں جب حالات قابو سے باہر ہو گئے تھے اور اس کے غیر مسلم ساتھیوں نے اس خیال سے کہ یہ شخص بھی فسادات کی نذر نہ ہو جائے، یہ مشورہ دیا تھا کہ وہ کہیں پناہ گزیں ہو کر بیٹھ جائے تو معلوم ہے کہ اس شخص نے کیا جواب دیا تھا، اس نے کہا تھا کہ جس وطن کی آزادی کے لئے میں نے جد وجہد کی تھی، اسی وطن میں آج میں شرنارتھی بن کر رہوں، یہ مجھ سے نہیں ہو سکتا، جس زندگی کو میں اس طرح بھاگ کر بچانے جاؤں گا وہ کس مصیبت کی ہوگی آپ لوگ کیا باتیں کرتے ہیں، یہ موقع جان دینے کا ہے یا جان بچانے کا۔

لیکن مولانا میں محض جرأت و بے خوفی ہی نہیں تھی، آپ کو آج بھی خود جمعیۃ العلماء میں بہت سے نڈر سپاہی اور رضا کار مل جائیں گے۔ مولانا کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ جرأت کے ساتھ ساتھ ہوش وسلیقہ بھی رکھتے تھے، بات کتنی ہی سچی ہو اور کتنی ہی بیباکی سے کیوں نہ کہی جائے، اگر کہنے کا سلیقہ نہیں تو بے اثر ہو کر رہ جاتی ہے، مولانا کو بات کہنے کا سلیقہ تھا اور یہی وجہ ہے کہ جب وہ کوئی بات کہتے تھے تو وہ سُنی جاتی تھی اور اس کا اثر ہوتا تھا۔ مولانا ایک بڑے خطیب تھے اور ان کی خطابت میں بلا کی صلابت تھی، اس صلابت اور اس کی سحر آفرینی کا سرچشمہ ان کی حق پرستی اور قوت ایمانی تھی، وہ وہی بات کہتے تھے جسے وہ حق سمجھتے تھے اور جس کی سچائی پر اُن کا ضمیر مطمئن ہوتا تھا اور یہی وجہ ہے کہ جب وہ کوئی بات اپنے خاص اسلوب میں، اپنی پوری شان خطابت سے کہتے تھے تو سننے والوں کے ذہن کی گرہیں کھل جاتی تھیں، کتنے دل ہوتے تھے جو تڑپ اٹھتے تھے اور کتنے ضمیر ہوتے تھے جو بیدار ہو جاتے تھے۔

ابھی بہت دن نہیں ہوئے اور وہ معرکہ ہم سب کو یاد ہے جو اس برّ صغیر میں مسلم لیگ کے دو قومی نظریئے اور مطالبۂ پاکستان کے سلسلہ میں گرم ہوا تھا، آپ جانتے

ہیں کہ مسلمانوں کو لفظِ اسلام سے کتنا گہرا جذباتی تعلق ہے، یہ نظریہ اور یہ مطالبہ اس طرح پیش کیا گیا تھا کہ گویا اس وقت سارا اسلام یہی تھا۔ مولانا نے اپنے بزرگوں کی رہنمائی میں یہ چیلنج قبول کیا اور گاؤں گاؤں پھر کر اس کی نفی کی، مسلمانوں کا یہ حال تھا کہ ایسے لوگوں کو وہ اپنا دشمن سمجھتے تھے اور ان کی تذلیل و اہانت اسلام کی خدمت تصور کرتے تھے، اپنے ہی ہم مذہبوں کے خلاف اس طرح ڈٹ جانا کوئی آسان کام نہیں، بڑا مجاہدہ ہے یہ، ایمان کی بڑی آزمائش ہے اس میں، مولانا ہندوستان کی تقسیم کو تو نہیں روک سکے لیکن انھوں نے حق شناسی اور بے باکی کی ایک مثال قائم کردی، تقسیم کے بعد جو صورت حال سامنے آئی اس نے دو قومی نظریئے کا کھوکھلا پن ثابت کردیا، جس چیز کو مسلمان عین ایمان سمجھ بیٹھے تھے محسوس ہوا کہ وہ باطل تھی، جنھیں وہ اپنی کشتی کا ناخدا سمجھتے تھے، معلوم ہوا کہ وہ انھیں منجدھار میں چھوڑ کر دوسرے کنارے پر پہنچ گئے، جس زمین پر انھوں نے اپنے خوابوں کے محل تعمیر کئے تھے، وہ زمین کھسکتی ہوئی محسوس ہوئی، یہ صورت حال ایسی تھی جس نے مسلمانوں کو کہیں کا نہیں رکھا، کروڑوں انسانوں کے اس ملک میں اُن کی حالت اُن جلی ہوئی لکڑیوں کی مانند ہوگئی جنھیں قافلے صحرا میں جلا کر چھوڑ جاتے ہیں، نتیجہ وہی ہوا جو ہونا تھا، ان کا روحانی اضطراب اور ذہنی انتشار انتہا کو پہنچ گیا اور بے اعتمادی اور خوف کی وہ فضا پیدا ہوگئی جس کی مثال مسلمانانِ ہند کی تاریخ میں ۱۸۵۷ء کے بعد نہیں ملتی، ایسے نازک وقت میں حفظ الرحمٰن مسلمانوں کی کشتی کے نگہبان بن گئے، مرکزی دفتر جمعیۃ العلماء میں بیٹھ کر، ملک کے کونے کونے میں جاکر، پارلیمنٹ میں غرض ہر جگہ پہنچ کر ایسے ایسے حوصلہ بخش بیانات دئے اور ایسی ایسی ولولہ انگیز تقریریں کیں کہ مسلمانوں میں زندہ رہنے کا حوصلہ ایک بار پھر پیدا ہوگیا۔

مولانا کی ایک اور نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ وہ مایوس ہونا نہیں جانتے تھے اور قنوطیت اور احساس کمتری کے سخت دشمن تھے، عثمان فارقلیط صاحب نے صحیح کہا ہے کہ

مولانا کا ایمان تھا کہ اسلام اور عزت نفس لازم ملزوم ہیں، کسی امت کا تباہ ہو جانا اتنا افسوسناک نہیں جتنا کہ اس کا احساس کمتری میں مبتلا ہونا، عزت نفس کی موت احساس کمتری کی زندگی سے ہزار درجہ بہتر ہے حضرت مولانا کو احساس کمتری کے نام سے چڑھ تھی، آپ جہاں جاتے اس خطرناک جذبہ کی سختی کے ساتھ مذمت کرتے، مرکزی دفتر جمعیۃ العلماء میں لوگوں کا ہجوم رہتا اور آپ برابر گفتگو کرتے رہتے اور انداز بیان ایسا اختیار کرتے گویا احساس کمتری کو چیلنج کر رہے ہوں، اگر ایڈیٹر الجمعیۃ کے قلم سے کسی اداریہ میں احساس کمتری کی جھلک نظر آجاتی تو آپ اس پر سخت تنبیہہ کرتے اور فرماتے کہ ہماری زندگی تو اس جذبہ کے خلاف جہاد کرنے میں گذری ہے، اگر جمعیۃ العلماء کا ترجمان بھی یہ جذبہ پیدا کرنے لگے تو مسلمانوں کو اس دلدل سے نکالنے کے لئے کون آئے گا اور پوری امت کا انجام کیا ہوگا ؟

مولانا نے یہ وطیرہ کبھی نہیں اختیار کیا کہ حکومت وقت کی خوشنودی کے لئے اور اپنی سیکولرزم کے دکھلاوے کے لئے یہ کہیں کہ یہاں ہندوستان کے مسلمانوں کو مشکلات کا سامنا نہیں ہے اور ان کا کوئی مسئلہ نہیں ہے، انھوں نے کھلے بندوں بار بار اس بات کو کہا کہ مسلمانوں کے سامنے بڑی مشکلات ہیں، پچھلے سال کے مسلم کنونشن میں انھوں نے مسلمان نما ہندوں کے ساتھ مل کر مسلمانوں کی شکایات کا ایک دفتر تیار کیا۔ مسلم کنونشن جن حالات میں ہوا وہ ہم کو معلوم ہے، کس طرح مختلف حلقوں سے اس کے انعقاد کی مخالفت ہوئی، طنز و تشنیع کا ایک محاذ تھا جو مختلف جماعتوں نے اس کے خلاف قائم کر لیا تھا اور غالباً حکومت بھی اس کو مناسب نہیں سمجھتی تھی، لیکن مولانا نے کسی کی پروا نہیں کی، کنونشن ہوا اور جس مقصد کے لئے منعقد ہوا تھا وہ مقصد مولانا نے پورا کر کے دکھایا۔

مولانا مسلمانوں کی مشکلات بیان کرتے تھے لیکن اس کے ساتھ وہ اس بات کو پرزور طریقہ سے کہتے تھے کہ ان مشکلات کو ہم ہی حل کر سکتے ہیں، کوئی دوسرا ملک یا دوسری جماعت انھیں نہیں حل کر سکتی، ہاں دوسرے ہماری پریشانیوں میں اضافہ کر سکتے ہیں، جب وہ یہ کہتے تھے تو بلاشبہ ان کے سامنے پاکستان کا رویہ ہوتا تھا۔ اس طرح مولانا نے بے جا تملق کی فضا کو صاف کیا اور ان کی حق پرستی نے زمانہ ساز اور اقتدار کے بھوکے مسلم رہنماؤں کو رسوا کیا۔ انھوں نے حکومت پر سخت سے سخت تنقید کی اور اس طرح مسلمانوں اور باہر والوں پر واضح کیا کہ ہندوستان میں جمہوریت

اور اظہار خیال کی آزادی ہے۔ مولانا ہندوستان کی جمہوریت اور سیکولرزم کی آبرو بن گئے تھے۔
مسلمانوں کی جماعتی زندگی کی یہ خصوصیت نئی تعلیم والوں کے لئے ایک لمحہ فکریہ مہیا کرتی ہے کہ اب تک اس قوم کی کوئی عظیم الشان خدمت انجام دی ہے تو انہیں لوگوں نے دی ہے جنھوں نے مکتبوں اور مدرسوں میں چٹائیوں پر بیٹھ کر تحصیل علم کیا تھا، مولانا ایک غریب اور گمنام خاندان کے چشم و چراغ تھے، تعلیم بھی انھوں نے پرانے طرز کی پائی، لیکن کام وہ کر گئے جو کالج اور یونی ورسٹیوں میں تعلیم پانے والوں سے نہ ہو سکا۔ کیا اسے ہم مکتب کی کرامت، کہہ سکتے ہیں؟ بلاشبہ یہ فیضانِ نظر تھا۔

حضرت مجاہد ملت صرف مسلمانوں ہی کے لیڈر نہیں تھے، درحقیقت وہ ملک کے ایک بڑے رہنما تھے، وہ قومی مسائل میں پوری دلچسپی لیتے تھے، ان کے پاس غیر مسلم حضرات بھی اپنے مسائل لے کر آتے تھے اور خواہ وہ مسائل حل ہوں یا نہ ہوں، مطمئن ہو کر جاتے تھے، وہ مسلمانوں کے مسائل کو خاص طور سے پیش کرتے تھے مگر محض اس خیال سے نہیں کہ وہ مسلمان ہیں بلکہ اس یقین کے ساتھ کہ مسلمانوں کے مسائل کے حل میں ملک اور قوم کی نیک نامی ہے، جمہوریت کی کامیابی ہے، سکولرزم کی جیت ہے، یقیناً وہ ایک سچے محب وطن تھے۔

مولانا کی طبیعت میں فقیروں کی سی سادگی اور بوریہ نشیں بزرگوں جیسا انکسار اور وقار تھا، وہ ایک ایسے درویش تھے جس کی خانقاہ میں کوئی دربان نہیں ہوتا، دہلی میں جمعیۃ کا دفتر اس درویش کی خانقاہ تھی جس کے دروازے موافق اور مخالف، امیر و غریب، مسلم و غیر مسلم، مقیم اور مسافر سب پر ہر وقت کھلے رہتے تھے، لوگ دور دور سے آتے، ایک گوشے میں اپنا سامان رکھتے اور پوچھتے مولانا حفظ الرحمٰن کہاں ہیں؟ مولانا موجود ہوتے تو سلام کرکے ان کے پاس بیٹھ جاتے، بس اپنی بات کہنے اور اگر جی چاہے تو اس خانقاہ میں قیام کرنے کے لئے اتنا کافی تھا، مولانا موجود نہ ہوتے تو لوگ کئی کئی دن ان کا انتظار کرتے اور دفتر میں قیام کرتے، مولانا ہر طرح کے لوگوں سے ایک ہی طرح ملتے اور سب کے مسائل کو کمال توجہ سے سنتے اور اُن کے حل کی تدبیریں سوچتے اور بتاتے اور

جتنا ہو سکتا اتنا کرنے کے لئے خوشی سے تیار رہتے ——— مولانا نے اپنی امنگوں کو قوم کی امنگوں سے، اپنی ضرورتوں کو قوم کی ضرورتوں سے کچھ اس طرح ہم آہنگ کر دیا تھا کہ ان کی انفرادی زندگی جماعتی زندگی اور جماعتی زندگی ان کی انفرادی زندگی بن گئی تھی درویش صفت عوامی رہنما کی یہی شان ہوتی ہے اور یہی شان باقی و قائم رہتی ہے۔

آج مولانا ہم میں نہیں رہے، لیکن وہی دارالعلوم دیوبند ہے، وہی جامعہ ملیہ ہے، وہی مسلم یونی ورسٹی ہے، وہی ندوۃ العلماء ہے، وہی زمین اور وہی آسمان ہے، آفتاب اسی طرح چمکے گا اور چاند اپنی چاندنی سے فضا کو اسی طرح منور کرے گا ——— دیکھنا یہ ہے کہ اب اس آب و گل سے پھر کسی حفظ الرحمٰن کی تخلیق ہوتی ہے یا نہیں!

جرمنی کا ایک اور سفر

پروفیسر محمد مجیب

لوگ کسی کو ایک با اثر دینی عالم قرار دیکر جرمنی جانے اور وہاں کے حالات سے متاثر ہونے کی دعوت دیں تو اسے کیا کرنا چاہیئے؟ جرمنی سفارت خانے سے مجھ تک یہ خبر پہنچائی گئی کہ جرمن حکومت کا شعبہ اطلاعات مجھے ہندوستانی مسلمانوں کے دینی عالموں کے نمائندے کی حیثیت سے دو ہفتہ کے لئے جرمنی بلانا چاہتاہے تو میں نے سچ بولنے کی کوشش کی، اور یقین دلانا چاہا کہ میں دینی عالم نہیں ہوں، مگر اب حال یہ ہے کہ جو شخص مذہب کا ذرا بھی احترام سے ذکر کرتاہے وہ مذہبی سمجھا جاتاہے اور اگر وہ پڑھا لکھا بھی ہو تو خود بخود دینی عالم بن جاتاہے۔ مجھے جرمن سفارتخانے جانے کے بعد بہت جلد معلوم ہو گیا کہ سچ بولنے سے کوئی فائدہ نہیں، دعوت قبول کر لینا چاہیئے مگر دینی عالم نہ ہونے پر اصرار کرتے رہنا چاہیئے۔

اس میں بھی کامیابی نہیں ہوئی۔ طہران سے آغا عباس مہاجرانی ہوائی جہاز پر سوار ہوئے اور بیروت میں انھوں نے مجھ سے پوچھا کہ کیا آپ بھی جرمن حکومت کی دعوت پر جرمنی جا رہے ہیں؟ انکار کیسے کرتا۔ مہاجرانی صاحب مجتہدوں کے لباس میں تھے، مگر انھیں سفر کی سب شرطیں منظور تھیں۔ مزاج میں شوخی بھی تھی۔ میں نے پوچھا کہ آپ کس ادارہ سے تعلق رکھتے ہیں تو جواب دیا کہ ہمدان میں پیدا ہوا،

بے شک ایں ترک پری چہرہ کہ من می بینم
عاقبت فتنۂ شہر ہمداں خواہد بود

اور اب طہران میں رہتا ہوں،

شہر طہراں گر بسوزد از حرارت دور نیست
چونکہ از ہر کوچہ آتش صد آفتاب آید بروں

استنبول کے ہوائی اڈے پر مہاجرانی صاحب کی دو ترک دوستوں سے ملاقات ہوئی انھوں نے میرا بھی تعارف کرایا۔ ترکوں میں سے ایک جنرل سعدالدین بیقرن، انقرہ یونیورسٹی کے استاد اسلامیات تھے، دوسرے حفظ الرحمٰن اُدے مِن، شعبہ تعلیمات کے پروفیسر، دونوں یورپی لباس میں تھے، وضع قطع بھی یورپی تھی۔ جنرل بیقرن ۳۵ برس فوج میں رہ چکے تھے۔ درہ دانیال میں مصطفےٰ کمال کے ماتحت لڑے تھے، مگر ملازمت کے دوران میں رات کو دینی کتابوں کا مطالعہ کرتے رہے تھے۔ اب میں کیسے کہتا کہ میں دینی علوم سے بالکل ناواقف ہوں، غلط فہمی میں نمائندہ بنا دیا گیا ہوں۔ میونخ کے ہوٹل میں پہنچنے کے بعد دو قبائیں اور نظر آئیں، ایک مفتی عبدا لو غوشہ کی، جو دمشق کی مسجد کے امام تھے، اور دوسری احمد شمیل کی، جو جدہ سے آئے تھے وہ ایک ادارہ کے صدر ہیں جس کا نام "امر بالمعروف ونہی عن المنکر" ہے۔ شکل صورت سے معلوم ہوتا تھا کہ ان کی زبان کو امر بالمعروف سے اور آنکھوں کو نہی عن المنکر سے کوئی نسبت نہیں۔ مہمانوں میں دمشق کی یونیورسٹی کے شعبہ دینیات کے صدر محمد مبارک صاحب بھی تھے۔ یہ اپنی بیوی کو بھی ساتھ لائے تھے جن کا لباس یورپی مگر شرعی تھا، یعنی ان کے سر پر ہر وقت ایک رومال بندھا رہتا تھا اور موزے عام فیشن کے خلاف موٹے اور گہرے رنگ کے تھے۔ ان کے چہرے سے معلوم ہوتا تھا کہ مدت سے مردوں کی صحبت میں خاموش اور ساکت بیٹھنے کی مشق کرتی رہی ہیں۔ مبارک صاحب نے پہلی شام سے ہی "علماء" کی نمائندگی اپنے ذمہ لے لی، مگر مفتی عبدالو غوشہ برابر مقابلہ کرتے رہے اور کبھی کبھی اپنی وجاہت اور قبا کی وجہ سے بازی بھی لے گئے۔ ہماری جماعت میں سب سے زیادہ خاموش انڈونیشیا کے نمائندے پروفیسر مسدد تھے۔ پورے سفر میں انھوں نے کسی عورت کی طرف نظر نہیں اٹھائی، اپنی بیوی اور پندرہ بچوں کو یاد کرتے رہے۔ مراکش کی فیض یونیورسٹی سے داؤد صاحب آئے تھے، جن کے علم اور ذوق کا کوئی اندازہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ لبنان کے ایک نمائندے جرمن سفارتخانہ کے ملازم، دوسرے مریض تھے۔

مسلمان عالموں کو جرمنی بلانے اور وہاں کے حالات سے مطلع کرنے کے دو مقصد تھے،

ایک سیاسی اور دوسرا مذہبی۔ سیاسی مقصد کمیونسٹوں کی زیادتیوں اور خاص طور پر برلن شہر کو دیوار بنا کر دو حصوں میں تقسیم کرنے کی کارروائی کے خلاف ذہنی اور اخلاقی احتجاج میں شریک کرنا تھا۔ مذہبی مقصد یہ تھا کہ عیسائیوں اور مسلمانوں کے درمیان جو غلط فہمیاں اور اختلافات چلے آرہے ہیں ان کو دور کیا جائے۔ سیاسی مقصد سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں تھی، بلکہ دو چار دفعہ میں نے ایسی باتیں بھی کہہ دیں جن سے معلوم ہو گیا کہ میں عداوت کا جذبہ پیدا کرنے کے خلاف ہوں، اس لئے کمیونسٹوں پر خواہ مخواہ اعتراض کرنے میں شریک نہیں ہو سکتا۔ دینی مسائل پر گفتگو جب بھی ہوئی بہت دلچسپ ہوئی۔

مجھے رفتہ رفتہ اندازہ ہوا کہ جب محکمۂ اطلاعات میں مسلمان عالموں کو دعوت دینے کی تجویز پر غور کیا گیا تو لوگوں کو اس کا اندیشہ تھا کہ مسلمان عالم یا تو آئیں گے نہیں یا آئے تو بات بات پر جھگڑا کریں گے۔ مگر ہوا اس کے برعکس۔ مصر اور پاکستان کے سوا ہر ملک سے لوگ آئے، اور ان کے درمیان کسی قسم کا اختلاف پیدا نہیں ہوا عیسائی پادریوں کو البتہ مسلمانوں سے مذہبی مسائل پر گفتگو کرنے میں تامل تھا، اور رومن کیتھلک سے زیادہ پروٹسٹنٹ پادریوں کو۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ رومن کیتھلک لوگ عقائد کے معاملے میں متحد اور متفق ہیں، پاپائے روم نے اب سے پچاس برس پہلے جدید علوم اور مذہبی عقیدوں کے درمیان مطابقت پیدا کرنے کی تحریک کو روک دیا تھا اور علوم کی ترقی نے یہ ثابت نہیں کیا ہے کہ پاپا کا یہ حکم غلط تھا۔ پروٹسٹنٹ فرقوں کے عالم حالات سے متاثر ہوتے رہے، اور اب وہ سوچتے ہیں کہ مذہب اور سماجی ماحول کے درمیان مطابقت کی کوشش کس شکل میں اور کہاں تک کی جائے۔ ان کے پیرو دیکھتے ہیں کہ وہ کسی مقام پر ٹھہرتے نہیں ہیں اور انھیں اس سے بے چینی ہوتی ہے۔ پروٹسٹنٹ پادریوں کو مسلمان عالموں سے ملاقات کرنے میں کوئی تکلف نہیں تھا، مگر اس کا بہت ڈر تھا کہ بعد کو ان پر بیجا آزاد خیالی کا الزام لگایا جائے گا۔

مسلمان عالم مذہبی بحث نہ چاہتے تھے نہ اس کے لئے تیار ہو کر آئے تھے۔ وہ اس پر خوش ہوتے رہے کہ اکثر جرمن مقرروں نے، جن میں سیاسی اور مذہبی لوگ دونوں شامل تھے، مسلمانوں کی چھ سات سو برس پہلے کی علمی خدمات کی تعریف کی۔

لیکن اب سوال تاریخ کو صحیح طور پر پیش کرنے کا نہیں ہے، اب اصل مسئلہ مختلف مذہبوں کے ماننے والوں کے درمیان ایسی مفاہمت پیدا کرنا ہے جس سے دنیا کے تمام ملکوں میں عام زندگی کو دین اور دینداری سے متاثر کیا جا سکے، اور نئے آلات جنگ اور سماجی رجحانات نے ہلاکت کے جو امکان پیدا کئے ہیں ان کا تدارک کیا جا سکے۔ چین اور جاپان کے بدھ متی اس بات پر خوش معلوم ہوتے ہیں کہ ان کے مذہب میں عقائد کی کوئی شرط اور پابندی نہیں ہے وہ صرف آداب زندگی کا مجموعہ ہے۔ ہندو اس بات پر فخر کرتے ہیں کہ ان کے دھرم میں انسان کے ذہن کو بالکل آزاد چھوڑ دیا گیا ہے اور عقائد کے معاملے میں جو رواداری ہندوؤں میں پائی جاتی ہے کسی مذہب کے ماننے والوں میں نہیں ملتی۔ مسلمان اور عیسائی دیندار اسی کو سمجھتے ہیں جس کے عقیدے صحیح ہوں۔ ان کے مختلف فرقوں کے درمیان اختلافات ہیں جو کبھی بالکل محسوس نہ ہوں تو کبھی بہت شدید بھی ہو جاتے ہیں، لیکن مسلمانوں میں تصوف اور عیسائیوں میں معاشی انقلابات نے انسان کے ذہن کو جس طرح آزاد کیا ہے اس کی مثال اور مذہبوں میں نہیں ملتی لیکن جب مذہب کا ذکر آتا ہے تو مسلمانوں کا خیال فوراً شریعت کی طرف جاتا ہے اور عیسائی کا اس کلیسا کی طرف جس کا وہ پیرو ہے یا ان کلیساؤں کی طرف جن کا وہ مخالف ہے دنیا میں کہیں بھی جب بھلے آدمی ساتھ بیٹھتے ہیں تو بہت آسانی سے اس پر متفق ہو جاتے ہیں کہ سب مذہب حق پر ہیں اور سب اچھی زندگی کی تعلیم دیتے ہیں، اس لئے کہ بھلے آدمیوں کا تعصب برتنا اور اختلافات پر زور دینا مناسب نہیں سمجھا جاتا ہے۔ لیکن دنیا کے ہر ملک میں تعصب کی مختلف شکلیں نظر آتی ہیں یا دینی اور اخلاقی اصولوں کی ایسی نمایاں بے قدری ہے جس کے ہوتے ہوئے رواداری کا ذکر کرنا مضحک سا معلوم ہوتا ہے۔ علم پر بھروسا کرنے والے کہتے ہیں کہ انسان کی سلامتی کے لئے عقیدے اور مذہب میں دوبارہ گرفتار ہو جانا ہرگز ضروری

یا مفید نہیں ہے، تندرستی، خوشی اور خوشحالی کا جو سامان سائنس اور آزاد تجارت نے پیدا کر دیا ہے نہ ایک لحاظ سے اس نظریے کی تائید کرتا ہے، اور خود انسانی ذہن کو اس درجہ متاثر کر چکا ہے کہ مذہب کو اہمیت دینا زبردستی کی بات معلوم ہوتی ہے۔ لیکن دنیا مذہب کو نہیں چھوڑنا چاہتی یا مذہب دنیا کو نہیں چھوڑنا چاہتا۔ ہانوور میں میری پروفیسر ایکرٹ سے ملاقات ہوئی، جو میری درخواست پر مسلمان عالموں سے ملنے کے لئے بلائے گئے تھے، اور انھوں نے میری اس تجویز کو بہت پسند کیا کہ جرمنی میں عیسائی اور مسلمان علمائے دین کی ایک کانفرنس کی جائے جو دینی تعلیم کی نئی تشکیل کے مسئلے پر غور کرے۔ وہ بہت با اثر آدمی ہیں اور غالباً ایسی کانفرنس کا سال ڈیڑھ سال کے اندر انتظام کر لیں گے۔ مونسٹر کی یونیورسٹی میں پروفیسر تیشنر سے ملاقات ہوئی۔ یہ قریب اسّی برس کے ہیں، صورت شکل نورانی ہے، اور اب یونیورسٹی کے اعزازی پروفیسر ہیں۔ میں نے ہندوستان میں ان کا فتوت پر ایک مضمون پڑھا تھا ان کا نام سنتے ہی میں ان کے پاس گیا۔ اپنا تعارف کرایا اور ان کے مضمون کی تعریف کی وہ سچے عالم ہیں، اور اپنا شوق یہ سوچے بغیر پورا کرتے رہتے ہیں کہ کوئی ان کے مضامین اور کتابیں پڑھتا ہے یا نہیں۔ پھر بھی میری زبان سے اپنی تعریف سن کر خوش ہوئے اور کہا کہ میرا موضوع ایسا ہے جس سے شاذ و نادر کسی کو دلچسپی ہوتی ہے۔ میں نے ان کے اور مضامین اور کتابیں پڑھنے کا اشتیاق ظاہر کیا تو انھوں نے کہا کہ اچھا، آج شام کو مجھے آپ لوگوں کے ساتھ کھانا کھانے کو بلایا گیا ہے، میں نے جو چیزیں لکھی ہیں ان کی فہرست لیتا آؤں گا۔ شام کو آتے ہی انھوں نے مجھے ایک لفافہ دیا جس میں ایک لمبی، ٹائپ کی ہوئی فہرست رکھی تھی، جو انھوں نے خود میری خاطر ٹائپ کی تھی۔ میں نے پوچھا کہ اگر میں آپ کے کسی مضمون کا اردو میں ترجمہ کرنا چاہوں تو آپ کے نزدیک کون سا مناسب ہوگا اس پر انھوں نے مضمون کا عنوان بتایا، اور یہ بھی کہا کہ مضمون الگ سے چھپ چکا ہے، میں ایک نسخہ آپ کو بھیج دوں گا (یہ غالباً ہوائی ڈاک سے بھیجا گیا اور مجھ سے پہلے ہندوستان پہنچ گیا)۔ فتوت پر عربی، فارسی، ترکی اور کئی یورپی زبانوں میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے

لیکن چونکہ اس کا حدیث اور فقہ سے کوئی تعلق نہیں تھا، ہمارے علماء اسے نظر انداز کرتے رہے ہیں مجھے اس کا علم قشیری کے رسالے کے ترجمے سے ہوا۔ قشیری کے رسالہ کو بھی بہت کم لوگ پڑھتے ہیں، جب فتوّت کے بارے میں پوچھنا شروع کیا تو حیرت کی نگاہ کے سوا کبھی کوئی جواب نہ ملا۔

فتوّت پر پروفیسر تشنر کے مضمون کا ترجمہ انشاء اللہ رسالہ جامعہ میں جلد شائع ہوگا۔ یہاں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ مذہب کی طرح فتوّت بھی انسانی زندگی کا ایک بہت پرانا مظہر ہے، اور اس کی خصوصیت مقرر اخلاقی اصولوں پر عمل کرنے کے لئے جماعتیں بنانا ہے۔ مسلمانوں کے علم اخلاقیات کو دو اصطلاحیں جاہلیت کے دور سے ورثے میں ملیں، مروت اور فتوت۔ جاہلیت کے دور میں ان کا مطلب کچھ اور تھا، بعد کو کچھ اور ہو گیا۔ مروت میں بعد کو ایسے اوصاف شامل سمجھے گئے جن کا تعلق افراد سے تھا، جیسے کہ بہادری اور مہمان نوازی اور فتوت سے ایسے اوصاف مراد تھے جو ہوتے تو شخصی ہیں مگر ان کا نمایاں اثر جماعتی زندگی پر پڑتا ہے، جیسے کہ فیاضی، انصاف پسندی اور غیروں کے ساتھ ہمدردی۔ مروت اور فتوت کا فرق ویسا ہی ہے جیسا کہ شیخ نظام الدین اولیا نے طاعت لازم اور طاعت متعدی میں کیا تھا۔ طاعت لازم وہ ہے جس کا فائدہ صرف طاعت کرنے والے کو پہنچتا ہے، اور اس کے لئے خلوص بنیادی شرط ہے، طاعت متعدی وہ ہے جس کا فائدہ دوسروں کو پہنچتا ہے اور اس کی شکلیں بے شمار ہیں شیخ نظام الدین اولیا یہ بھی فرماتے کہ طاعت متعدی کے بغیر طاعت لازم بے سود ہوتی ہے تو وہ اپنے خیال کی تکمیل کر دیتے مگر ان کے زمانے کے لئے قابل قبول نہ ہوتی۔ ہمارے زمانے کے لئے خود طاعت ناقابل قبول معلوم ہوتی ہے۔ اگر وہ متعدی نہ ہو۔ اب حکومتوں کو اور قوموں کو مطلب اس سے ہے کہ شہری کتنے اچھے اور مفید کام کرتا ہے، اس سے مطلب یہ نہیں ہے کہ اس کا مذہب کیا ہے اور خلوت گاہ راز میں اس پر کیا کیفیتیں گذرتی ہیں۔ یہ رویہ صحیح نہیں ہے، طاعت متعدی ہو تب بھی اس کا طاعت ہونا ضروری ہے، انسان کا مفید کام کرنا کافی نہیں ہے، اس کی پشت پر خدمت کا

کوئی تصور ہونا چاہیئے جو اس کے دل میں اعتماد پیدا کرے اور اس کی نیت کو صاف کرتا ہو۔

فتوت آج کل ایک بالکل نئی اصطلاح معلوم ہوتی ہے، پہلے بھی کم لوگ اس سے واقف تھے۔ تصوف، مسٹی سزم، کا قرون وسطیٰ میں بہت چرچا تھا، اب وہ یورپ میں بدنام ہے اور ہندوستان میں اس کی حیثیت باسی کھانے کی سی ہے۔ یورپ اور امریکہ میں اسے یا تو اوہام پرستی کی ایک شکل سمجھا جاتا ہے یا ایسی روحانیت کی مثال جس میں ما فوق الفطری عنصر غالب ہو۔ زیادہ تر ہندوؤں اور مسلمانوں نے ان بزرگوں کا جنھیں صوفی یا سنت کہا جا سکتا تھا اس انداز سے احترام کیا کہ گویا وہ انسانوں کی ایک الگ قسم ہیں اور کسی معمولی انسان کے لئے ان کا جیسا ہونا ممکن نہیں۔ خود صوفی تصوف کے مفہوم کو واضح نہیں کر سکے، اس لئے کہ وہ جانتے تھے کہ طریقت کوئی ایک طریقہ یا راستہ نہیں ہے، بلکہ ان بے شمار راستوں اور طریقوں کا مجموعی نام ہے جن پر چل کر انسان نفس اور نفس پرستی کے بند احاطے سے نکل سکتا ہے۔ رسمی مذہب اور تصوف کے درمیان ہمیشہ جھگڑا اس وجہ سے رہا ہے کہ رسمی مذہب (اپنے بنیادی اصولوں کے خلاف) اس احاطے کی دیوار کو جو انسانی طبیعت اور تخیل کو بند رکھتی ہے توڑنے کے بجائے اور مضبوط کرتا رہتا ہے۔ دراصل تصوف عقیدوں اور مسلکوں کی شکل رفتہ رفتہ اختیار کرتا ہے، اس کی ابتدا ایسی کیفیتوں سے ہوتی ہے جو تقریباً ہر شخص پر گزرتی ہیں، ان کا کوئی معلوم سبب نہیں ہوتا اور انھیں تصوف کی علامت صرف اس بنا پر قرار دیا جا سکتا ہے کہ ان سے متاثر ہو کر آدمی کسی شخص یا مقصد کو اپنی خواہش یا مفاد یا اپنی ذاتی سلامتی پر ترجیح دیتا ہے۔ اسی وجہ سے تصوف کی کتابوں میں اتنی کثرت سے اس کی مثالیں ملتی ہیں کہ شیخ نے مریدی کے امیدوار سے سوال کئے جن سے معلوم ہو کہ وہ شیخ کو کس حد تک اپنے اوپر ترجیح دیتا ہے۔ لیکن چونکہ مذہب رسمی ہونے پر بھی تمام اعلیٰ قدروں کا حامل رہا اس لئے ہر مذہبی جماعت کا تصوف اس کے خاص مذہب کے رنگ میں رنگا رہا، اور اب جہاں کہیں اور جس طرح سے بھی رسمی مذہبیت یا مذہب کی مخالفت ہوتی ہے، تصوف اس کی لپیٹ میں آجاتا ہے۔ رومن کیتھلک کلیسا اس کی مثال ہے کہ مذہب کو بدلے بغیر قائم اور مستحکم رکھا جا سکتا ہے، باقی لوگ مذہب میں

صرف فتوت اور تصوف کے دروازوں سے داخل ہو سکتے ہیں۔

اس مرتبہ جرمنی میں ایک ایسے صاحب سے بھی ملاقات ہوئی جو بڑی امیدیں لے کر ہندوستان آئے اور بہت مایوس واپس گئے تھے۔ بڑی کوفت اس بات سے ہوئی کہ یہی ہمارے سفر کے انتظامات کے ذمہ دار بھی تھے۔ انھیں پہلی مایوسی اس وجہ سے ہوئی کہ رہنے کو جگہ بہت گراں اور بہت خراب ملی، دوسری مایوسی دہلی کی "بستیاں" اور دہلی اور بمبئی میں بے گھر لوگوں کو سڑک پر سوتے دیکھ کر ہوئی، تیسری بمبئی کی ایک سڑک پر سے گذر کر ہوئی جس کے دونوں طرف قحبہ خانے تھے جن کا دن دہاڑے کاروبار جاری تھا۔ جو یہ سب دیکھ چکا ہو اس کے سامنے اس الزام کا کیا جواب دیا جاتا کہ ہندوستانیوں کے دل انسانی ہمدردی سے خالی ہیں ان میں سے ہر ایک اپنی غرض اور اپنے کام میں لگا رہتا ہے اور محتاجوں، مسکینوں اور مظلوموں کی خبر لینے والا کوئی نہیں، خصوصاً جب الزام لگانے والے صاحب ایسے ملک کے شہری تھے جہاں تقریباً تین کروڑ رفیوجیوں کے لئے مکان اور روزگار کا بڑی خوبی سے انتظام کیا جا چکا تھا۔ میں نے پہلے اس امید میں سوالات کئے کہ شاید الزام کا جواب دینے کی صورت نکلے، مگر اس کا اُلٹا اثر ہوا۔ پھر بھی اتنا تو معلوم ہو گیا کہ تاج محل نے ہندوستان کی آبرو رکھ لی تھی، اور اس کے نظارہ نے ملک کی بہت سی خامیوں پر پردہ ڈال دیا۔

تاج محل کے سلسلے میں کسی کارخانہ کا ذکر کرنا بے موقع سا معلوم ہوتا ہے، لیکن کارخانے میں بھی حسن پیدا کیا جا سکتا ہے۔ دولفس برگ میں جرمنی کی مشہور موٹر کار فولکس واگن کا کارخانہ ہے جہاں ہر چھ سکنڈ میں ایک کار تیار ہو جاتی ہے۔ تیاری کا دارومدار کام کی ایک خاص روانی پر ہے جسے مشین اور آدمی مل کر قائم رکھتے ہیں۔ کار کا انجن ہانوور کے ایک کارخانے میں تیار ہوتا ہے، دولفس برگ میں کام کا سلسلہ لوہے کی چادروں سے شروع ہوتا ہے جو مشینوں میں کٹتی اور مڑتی ہیں اور مشینوں ہی کے ذریعے اس طرح جوڑی جاتی ہیں کہ کار کے بوڈی کی شکل بن جاتی ہے۔ مشینیں ہی اس بوڈی کو رنگتی اور چمکاتی ہیں۔ ایک دوسرا سلسلہ چیسس کی تیاری کا ہوتا ہے، اور پھر بوڈی اس پر جما دیا جاتا ہے۔ اسی دوران میں مزدور اس میں تار لگاتے

ہیں، متفرق حصوں کو جوڑتے ہیں۔ آخر میں ایک طرف سے لوڈی آتی ہے، دوسری طرف سے انجن گویا جسم میں جان ڈالی جاتی ہے، پھر پہیئے لگا دئے جاتے ہیں اور آخر میں ایک مزدور تیار موٹر کو چلا کر الگ لے جاتا ہے۔ کوئی اس جگہ کھڑا ہو تو ایک منٹ میں دس موٹر تیار اور کیل کانٹے سے درست ہوتے دیکھ سکتا ہے۔ کارخانے میں شور ہوتا ہے، مگر کہیں ایک تنکا بھی پڑا ہوا نہیں دکھائی دیتا مزدور البتہ چار پانچ سال سے زیادہ کام نہیں کر سکتا، اس لئے کہ ہر مزدور کے سپرد زیادہ سے زیادہ کام کا اتنا حصہ ہوتا ہے جتنا وہ آدھے منٹ میں کر سکتا ہے، اور ایک ہی کام کو مسلسل آٹھ گھنٹے کرتے رہنا ایسا بار ہے جسے انسان کی طبیعت بہت عرصہ تک برداشت نہیں کر سکتی فن کے کارنامے میں حُسن ترتیب سے اور روانی کی ایک خاص کیفیت سے پیدا ہوتا ہے جو فن کار کی طبیعت اور تخیل سے نکل کر بیجان رنگ یا مسالے یا پتھر میں ایک روح سی پھونک دیتی ہے۔ فن کار کی شخصیت محنت سے فروغ پاتی ہے، چاہے محنت ناکام بھی ہو۔ صنعتی مزدور کو چاہے محنت کم کرنی پڑتی ہو اور کامیابی یقینی ہو مگر وقت کے ساتھ اس کی شخصیت گھلتی اور گھٹتی رہتی ہے۔

ہمارے سفر کی آخری منزل شہر بون، جرمنی کا عارضی دارالسلطنت تھا۔ یہاں جرمنی کے صدر سے ملاقات ہوئی، جو تصویروں میں بہت اچھے لگتے ہیں اور پروفیسر مِس شِمل سے، جو پاکستان اور ہندوستان میں رہ چکی ہیں اور اپنی زبان کے علاوہ انگریزی، فرانسیسی، ترکی، فارسی، عربی اردو اور سندھی جانتی ہیں۔ انھوں نے جاوید نامہ کا جرمن میں ترجمہ کیا ہے، اور اس کے علاوہ ایشیائی شاعری کے کئی جرمن مجموعوں کے لئے فارسی اور اردو سے ترجمے کئے ہیں۔ آج کل وہ سندھ کے شاہ عبداللطیف کے کلام کو جمع کر رہی ہیں اور ان کا ارادہ ہے کہ اسے جرمن میں ترجمہ کر کے شائع کریں۔ فن کے کارناموں اور صنعتی کارخانوں کے ساتھ جرمنی کی یونیورسٹیوں کا ذکر بھی لازم آجاتا ہے جہاں خاصی تیز رفتاری سے علمی کام تکمیل کو پہنچتے رہتے ہیں۔ صنعت میں ہم جرمنی کے معیار تک نہ معلوم کتنے عرصے میں پہنچ پائیں، لیکن کوئی وجہ نہیں کہ ہم میں وہ جوش اور شوق پیدا نہ ہو جائے جو جرمن تعلیم گاہوں میں نظر آتا ہے۔

غزل

ڈاکٹر معین احسن جذبی

ہر جورِ ناروا کے مقابل رہے ہیں ہم
وجہِ شکستِ شیوۂ قاتل رہے ہیں ہم
ہر آئینہ رہا ہے حریفِ غرورِ سنگ
ہر تیر کے لئے صفتِ دل رہے ہیں ہم
ظلمت فگن رہا کوئی ہر آسمان پر
ہر آسمان پر مہِ کامل رہے ہیں ہم
اے آسمان خاک نشینوں سے مت اُلجھ
اے آسمان تیرے مقابل رہے ہیں ہم
جب بڑھ گئے تلاطم و طوفان بن گئے
یوں دیکھنے کو موجۂ ساحل رہے ہیں ہم
جب جل اُٹھے تو بخش دیا اک جہاں کو نور
یوں تو چراغِ کشتۂ محفل رہے ہیں ہم
ہم گمرہانِ شوق کا عالم نہ پوچھئے
منزل سے دور بھی سرِ منزل رہے ہیں ہم
ہم کو سمجھ نہ پاؤ گے اے ناقدانِ فن
روزِ ازل سے عقدۂ مشکل رہے ہیں ہم

فردوسی کا شاہنامہ اور داستانِ بیژن و منیژہ

جناب آفتاب اختر ایم اے

شاہنامۂ فردوسی ایک مبسوط اور طویل رزمیہ نظم ہے جو ایران قدیم کی تاریخ پر مبنی ہے۔ اس میں خونریز لڑائیاں۔ رزم کی شعلہ انگیزیاں۔ بہادروں کی رجز خوانیاں۔ ایرانیوں کی کامرانیاں۔ بزم کی گل افشانیاں عشق و عاشقی کی دلچسپیاں۔ بادشاہوں کی زور آزمائیاں اور رزم میں استعمال کئے جانے والے اسلحہ کا تفصیل سے ذکر ملتا ہے۔ لیکن رزم و بزم کی اس ہم آہنگی اور امتزاج کے باوجود جو شخص بھی اس میں سے کسی داستان کو منتخب کرتا ہے تو وہ رزمیہ ہی ہوتی ہے۔ آرنلڈ کو بھی جب شاہنامہ میں سے کسی داستان کا انگریزی میں ترجمہ کرنے کا خیال پیدا ہوا تو وہ بھی اتفاق سے لڑائی سے بھرپور ایک رزمیہ داستان سہراب و رستم ہی نکلی۔

افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اب تک فردوسی کے اس مخصوص رزمیہ رنگ سے علیٰحدہ ہوکر کسی نے بھی اس کی کسی دوسری داستان کو مدح و ثنا کے لئے منتخب نہیں کیا۔ حالانکہ فردوسی نے اسی شاہنامہ میں ایک ایسی رومانی داستان بھی شامل کردی ہے جو داستان زال و رودابہ اور سہراب و دخت آفرید کے رومانی قصوں سے بھی زیادہ مکمل اور عشق و عاشقی کی دلچسپ وارداتوں سے زیادہ بھرپور ہے۔ میری مراد داستان بیژن و منیژہ سے ہے جس میں عشق و عاشقی زیادہ اور رزم کم ہے۔ یہ داستان فردوسی کو ایک بزم نگار کی حیثیت سے ہمارے سامنے لاتی ہے۔ اس کو عشق کی صلح روایات کا پرستار بنا کر پیش کرتی ہے۔ ہمارے دلوں میں اس کی قدر و منزلت یہ دیکھ کر اور زیادہ بڑھ جاتی ہے کہ وہ صرف ایک بہترین رزم نگار ہی نہیں بلکہ عمدہ بزم نگار اور قابل تعریف عشقیہ داستان کا مصنف بھی تھا۔ فردوسی نے اس میں کردار نگاری۔ جذبات نگاری، منظر نگاری، مکالمات نگاری اور فنی نیرنگیوں

کے گل بوٹے کھلائے ہیں۔

محمود شیرانی نے اپنی کتاب "فردوسی پر چار مقالے" کے مقالۂ اول میں اس داستان پر بہت مکمل کر بحث کی ہے۔ انھوں نے اپنا سارا زورِ بیان اور اپنی ساری قوتِ استدلال اس کی اہمیت جتانے پر صرف کردی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ یہ داستان ہی شاہنامہ کی اصل محرک ہے۔ اور فردوسی نے سب سے پہلے اسے ہی نظم کیا تھا۔ اور فردوسی نے شاہنامہ کی نظم کا پختہ ارادہ کرنے سے چند سال قبل ہی اسے نظم کرنا شروع کر دیا تھا اور اسے شائع بھی کرا چکا تھا۔ شیرانی کا خیال ہے کہ داستان بیژن کی عام مقبولیت اور شہرت ہی تمام شاہنامہ کی تصنیف کی اصلی اور قدیمی محرک ہے۔ شیرانی کا یہ بھی خیال ہے کہ داستان بیژن محض تفریحاً فردوسی نے اپنی بیوی کی خاطر سے نظم کردی تھی۔ جب یہ شائع ہو کر عوام و خواص میں کافی مقبول ہوگئی تو دوستوں کی تحسین اور سخن فہموں کے اصرار نے اسے شاہنامہ جیسی طویل نظم کی تصنیف پر آمادہ کر دیا۔

فردوسی اختصار پسند ہے اس لئے وہ قصہ یا کسی چیز کو بلا وجہ طول نہیں دیتا وہ "سہراب و رستم" کی داستان کو صرف اس طرح شروع کرتا ہے۔

کنوں رزم سہراب و رستم شنو دگر ہا شنیدستی ایں ہم شنو

فردوسی کی اسی اختصار پسندی کی طرف محمود شیرانی نے بھی اشارہ کیا ہے۔ ان کا خیال ہے: "فردوسی اختصار پسندی کے لئے مشہور ہے اور یہ اس کی نمایاں خصوصیت ہے۔ وہ شعراء متاخرین کی طرح اپنے مضمون کو طوالت دینا پسند نہیں کرتا۔" (فردوسی پر چار مقالے صفحہ ۱۱) لیکن جب وہ داستان بیژن و منیژہ لکھنے بیٹھتا ہے تو ایک بے حد طویل تمہید نظم کرتا ہے اور بقول شیرانی بعض موقعوں پر بلا ضرورت چادر سے باہر پاؤں پھیلاتا ہے۔ تمہید میں فردوسی نے رات کا جو طویل منظر پیش کیا ہے اسے دیکھ کر جامی اور نظامی کے طرزِ ادا کا شبہ ہوتا ہے۔ فردوسی اپنی عادت کے برخلاف تمہید کا آغاز یوں کرتا ہے کہ رات بے حد تاریک تھی۔ چاروں طرف سناٹا تھا۔ اس کا دل گھبرا رہا تھا۔ اس کی نیند غائب تھی ایسی

بے چینی کی حالت میں وہ اپنی شریک حیات کو چراغ لانے کے لئے بلاتا ہے۔ جب وہ وجہ دریافت کرتی ہے تو فردوسی اسے یہ جواب دیتا ہے کہ روشنی کرو تاکہ بزم سجے۔ فردوسی کی شریک حیات چراغ تو لاتی ہے لیکن اس کے ساتھ وہ قدیم ایران کی ایک تاریخ بھی لے آتی ہے اور اس وعدہ پر سناتی ہے کہ وہ جیسا سُنے گا ہو بہو نظم بھی کر دے گا۔ اس طویل تمہید کے بعد فردوسی اصل داستان شروع کرتا ہے۔

ظاہر ہے یہ تمہید بے حد طویل ہے اور صرف ایک رات کے منظر کو نظم کرنے میں اس نے عام روش سے ہٹ کر جزئیات نگاری سے کام لیا ہے۔ بے حد تشبیہوں اور استعاروں سے کام لے کر اس کو رنگین اور بلیغ بنانے کی کوشش کی ہے۔ شیرانی اس کی وجہ یہ بتلاتے ہیں کہ "یہ داستان چوں کہ اس کی پہلی کوشش کا نتیجہ تھی اس لئے جہاں تک ہو سکا شاعر نے اپنے پہلے نمونے کو نہایت رنگینی اور رونق کے ساتھ پیش کیا ہے۔"

(فردوسی پر چار مقالے۔ صفحہ ۱۶)

شیرانی کی اس رائے سے اتفاق کرنا ہی چاہیئے کیونکہ ہر فنکار کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ اپنی پہلی تخلیق کو ہر طرح سے آراستہ و پیراستہ کر کے ناظرین کے سامنے پیش کرے تاکہ وہ اپنی پہلی ہی کوشش سے مشہور ہو جائے۔

شاہنامہ کا مطالعہ کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ فردوسی عام طور سے کسی داستان کو نظم کرنے کے اسباب بیان کرنے کا عادی نہیں ہے۔ پھر بھی اس کا ماخذ یا راوی اکثر بیان کر دیتا ہے لیکن فردوسی اس داستان کی نظم کے اسباب کو بالتفصیل تمہید میں بیان کر دیتا ہے۔ فردوسی نے اس کے تاریخی ماخذ کی طرف بھی اشارہ کر دیا ہے تاکہ پڑھنے والے اس داستان کو جھوٹ یا لغو نہ سمجھیں۔ شاید فردوسی نے اس پہلو سے بھی اس کو مکمل کرنے کی کوشش کی ہے۔

پہلے داستان نویسی اور مثنویوں کے لکھنے کا یہ قاعدہ تھا کہ اس میں سب سے پہلے حمد لکھی جاتی تھی تاکہ خدا کے تعلق کی برکت اور اس کے ذکر سے مصنف کی تصنیف کو کامیابی

حاصل ہو۔ فردوسی نے بھی اس داستان کی تمہید سے پہلے حمد کے اشعار لکھے ہیں۔ داستان کی یہ خوبی بھی اس طرف اشارہ کرتی ہے کہ اُس نے اس داستان کو علیحدہ لکھا تھا۔ چوں کہ یہ داستان علیحدہ لکھی گئی تھی اس لئے شاہنامہ سے قبل ہی ضبط تحریر میں آئی ہوگی کیوں کہ شاہنامہ لکھتے وقت آخر اس کی کیا ضرورت تھی کہ وہ اسی طرح کی کوئی اور داستان علیحدہ سے لکھتا۔

محمود شیرانی "داستان بیژن و منیژہ" کو اولیت دینے کے لئے یہ بھی ثبوت پیش کرتے ہیں کہ "فردوسی کا سکہ بحیثیت رزم نگار ہمارے قلوب پر شاہنامہ کی وجہ سے جما ہوا ہے اس صنف سخن میں شاہنامہ کے سوا کوئی اور تصنیف اس کی طرف منسوب بھی نہیں کی جاتی۔ پھر وہ کیا مخفی وجوہ تھے جن کی بنا پر شاہنامہ کی نظم کا مستقل ارادہ کرنے سے ایک عرصہ بیشتر اس کے معاصرین میں فردوسی کی رزمیہ شاعری کی شہرت قائم ہو چکی تھی جس کی صدائے بازگشت ہم دیباچہ میں دیکھتے ہیں۔ جہاں فردوسی کا ایک دوست اس کے ارادے کو مستقل اور عزم کو مستحکم کرنے کی غرض سے کہتا ہے" (فردوسی پر چار مقالے صفحہ ۸)

اس داستان کے طول اور جزئیات نگاری سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ داستان شاہنامہ سے پہلے کی تخلیق ہے۔ یہ اُس وقت لکھی گئی تھی جب وہ اپنے لئے کوئی مخصوص راہ ہموار نہ کر سکا تھا۔ اس وقت اُس کے طرز میں انفرادیت بھی نہ آپائی تھی۔ بلکہ وہ مختلف قسم کے تجربات کر رہا تھا۔ تاکہ کسی خاص طرز کو اپنے لئے مقرر کر سکے۔

"داستان بیژن و منیژہ" کو فردوسی نے اس وقت نظم کیا تھا جب شاہنامہ کی طرح کوئی مسلسل اور طویل نظم لکھنے کا خیال بھی اس کے ذہن میں نہیں آیا تھا۔ اس نے ایران قدیم کی تاریخ کا ایک دلچسپ باب سنا جس میں شجاعت و مردانگی کی ترنگیں اور عشق و عاشقی کی امنگیں افراط سے موجود تھیں۔ یہ دیکھ کر فردوسی کے ذہن میں اُس وقت صرف اسی مختصر داستان کو نظم کرنے کا خیال پیدا ہوا اور اس نے داستان کو ہر طرح سے مکمل کرنے کی کوشش کی جس میں یقیناً فردوسی کو بے انتہا کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ اس نے اس مختصر رومانی داستان میں تمام

دلچسپیوں اور خوبیوں کو سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔

اگر اس داستان کو شاہنامہ سے علیحدہ کرکے پڑھا جائے تب بھی اس کی انفرادیت پر کوئی حرف نہیں آتا۔ اور یہ ہر طرح سے ایک مکمل رومانی مثنوی نظر آتی ہے۔ اپنی جگہ پر اس کی خود جداگانہ حیثیت ہے۔ اس کی اہمیت فردوسی کی شاعری کے کارخانے میں تیار کئے ہوئے مال کے اس نمونہ کی سی ہے جو کمرۂ نمائش میں گاہکوں کو اپنی طرف مائل کرنے کے لئے سجایا جاتا ہے۔

منیژہ اور بیژن کی محبت کی ایک جھلک

منیژہ شہنشاہ کی نورِ نظر ہے۔ لیکن جب افراسیاب نے اس کے مطلوب بیژن کو کنوئیں میں قید کر دیا تو اس نے بیژن کے لئے سب کچھ چھوڑا۔ دن بھر گلی کوچوں میں پھر کر روٹی کے ٹکڑے مانگ لاتی تھی اور کنوئیں میں جاکر ڈال آتی تھی۔ (چند اشعار کے ترجمے ملاحظہ ہوں)۔

جب منیژہ کو خبر پہنچی تو   آنسوؤں سے اس کا چہرہ چھپ گیا
تمام خزانہ لٹا دیا
صرف ایک چادر اوڑھ کر آئی   دونوں پاؤں ننگے تھے اور سر کھلا تھا
جنگل میں چلاتی پھرتی تھی   جب ایک دن اور ایک رات گذر گیا
تو چیختی ہوئی کنوئیں کے پاس آئی   اور ایک طرف راستہ بنایا
جب سورج نکلتا تھا تو   در در روٹی مانگتی تھی

روٹیاں لاکر بیژن کو دیتی تھی اور روتی تھی اور اس بدبختی کے ساتھ بسر کرتی تھی:

میں افراسیاب کی بیٹی ہوں   آفتاب نے میرا جسم کھلا ہوا نہیں دیکھا
اب خون آلود آنکھوں کے   ساتھ در در پھرتی ہوں
کم بخت بیژن کے لئے   میں نے تاج و تخت کھو دیا

(شعر العجم حصہ چہارم ص ۳۱۸۔۳۱۵)

"کھوئے گئے ہم ایسے کہ اغیار پا گئے"

جناب عبداللہ ولی بخش قادری

بھول چوک ہم سب سے ہوتی رہتی ہے۔ روزانہ کی زندگی میں نہ معلوم کتنی ایسی لغزشیں سرزد ہوا کرتی ہیں جنھیں ہم محض "اتفاقیہ امر" کہہ کر خاموش ہو جاتے ہیں "اسے! معاف فرمائیے، میں یہ کہنا چاہتا تھا" "نہیں نہیں! یہ نہیں یہ" یا کوئی اور ایسا ہی جملہ کہا اور آگے بڑھ گئے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ لکھنا کچھ چاہتے ہیں اور لکھ کچھ اور جاتے ہیں۔ کبھی اصل لفظ یا جملہ ہی چھوٹ جاتا ہے۔ کسی موقعے پر انکار کی جگہ اقرار اور اقرار کی جگہ انکار موجود ہوتا ہے۔ کبھی کسی مخصوص نام میں تصرف ہو جاتا ہے یا قطعی دوسرا نام تحریر ہو جاتا ہے۔ اب اگر نظرثانی کرتے وقت گرفت ہوگئی تو کچھ اس طرح اصلاح کرلی جاتی ہے جیسے یہ کوئی بات نہیں۔ ایسا ہوتا ہی رہتا ہے۔ اور اگر کسی دوسرے نے اس عبارت کو دیکھ کر ٹوک دیا تب بھی معصومیت کے ساتھ کچھ یہی نکلتا ہے کہ "بھول گیا۔ غلطی ہوگئی"۔ بس اتنا کہا اور بری الذمہ ہوگئے۔ اس سے زائد معنویت نہ خود کو نظر آتی ہے اور نہ چاہتے ہیں کہ کوئی دوسرا کچھ اور معنی پہنائے۔ اتفاق کی بات تھی۔ اور اتفاقات ہوتے ہی رہتے ہیں! چیزوں کی ترتیب و تنظیم میں بھی حافظے کی یہ اونچ نیچ ہوتی رہتی ہے۔ اُسے کوئی بوکھلاہٹ کا نتیجہ گردانے یا ہم اپنی جلد بازی کو صورتِ جواز بتائیں یا نیک نیتی میں اپنے تفکرات کو اپنے بھٹکنے کا ذمہ دار قرار دیں۔ بات صرف اتنی ہی رہتی ہے کہ ایسا ہو ہی جاتا ہے۔

فرائڈ کے نظریات کی ترویج و اشاعت سے قبل یہ اتفاقات کی دنیا، محض حادثات کی دنیا سمجھی جاتی تھی۔ اور ہمارا "عمل جوڑ" فعل، ایک الگ تھلگ بے تعلق عمل تصور کیا جاتا تھا۔ "اتفاقیہ امر" سے مراد ہی یہ ہوتی ہے کہ اس کے وقوع پذیر ہونے کی کوئی وجہ موجود نہیں ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہر نفسی عمل کی اپنی ضرورت اور اپنی مصلحت ہوا کرتی ہے۔ اس کی

غرض وغایت خواہ ہماری سمجھ میں نہ آئے اور خواہ وہ دوسروں کے نزدیک بھی بے معنی اور بے ربط ہو لیکن دراصل وہ حقائق کا مظہر ہوا کرتا ہے۔ اس کے اظہار کے اسباب ہوتے ہیں اور اس کی اپنی منطق ہوا کرتی ہے۔ ہماری چھوٹی سی چھوٹی فروگذاشت بھی ہمارے مافی الضمیر کی نشاندہی کیا کرتی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ہمارے الجھے ہوئے مبہم فقرے، ایک لحاظ سے ہماری معقول و مربوط عبارت سے کہیں زیادہ معنویت رکھتے ہیں۔ ان سے کہنے والے کی ذہنی کیفیت کا علم ہوتا ہے اور اس کے مزاج پر روشنی پڑتی ہے۔ "گستاخ دستیاں" بہرحال "ہجوم شوق" سے مجبور ہو کر ہی ہوا کرتی ہیں اور "ماجرائے دل" بیتابیاں ہی آشکارا کرتی ہیں۔ لہٰذا اضطراری کیفیت اپنے اضطرار کے باوجود ہماری طبیعت کا رُخ بڑی دیانت داری کے ساتھ بتاتی ہے۔ "زبان پر بےخودی میں" اگر کسی کا نام آ ہی جاتا ہے" تو یہ سراغ رسانی بہرحال افشائے رازِ حقیقت ہے۔

یہ تمام "اتفاقات"، خواہ حسین ہوں یا عجیب، خفیف الحرکاتی کا اظہار کریں یا شائستگی کا۔ معقول ٹھہریں یا نامعقول، اپنی مصلحت اندیشیوں کے ساتھ وارد ہوتے ہیں۔ وہ سب ہماری طبیعت کا تقاضا ہوا کرتے ہیں۔ ہمارا ذہن، اپنا ایک لائحہ عمل تیار کیا کرتا ہے اور ہمارے تمام فعل اسی خاکے کے مطابق تکمیل پاتے ہیں۔ ہماری شخصیت میں پائیداری اور استقامت اسی بنا پر پیدا ہوتی ہے۔ یہ ہمارا کردار ہے۔ زندگی کے نقوش اسی کردار کے آئینے میں ابھرتے، اور مٹتے رہتے ہیں۔ اور جب کبھی کسی غلط جنبشِ قلم کا گمان گزرتا ہے جو مطابقت رکھتی ہوئی نہیں معلوم ہوتی تو ذرا گہری نظر ڈالنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ اس کی گنجائش کا اندازہ لگانے کے لئے شعور کی منزل سے نیچے اُترنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ ہم لاکھ کہیں کہ "یہ خطا جان کر نہیں ہوئی" یہ مجبوری" ہماری اپنی ہے، کسی دوسرے کی نہیں۔ ہم اپنے آپ سے مجبور ہو کر بھی اگر کچھ کرتے ہیں تب بھی وہی سب کچھ کہتے ہیں جو دراصل ہم ہیں۔ سماج کے جن ضابطوں کو ہماری طبیعت قبول نہیں کر پاتی وہ ہمارے سامنے سے ہٹ ضرور جاتے ہیں لیکن مٹ نہیں جاتے۔ ہماری خواہشات غیر مطمئنہ نیست و نابود نہیں ہوا کرتیں بلکہ دَبک جایا کرتی ہیں۔ ہمارے غیر آسودہ جذبات

ناپید نہیں ہوتے بلکہ اپنے سینے پر حقائق کا سنگِ گراں رکھ کر خاموش ہو جاتے ہیں۔ اور یہی سب ہمارے تحت الشعور کا مواد بنتے ہیں۔ ان سب کو اپنے اظہار کے لئے موقعوں کی تلاش رہتی ہے۔ شعور کی گرفت زرا ڈھیلی دیکھی اور یہ نمودار ہوئے۔ ہم سوچتے ہیں کہ بے خیالی میں کچھ کا کچھ کر جاتے ہیں یا جب ہم اپنے حال میں نہیں ہوتے تو غیر ذمہ دارانہ رویہ ایک قدرتی امر ہے۔ اور یہ دھیان نہیں دیتے کہ کسی کے ہاتھ موقع لگنے کی بات ہوئی ہے۔ جو کچھ ہم شعوری طور پر قبول کرتے ہیں اور ہماری طبیعت قبول نہیں کرتی، وہ ہماری اندرونی کشاکش کا سبب ہوا کرتا ہے اور ہمارے تحت الشعور میں محفوظ رہتا ہے۔ شعور کی بیداری میں تحت الشعور کے اثرات کو ظاہر ہونے کا موقع نصیب نہیں ہوتا۔ پھر بھی چال بیٹی اور دھوکا دھڑی سے ہمارے تحت الشعور کے بذنفس باز نہیں رہتے۔ شعور کی آنکھ زرا جھپکی، اور دھڑام سے کود ے ہم جسے اتفاق کہتے ہیں یا بے خودی کا نتیجہ بتاتے ہیں، وہ دراصل ہمارے تحت الشعور کا ایک شب خون ہوتا ہے۔ اب اگر شعور کی نگرانی کڑی ہے اور تحت الشعور کو زرا بھی چال بازی کا موقع نہیں ملتا تو بھر بھیس بدل بدل کر اپنا کام چلانے کی ترکیب نکالی جاتی ہے۔ اگر پورے طور پر اپنا عمل دخل نہیں ملتا تو علامتی عمل سے ہی قدرے اشک شوئی کر لی جاتی ہے۔ اس لئے ہمارے تحت الشعور کی جلوہ نمائی مختلف انداز سے ہوا کرتی ہے۔ کبھی اس کے اثرات، خیالات کا طلسم بن کر رونما ہوتے ہیں، کبھی ان سے خوابوں کی دنیا آباد ہوتی ہے، کبھی مزاج کی بدمزگی اور پراگندگی میں ان کا اظہار ہوتا ہے، کبھی خوف و ہراس کی شکل بن کر سامنے آتے ہیں اور کبھی کسی اور اضطرابی کیفیت میں اپنا زور دکھلاتے ہیں۔ مثلاً ہم نے کسی کو دکھ پہنچایا اور اس کے ساتھ احساسِ ندامت وابستہ ہو گیا۔ ہم اس تلخ واقعے کو فراموش کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ لیکن اس شخص کی صورت ناگوار لگنے لگی۔ ہمارا اپنا احساسِ ندامت، چولا بدل کر، منافرت کی شکل میں ظاہر ہو گیا۔ اس طرح ہم نے اس کے سر الزام تھوپ دیا جو ہمیں ناپسند تھا۔ اس صورت حال کے برخلاف فرض کیجئے کہ کسی نے ہمیں رنج دیا، ہم نے اسے برداشت کر لیا اور فراموش بھی کر دیا۔ لیکن اب نئے ملاقاتیوں پر اعتبار نہیں آتا۔ غالباً یہ سابقہ تجربے کا ردِ عمل ہو۔ ہم کسی سے متعارف ہونے سے قبل ہی تہیہ کئے

بیٹھے ہیں کہ وہ آدمی خراب ہے۔ ہماری پالوسیاں اور نامرادیاں، ہماری ناآسودہ آرزوئیں اور تمنائیں ہمارے وہ تمام "سخن ہائے گفتنی"، جو خوفِ فسادِ خلق سے ناگفتہ رہ گئے ہیں، اور ہمارے وہ فطری رجحانات اور قدرتی میلانات جو تہذیب و شائستگی کی قیود میں جکڑے ہوئے ہیں سب ہی ہمارے تحت الشعور کا سرمایہ ہیں۔ اور ان ہی کی حیثیت اور اہلیت کے مطابق ہمارا ردِ عمل ہوتا ہے۔

بقدرِ ظرف ہے ساقی خمارِ تشنہ کامی بھی!

بہت سے آزار ہم خود مول لیتے ہیں اور شعور کو فریب دینے کی نیت سے "بعنوانِ دیگر" انھیں انجام دینے کی راہیں تلاش کرتے ہیں۔ مثلاً "امتحان کا بخار"۔ تیاری امتحان کی زحمت اور ناکامی کی ذلت دونوں سے بچ کر نکل جانے کا یہی موثر حل ہے جو تحت الشعور کی بدولت حاصل ہو جاتا ہے۔ اسی طرح کوٹ پر سگرٹ گر جاتی ہے اور پہننے کے قابل نہیں رہتا کیونکہ پہنتے پہنتے اس سے طبیعت اکتا گئی تھی اور اتنا بوسیدہ نہیں ہوا تھا کہ اس کی علیحدگی مناسب حال خیال کی جاتی۔ یہ بات ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ ہمارے بے اختیارانہ طور پر سرزد ہوتے والے اعمال، ہمارے مخصوص مطمعِ نظر اور منفرد طرزِ فکر کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔ ہم نے جو خود بینی و خود نگری کا نقاب اپنے اوپر ڈال رکھا ہے، وہ ہماری گھبراہٹ، بےخبری یا بے اختیاری میں ہٹ جاتا ہے اور حقیقی روپ کی جھلک دکھائی دیے جاتی ہے۔ ہماری معمولی حرکات و سکنات، ہمارے کردار کی بڑی نمایاں جھلکیاں پیش کرتی ہیں۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ ہمارے شعرا نے "حسنِ برہم" کے بڑے گن گائے ہیں۔ وہ حسن جو تکلف سے عادی ہوتا ہے، اس کی کیفیت ضرور کچھ اور ہوتی ہے۔ اور اسی لئے یہ بھی ضروری ہے کہ :

چھیڑ خوباں سے چلی جائے اسدؔ

ہماری شخصیت میں اندرونی کشاکش اور بیرونی حقائق کے ردِ عمل سے ایک ناقابلِ تشریح جوہر نمایاں ہوتا ہے جو اس کو انفرادیت بخشتا ہے۔ یہ انفرادیت سادہ بھی ہو سکتی ہے اور پیچیدہ بھی۔ اصل بات اپنی اصلیت کا اقبال اور زندگی سے اس کا ارتباط ہے۔ یہ انفرادیت اپنی داخلی کیفیات کے احساس و ادراک کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی۔ ان داخلی کیفیات کا تعلق محض روحانی دنیا سے نہیں ہے۔ یہ کیفیات ہر لمحہ ہمارے ہر ایک فعل میں جاری اور ساری ہیں۔

رسالہ خدنگ نظر

جناب ویریندر پرشاد سکسینہ بدایونی

لکھنؤ سے "خدنگ نظر" نامی ایک ماہوار رسالہ نکلتا تھا۔ اردو کے صف اول کے شاعر اور ادیب منشی نوبت رائے نظر لکھنوی مرحوم اس کے ایڈیٹر تھے آپ منظر لکھنوی کے محبوب ترین شاگرد تھے۔ محمد سخاوت مرزا نے بغیر کسی تحقیق کے آپ کو منیش تھانوی کا شاگرد لکھ دیا ہے جو بالکل غلط ہے۔ "خدنگ نظر" کا سب سے پہلا شمارہ ماہ ستمبر ۱۸۹۶ء میں نواب میر محبوب علی خاں نظام الملک آصف جاہ کی یادگاری سال گرہ کے موقع پر شائع ہوا تھا اس خاص شمارہ کی ایک کاپی میرے کتب خانہ میں محفوظ ہے۔ "خدنگ نظر" کے مطبع کا نام بھی نظام کے نام پر آصفی پریس تھا۔ یہ مطبع نوازگنج میں نظر مرحوم کے دولت کدہ پر واقع تھا۔ رشید حسن خاں اقبال درما سحر ہنگامی رفیق مارہروی رئیس مینائی عشرت لکھنوی مولانا حسرت موہانی ڈاکٹر رام بابو سکسینہ وغیرہ نے "خدنگ نظر" کے طبع ہونے کی تاریخ ۱۸۹۷ء لکھی ہے جو میرے خیال میں بالکل غلط ہے منشی نوبت رائے نظر اپنے خود نوشت حالات میں "خدنگ نظر" کے متعلق لکھتے ہیں۔

"۱۸۹۶ء سے راقم کی ادبی زندگی کا دور شروع ہوا جو اب تک کم و بیش جاری ہے اس سال کے اواخر میں راقم نے لکھنؤ سے "خدنگ نظر" جاری کیا جو آٹھ سال تک شائع ہوتا رہا۔ یہ اردو زبان کا بہترین رسالہ تصور کیا جاتا تھا۔ نفاست اور ادبی خصوصیات کے لئے خاص شہرت رکھتا تھا۔ بہر نوع سخت مالی مشکلات اور خانگی معاملات کی وجہ سے ۱۹۰۴ء میں "خدنگ نظر" کی اشاعت موقوف ہوگئی لیکن اس کی شہرت اب تک قائم ہے۔"

"خدنگ نظر" کے سرورق پر مارچ ۱۸۹۷ء تک یہ شعر تحریر ہوتا رہا۔

مانوس ہیں اگر نگہ فتنہ گر سے آپ
بہلائیں دل کو تیر خدنگ نظر سے آپ

مارچ ۱۸۹۷ء سے یہ شعر دیا جانے لگا۔

نکلا ہے بن سنور کے "خدنگ نظر" نظرؔ
یاں دل دھڑک رہا ہے کسی کی نظر نہ ہو

رسالہ کی عمر کے بارے میں سب ہی تذکرہ نگاروں نے یہ غلطی کی ہے کہ یہ رسالہ ۷ سال بعد مالی مشکلات کے باعث بند کر دیا گیا۔ نظر اپنے خود نوشت حالات میں یوں رقم طراز ہیں:

"راقم نے خدنگ نظر جاری کیا جو آٹھ سال تک شائع ہوتا رہا۔"

میں نے اس رسالہ کی آٹھوں سال کی جلدیں دیکھی ہیں اردو کا کوئی قدیم اور مشہور گلدستہ خواہ وہ پیام یار ہو یا جلوۂ داغ یا جلوہ یار یا جلوۂ عاشق "نظرؔ مرحوم کے رسالے کی ادبی حیثیت کو نہیں پہنچ سکتا۔ رسالہ "ادیب" ماہ جون ۱۹۱۰ء میں حضرت نظرؔ رقم طراز ہیں:

"خدنگ نظر" نے اپنی زندگی میں اردو رسالوں کو دو مفید تحفے دئے تھے ایک عمدہ لکھائی چھپائی دوسرا نثر و نظم کا مستقل الحاق جو اس سے پیشتر مفقود تھے۔"

بالمکند گپتا نے اپنے اخبار بھارت متر" میں اردو اخباروں پر ایک مقالہ ہندی زبان میں لکھا تھا اردو کے چند ادیبوں نے آپ سے فرمائش کی کہ آپ اس مقالہ کو اردو میں لکھ دیجئے رسالہ زمانہ" میں آپ کا یہ مقالہ دس شماروں میں شائع ہوا آخری حصہ جنوری ۱۹۰۵ء میں ختم ہوا۔ خدنگ نظر" کے سلسلے میں بالمکند ایڈیٹر بھارت متر لکھتے ہیں:

لکھنؤ ہی سے خدنگ نظر" نامی ایک ماہوار رسالہ نکلتا تھا۔ اس کو آٹھواں سال چلتا ہے مالی حالت عمدہ نہ ہونے سے اس کا جولائی کا نمبر اب تک نہیں نکلا ہے، گذشتہ میں بھی کسی رئیس کی فیاضی نے اسے دوبارہ جان بخشی تھی اس کے ایک حصہ میں نظم ایک میں نثر اور ایک میں ناول ہوتا ہے۔ نثر میں اچھی اردو کے نمونے ہوتے ہیں اور نظم بھی زبان کے لحاظ سے عمدہ ہوتی ہے۔"

رسالہ "خدنگ نظر" کے کچھ ضوابط ملاحظہ فرمائیے جو نظر مرحوم نے ماہ ستمبر ۱۸۹۶ء کے شمارے میں دئے ہیں۔

(۱) "خدنگ نظر" مع اپنے ضمیمے کے ہر انگریزی مہینے کی شروع تاریخوں میں شائع ہوتا ہے۔
(۲) اس کی عام قیمت دو روپے سالانہ مع محصول ڈاک مگر پیشگی امرائے عظام سے پانچ روپے سالانہ تعلقہ داروں و والیان ملک کی بلند حوصلگی پر منحصر ہے جو حضرات پانچ روپے سالانہ سے زائد عنایت کریں گے ان کا نام نامی مربیان گلدستہ کی مد میں تحریر ہوا کرے گا جو عالی ہمت اصحاب دس روپے عنایت فرمائیں گے ان کا اسم گرامی ایک خاص جدول میں مع شکریہ شائع کیا جائے گا۔
(۳) نمونے کا پرچہ بغیر تین آنے وصول ہوئے کسی صاحب کی خدمت میں نہ پہنچ سکے گا۔
(۴) کلام خریدار اور غیر خریدار سب کا ایک ہی لحاظ سے انتخاب کیا جائے گا۔
(۵) انتخاب اشعار ایک خاص کمیٹی منصفانہ طور سے کرے گی۔
(۶) تخلص شعرا بہ لحاظ حروف تہجی مندرج ہوں گے۔

پہلا شمارہ ستمبر ۱۸۹۶ء میں شائع ہوا تھا اس میں منشی نوبت رائے نظر ملاحظہ طلب کے عنوان سے یوں رقم طراز ہیں:

حضرات ناظرین؟ کیا یہ ممکن نہیں کہ "خدنگ نظر" سے آنکھ لڑتے ہی آپ کی من چلی طبیعتیں آپ کے ہاتھوں کو اپنا اپنا دل سنبھال لینے کی غیر امتیاری تکلیف دے دیں۔ کیا "خدنگ نظر" کا مجموعی بیانفتہ پن بادی النظر میں اُس چلتے ہوئے جادو کی طرح (جو رات رات بھر جگایا گیا ہو) آپ کے جدت پسند اور منصف مزاج دلوں پر اپنا پورا پورا اثر دکھلانے کی قابلیت نہیں رکھتا کیا آپ کی مشتاق نگاہیں آپ کے بسیط خیالات کو لئے ہوئے "خدنگ نظر" کے ایک ایک صفحے پر اول سے آخر تک اسی طرح بالاتصال دوڑ جانے کی کوشش نہ کریں گی، جس طرح عنفوان شباب میں کسی نوعمر آدمی کی رگوں میں تازگی بخشی خون کا دورہ ہوا کرتا ہے۔ کیا "خدنگ نظر" کا ظاہری انداز کسی چلبلے اور شوخ چشم معشوق کی بے چین اداؤں اور فتنہ انگیز نگاہوں کی طرح آپ کے چوٹ کھائے ہوئے دل چھین لینے کو کافی نہیں ہو سکتا۔ یہ سب کچھ ممکن ہے مگر "خدنگ نظر" کو اپنے ظاہری تعلقات دکھا کر عاقل فریبی اور چھپی چھپی خود غرضی مدنظر نہیں بلکہ اس کا اصلی مقصود صرف اپنا وہی حسن معنوی دکھانا یا جتانا ہے

جس میں وہ بے حد جانکاہی اور کمال عرق ریزی کے ساتھ اپنے ہم عصروں میں کامیاب ہوا ہے۔ "خدنگ نظر" ان تازہ شوخ رنگ پھولوں کو چمنستان سخن کی لہلہاتی ہوئی کیاریوں سے چن چن کر خدا جانے کن کن حوصلوں اور کون کون سی تمناؤں کے ساتھ اپنے ہر ورق کے دامن امید میں لئے ہوئے آیا ہے۔ اس ہونہار گلدستہ کو ملک کے مربیانہ برتاؤ کی قریب قریب اسی قدر ضرورت ہے جس قدر ایک بار آور درخت کے پودے کو کسی چشمۂ فیض سے متصل پانی پہنچنے کی احتیاج ہوا کرتی ہے۔ اس کی دلی آرزو ایک ہرے بھرے کھیت کی ان پھوٹتی ہوئی کونپلوں سے مشابہ ہیں جو اپنے دست تمنا کو ابر کرم کے وسیع دامن تک پہنچا دینے کی دھن میں سیدھا آسمان کی طرف بڑھائے چلی جاتی ہیں۔ اگر اس گلدستہ کو ملک کی قدر دان نگاہوں نے کسی قدر غور کے ساتھ ملاحظہ کیا تو اس کی ترقیاں قابل دید ہوں گی امید کی جاتی ہے کہ "خدنگ نظر" اپنے کارنمایاں کے صلے میں ملک کی عام مقبولیت کا سارٹیفکٹ اور خاص خاص توجہ کی سند حاصل کریگا۔"

رسالہ "خدنگ نظر" کے ذریعۂ نظر مرحوم نے اردو ادب کی آٹھ سال تک بڑی گرانقدر ادبی اور قومی خدمات انجام دیں۔ لکھنؤ اسکول کے ممتاز اساتذۂ سخن صفیؔ، محشرؔ، عزیزؔ، ثاقبؔ، چکبستؔ، پنڈت بشن نرائن اور آبرؔ وغیرہ نے اس گلدستے کے لئے معرکۃ الآرا طرحوں میں غزلیں لکھ کر "خدنگ نظر" کو سارے ہندوستان میں مشہور اور مقبول کر دیا۔ حق بات تو یہ ہے کہ "خدنگ نظر" نے لکھنؤ اسکول کی پوری پوری نمائندگی کی اور وہاں کی بدنام شاعری میں، جو لوگوں کی نظر میں کھٹکتی تھی، ایک نیا رنگ پیدا کر دیا جس کی نمائندگی غزل میں عزیزؔ اور نظرؔ کا کلام کرتا ہے۔ نادر کاکوری کی مشہور نظمیں بھی "خدنگ نظر" میں شائع ہوئیں۔ عبد الحلیم شرر بھی جب تک "خدنگ نظر" نکلتا رہا اس کے لئے مضامین لکھتے رہے۔ خدنگ نظر میں جب حصہ نثر کا اضافہ کیا گیا تو اس کے حصہ نثر کی ادارت مولانا ابو الکلام آزاد مرحوم کو سپرد کی گئی۔ "خدنگ نظر" میں مولانا کا ایک مقالہ، "اکسیریز کی تاریخ پر شائع ہوا تھا جب یہ مقالہ مولانا شبلی کی نظر سے گزرا تو وہ مولانا سے بہت متاثر ہوئے۔ مولانا آزاد نظرؔ مرحوم کا بہت احترام کرتے تھے۔ نظرؔ کی وفات پر ان کا ایک مضمون بھی شائع ہوا تھا مولانا آزاد کی تمنا تھی کہ نظرؔ مرحوم کی غزلیات کا مجموعہ با حضرت جگر بریلوی

کی شاہکار کتاب یادگار نظر شائع ہو جائے تو نظر کا نام ادبی دنیا میں مٹنے سے بچ جائے۔ انجمن ترقی اردو ہند کے سکریٹری پروفیسر آل احمد سرور شکریے کے مستحق ہیں جنھوں نے انجمن ترقی اردو علی گڑھ کے لئے "یادگار نظر" کا مسودہ مطبع انوار احمدی الہ آباد والوں سے خریدا اور اب "یادگار نظر" کو انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ شائع کر رہی ہے۔ "خدنگ نظر" کی بابت نظر مرحوم رسالہ ادیب الہ آباد بابت ماہ جون ۱۹۱۱ء کے ایڈیٹوریل میں رقم طراز ہیں :

"شیخ صاحب (سر عبد القادر) ہمارے قدیم کرم فرما ہیں اور وہ "ادیب" کے علاوہ ہماری ادبی کوششوں کو "خدنگ نظر" کے مضمون پر بھی دیکھ چکے ہیں، چنانچہ ممدوح نے ادیب پر ریویو کرتے ہوئے مرحوم "خدنگ نظر" کو بھی یاد فرمایا ہے اور اسے ایک پر لطف گلدستہ کا خطاب دیا ہے۔ درحقیقت وہ ایک گلدستہ تھا لیکن عام گلدستوں کی طرح اس میں محض ہم طرح غزلیات ہی نہ ہوتی تھیں بلکہ اس کے پہلے ہی نمبر میں جو ستمبر ۱۸۹۶ء میں شائع ہوا تھا ایک قصیدہ، چند قطعات اور ایک نثر مضمون بھی شامل تھا عرصہ تک اس قسم کی ناکام کوششوں کے بعد جنوری ۱۹۰۰ء سے اس کے ساتھ نثر مضامین کا مستقل سلسلہ شروع ہوگیا تھا جن میں بیشتر مضامین ملک کے مشہور ادیب مولوی عبد الحلیم صاحب شرر کے جادو نگار قلم سے ہوتے تھے۔ اکثر نیچرل رنگ کی نظمیں بھی چھپتی تھیں جن کا زیادہ حصہ منشی نادر علی صاحب نادر کے زور تخیل کا نتیجہ ہوتا تھا"

منشی اقبال ورما سحر ہنگامی مرحوم نے نظر مرحوم پر ایک مقالہ رسالہ زمانہ جنوری ۱۹۲۴ء میں لکھا تھا۔ "خدنگ نظر" کے متعلق یوں رقم طراز ہیں :

"سب سے پہلا علمی کام جس کو نظر آنجہانی نے ایک مستقل صورت میں شائقین علم و ادب کے سامنے پیش کیا جو "خدنگ نظر" نامی ماہوار رسالہ تھا۔ یہ رسالہ ستمبر ۱۸۹۷ء میں لکھنؤ سے جاری ہوا۔ کئی سال ہوئے کہ مجھے اتفاق سے اس پرچہ کی چند پرانی کاپیاں مل گئی تھیں لیکن میری غفلت سے تھوڑے ہی دنوں بعد ضائع بھی ہوگئیں۔ یہ رسالہ دراصل اردو غزلیات کا ایک ماہانہ گلدستہ تھا اس وقت ملک میں اس قسم کے گلدستے نکلنے

کا رواج عام تھا مگر "خدنگ نظر" میں بعد کو کچھ نثر کے مضامین بھی چھپنے لگے تھے۔ جناب آغا نظر مرحوم نے بھی اس رسالہ کو کامیاب بنانے میں خاص مدد دی تھی غزلیات کی فراہمی کے لیے انھوں نے مشاعروں کے انعقاد کا کافی بندوبست کیا تھا۔ غرض پوری کوشش کی گئی تھی کہ شعرائے وقت کا کلام زیادہ سے زیادہ دستیاب ہو سکے اور "خدنگ نظر" ایک چوٹی کا رسالہ ہو۔ وقت کے لحاظ سے پرچہ واقعی شاندار تھا لیکن ان سب باتوں کے باوجود بھی وہ چند سال سے زیادہ زندہ نہ رہ سکا۔ نظر مرحوم کو اس کے بند ہو جانے کا رنج تمام عمر رہا۔"

خواجہ مقبول احمد نے (الہ آباد یونیورسٹی) اردو ادب کے آزاد نمبر میں ابو الکلام کی صحافت کے عنوان سے جو مقالہ سپردِ قلم کیا ہے اس میں لکھتے ہیں:

"اس زمانے میں بعض ایسے رسالے نکلتے تھے جن میں مصرع طرح پر کہی ہوئی غزلوں کے مجموعے چھاپے جاتے تھے وہ گلدستے کے نام سے مشہور ہوتے تھے "پیام یار" اور "خدنگ نظر" اس زمانے کے مشہور گلدستوں میں سے تھے۔"

منشی نوبت رائے نظر کی زیادہ تر غزلیں "خدنگ نظر" "ادیب" "زمانہ" اور "مخزن" میں شائع ہوئیں۔ چند منتخب اشعار ملاحظہ فرمائیے:

دل کی حالت نہیں سنبھلنے کی　　اب یہ دنیا نہیں بدلنے کی

جب اس نے نقاب اپنی سرِ بزم الٹ دی　　پھر ہم نے کسی شمع کو سوزاں نہیں دیکھا
جس بحر میں ڈوبی دلِ مایوس کی کشتی　　اس میں کبھی اٹھتے ہوئے طوفاں نہیں دیکھا

نزع میں دیکھا جواں کو اپنے پاس آتے ہوئے　　اٹھ گئے اک بار دونوں ہاتھ تھراتے ہوئے

کوئی مجھ سا مستحقِ رحم و غمخواری نہیں　　سو مرض ہیں اور بظاہر کوئی بیماری نہیں

مری زبان سے تو سنتا نہیں خدا میری   تمھیں بلاؤ کہ آئے کہیں قضا میری

یا دل ہے مرا یا تیرا نقش کف پا ہے   غل ہے کہ اک آئینہ سر راہ پڑا ہے

دل تھا تو ہو رہا تھا احساس زندگی بھی   زندہ ہوں اب کہ مردہ یہ بھی خبر نہیں ہے

یاس و ناکامی سے بیچیں قلب مضطر ہو گیا   اب تیرا ملنا نہ ملنا سب برابر ہو گیا

قفس سے چھوٹ کے ہوا باغ باغ دل کیا   بہار دے گیا اُجڑا ہوا نشیمن بھی

گردش دہر بھی اک گردش پیمانہ ہے   ذرے ذرے میں تیرا جلوۂ مستانہ ہے

نظر صاحب کو ابتدائے زندگی ہی سے علم و ادب سے دلچسپی ہوگئی تھی۔ یہ دلچسپی آخر عمر تک اس طرح قائم رکھی کہ زندگی بھر انھوں نے کوئی اور مشغلہ اختیار ہی نہیں کیا ـــــ فطرت سے انھوں نے علم ادب کے لئے نہایت موزوں طبیعت پائی تھی۔ قدرت نے انھیں نہایت شستہ و سلیم ذوق سخن عطا کیا تھا۔ ان کا معیار خیال بہت اونچا، ان کا مطمح نظر بلند اور رفیع تھا۔ ان کی پسند مشکل ہوتی تھی، خیالات وسیع اور نظر غائر اور نکتہ رس رکھتے تھے۔ ہر اعتبار سے آپ کا کلام اردو کے بہترین شعراء کی صف میں جگہ پانے کا مستحق ہے۔ ان کی زبان صاف اور پاکیزہ، ان کی بندشیں چست اور طرز بیان ہمیشہ بے عیب ہوتا تھا۔ ان کا درجہ دور جدید کے تنقید نگاروں میں بہت اونچا تھا۔

(زمانہ۔ مئی ۲۳ء)

حالات حاضرہ

صدر جمہوریۂ ہند کا پیغام

اس سال یوم آزادی کے موقع پر صدر جمہوریۂ ہند ڈاکٹر رادھاکرشنن نے قوم کو جو پیغام دیا وہ ملک کے حالات کو دیکھتے ہوئے کئی لحاظ سے بہت اہم ہے۔ پچھلے پندرہ برس میں بلاشبہ ہم نے ترقی کی ہے اور ہماری معاشی حالت قدرے بہتر ہوئی ہے، صنعت، زرعی پیداوار، دیہی ترقی اور تعلیم کے میدان میں ہم نے جمہوری طریقہ کار اختیار کرکے نمایاں طور پر قدم آگے بڑھایا ہے۔ لیکن تہذیبی اور اخلاقی قدروں کے پیمانے سے اگر ہم ملک کی حالت کا جائزہ لیں تو ہمیں مایوسی ہوتی ہے۔ اس بات کا احساس ہر صاحب فہم ہندوستانی کو ہے اور ہمارے صدر نے اسی طرف ہماری توجہ دلائی ہے۔ انھوں نے کہا ہے کہ ہندوستانی سماج کو اگر کوئی چیز انتشار سے بچا سکتی ہے تو وہ جمہوریت ہے۔ اگر ہم اس کے اصولوں کو اپنائیں اور جمہوری طریقہ ہائے کار پر عمل پیرا رہیں تو ہم انتشار پیدا کرنے والے رجعت پرست اور سماج دشمن رجحانات سے کبھی اور کسی صورت میں سمجھوتہ نہیں کریں گے۔ انھوں نے اس طرف بھی اشارہ کیا کہ ہندوستان نام ہے اس کے کروڑوں انسانوں کا، ان کی ترقی، ان میں احترام انسانیت کے جذبہ کو پیدا کرنا، ان کو اخلاقی اور روحانی قدروں کے ایک سلسلہ میں منسلک کرنا ——— یہی ہندوستان کی حقیقی ترقی ہے، اس محاذ پر ناکامی کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم ہر محاذ پر ناکام رہے، ہماری مادی ترقیاں بے مقصد اور بے جان ثابت ہوں گی، اگر ہم نے جمہوریت اور انسانیت کے معیاروں کو نہیں اپنایا اور تنگ نظر عناصر کے ہاتھوں میں اپنی رہنمائی کا کام سونپ دیا۔

آئے دن ملک میں جو واقعات رونما ہوتے رہتے ہیں اور گذشتہ انتخابات کے موقع پر ملک میں انتشار پیدا کرنے والے رجحانات جس طرح ابھر کر سامنے آئے ہیں، اُس کے پیش نظر اس بات کی ضرورت شدت سے محسوس کی گئی کہ قومی یکجہتی کی ایک تحریک ملک گیر پیمانے پر چلائی جائے

اور قوم پر یہ واضح کیا جائے کہ بامقصد ترقی پذیر سماج کی تعمیر کے لئے ضروری ہے کہ ملک کا اتحاد برقرار رہے، جمہوری اصولوں کو عقیدے کے طور پر اپنایا جائے اور انسانی قدروں کے احترام کا عام چرچا ہو، بے شک یہ کام بہت ضروری ہے، لیکن افسوس ہے کہ قومی یکجہتی اور جذباتی ہم آہنگی سے متعلق عام طور پر ذہن صاف نہیں ہے، اس ذہنی پراگندگی کا سایہ ہماری قومی زندگی پر بھی پڑتا ہے، نتیجہ یہ ہے کہ قومی یکجہتی کی تحریک ابھی تک علمی اور نظری بحث و مباحثے کی منزل سے آگے نہیں بڑھی ہے۔

صدر جمہوریۂ ہند نے یہ بھی کہا کہ جمہوریت ہمیں جدیدیت کی طرف لے جائے گی، آج بیسویں صدی میں ہمارا زندہ رہنا ناممکن ہو جائے گا اگر ہم ایک گزرے ہوئے عہد کے اداروں کو سینے سے لگائے رہے، آج یہی ہمارے انتشار کا بڑا سبب ہے، ہمیں ہندوستانی تہذیب کی روح کو برقرار رکھتے ہوئے اپنے سماجی اور تہذیبی اداروں کی نئی تنظیم کرنا ہے' ہمارا یہی اقدام پائدار، مثبت اور صحت مند ہوگا۔ کسی باہری خطرہ سے محض وقتی طور پر متحد ہو جانا پائدار اور ترقی پذیر سماج کی تعمیر کی ضمانت نہیں ہو سکتی۔

شمالی سرحدوں کی طرف سے خطرہ

اس وقت جبکہ ہم ملک کی تعمیر و ترقی کے منصوبے کو عمل میں لانے کی جد و جہد کر رہے ہیں، چین کے جارحانہ رویے نے ہماری توجہ دفاعی مسائل کی طرف مرکوز کر دی ہے، اور اگرچہ اس وقت چین سے جنگ کے خطرہ نہیں ہے لیکن حالات بہت گمبھیر ہیں، ۱۵ اگست کو پنڈت نہرو نے کہا کہ ہمیں ہوشیار اور چوکنا رہنا چاہیئے' اس لئے کہ کچھ لوگ ہیں جو ہماری طرف کینہ پرور اور دشمن کی نگاہوں سے دیکھ رہے ہیں'' اس مہینے پارلیمنٹ میں جو مباحثہ ہوا اس کی روشنی میں بھی یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ لداخ کے علاقہ میں چین کی جارحانہ کارروائیوں کے سبب تناؤ بہت بڑھ گیا ہے اور مختلف طریقوں سے چین کے ارباب حل و عقد پر یہ بات واضح کر دی گئی ہے کہ کشمکش کی فضا ایسی زہریلی ہو گئی ہے کہ کوئی واقعہ جنگ کا پیش خیمہ بن سکتا ہے، اور جنگ صرف چین اور ہندوستان ہی کے لئے نہیں بلکہ ساری دنیا

کے لئے تباہ کن ہوگی۔ پارلیمنٹ میں حزب مخالف کے بعض رہنماؤں نے اس بات پر زور دیا تھا کہ جب تک چین مُسلمہ بین الاقوامی سرحدوں کے پیچھے نہ ہٹ جائے چین سے گفتگو نہ کی جائے، ان لوگوں کا خیال یہ بھی تھا اور خاص طور سے سوتنتر پارٹی کے لوگوں نے اس طرف اشارہ کیا تھا کہ اب ہمیں غیر جانبداری کی پالیسی کو ترک کر دینا چاہیئے ورنہ ہم اپنی آزادی کو نہیں بچا سکیں گے۔ لیکن پنڈت نہرو نے یہ مطالبہ کیا کہ حکومت ہند کو اس معاملہ میں پوری آزادی دینا چاہیئے انھوں نے کہا کہ چین کے معاملہ میں جو کچھ کیا جائے گا۔

اس سے پارلیمنٹ کو باخبر رکھا جائے گا اور کوئی ایسی صورت حال نہیں قبول کی جائے گی جس سے جو ملک کی آبرو اور وقار پر حرف آتا ہو، لیکن میری حکومت کو اتنی آزادی ہونا چاہیئے کہ اس معاملہ کو خوش اسلوبی سے طے کرے، پنڈت نہرو نے کہا گفتگو کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے البتہ سیاسی اصطلاح میں جسے گفت وشنید (NEGOTIATIONS) کہا جاتا ہے وہ اور چیز ہے اور اس کے آداب مختلف ہوتے ہیں، لیکن گفت وشنید سے پہلے چین کے ذمہ داروں سے گفتگو کرنا اور ان پر ہندوستان کے موقف کو واضح کر دینے میں فائدہ ہو سکتا ہے کہ تناؤ کی فضا ہلکی ہو اور معاملات کے طے کرنے میں آسانی ہو۔ پنڈت جی نے جس وقار اور اعتماد کے ساتھ یہ باتیں کہی ہیں، اور ان پر خود ملک کو جیسا بھروسہ ہے اس کے پیش نظر یہ امید کی جا سکتی ہے کہ حکومت ہند چین سے کوئی ایسا معاملہ نہیں کرے گی جو ایک آزاد قوم کے وقار کے شایانِ شان نہ ہو۔

ہندوستان نے غیر جانبداری کی پالیسی اختیار کر کے دنیا کی آزاد قوموں میں ایک باوقار جگہ پیدا کی ہے، اعصابی جنگ کے تباہ کن اثرات سے اپنے آپ کو محفوظ رکھا ہے۔ اور پسماندہ ملکوں کے کاز کو جرات اور اعتماد کے ساتھ آگے بڑھایا ہے، اس لئے جو لوگ یہ مشورہ دیتے ہیں کہ اب ہمیں اس پالیسی کو ترک کر دینا چاہیئے وہ درحقیقت ملک کو ایک ایسی صورت حال سے دوچار کرنا چاہتے ہیں، جہاں اس کی اپنی کوئی آواز نہیں ہوگی اور اکثر ناانصافی اور جبر کا ساتھ دینا ہوگا۔ عام طور پر یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے ملک میں ایک ایسا سماج چاہتے

ہیں جس میں مفاد پرستوں اور سرمایہ داروں کو پوری آزادی ہو اور سماجی انصاف ایک بے معنی چیز ہو کر رہ جائے، بلاشبہ ایسے لوگوں کے مشورے ملک کے لئے مجموعی طور پر مضرت رساں ہوں گے، یہی وہ لوگ ہیں جو رجعت پرست عناصر کے ساتھ گٹھ جوڑ کر کے ملک میں انتشار کی فضا پیدا کر رہے ہیں۔

پاکستان کا رویہ

ڈپلومیسی کے انداز بھی نرالے ہوتے ہیں، چین اور پاکستان کے موجودہ تعلقات کے بارے میں جو خبریں موصول ہوتی رہتی ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ اس وقت ہندوستان دشمنی کے جذبہ نے ان دونوں "متضاد مزاج" والے ملکوں کو ایک دوسرے سے قریب کر دیا ہے، حالانکہ دونوں ملک اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ ان کی راہیں مختلف ہیں پھر بھی ڈپلومیسی کا تقاضا ہے کہ ہندوستان پر دباؤ ڈالنے کے لئے وقتاً فوقتاً ایسی خبریں آتی رہیں جن سے معلوم ہو کہ چین اور ہندوستان کی دوستی بڑھ رہی ہے اس وقت پاکستان کی آرزو ہے کہ چین اور ہندوستان میں جنگ چھڑ جائے تو وہ کسی طرح کشمیر کے مسئلہ کی آڑ لے کر ہندوستان سے انتقام لے۔ یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ مشرقی پاکستان میں مغربی بنگال کی سرحد سے متصل، پاکستانی فوج خندقیں کھودنے کے کام تیزی سے کر رہی ہے۔ یہ بھی فضا کو گرم رکھنے کا طریقہ ہے، غالباً پاکستان کو یہ امید ہے کہ چین اور ہندوستان کے مابین جنگ کی صورت میں کشمیر پر قبضہ کرنے کا امکان بہت بڑھ جائے گا، پاکستان کا یہ رویہ آگ سے کھیلنے کے مترادف ہے جس کا انجام بہت خوفناک ہو سکتا ہے۔

"راکٹ سازی" کا مقابلہ

اس وقت متحدہ عرب جمہوریہ اور اسرائیل میں راکٹ بنانے کا مقابلہ ہو رہا ہے۔ درحقیقت اسلحہ بندی کی دوڑ میں آگے نکل جانے کا مقابلہ ہے۔ دونوں ملکوں میں راکٹ اڑائے جا چکے ہیں، مصر کا دعویٰ ہے کہ یہ اس کے اپنے سائنس دانوں کا کارنامہ ہے اور اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مصر ایٹمی اسلحہ سازی کی بنیاد رکھ رہا ہے۔ دوسری طرف اسرائیل سچ مچ ایٹمی اسلحوں کی تیاری میں مصروف ہے اور اس نے ڈمونا میں ایک کارخانہ بھی قائم کیا ہے، اس سلسلہ میں اسرائیل کیا کر رہا ہے اور اپنے اس منصوبے پر کتنا صرف کر رہا ہے، یہ بات اسرائیلی پارلیمنٹ کو بھی نہیں بتائی گئی ہے۔

راکٹ بغیر ایٹمی اسلحہ بندی کے بے کار ہیں، اسرائیل کے شہر مثلاً تل ابیب اور نیا یروشلم وغیرہ پھیلے ہوئے شہر ہیں اور جب تک مصری راکٹ با زوں کا نشانہ بالکل صحیح نہ ہو، اسرائیلی شہروں کو زیادہ نقصان نہیں پہنچ سکتا، برخلاف اس کے اسرائیل کا راکٹ مصر کے شہر قاہرہ اور اسکندریہ کو جو بہت گنجان اور سمٹی ہوئی آبادیاں ہیں، کافی نقصان پہنچا سکتے ہیں، خاص طور سے اس صورت میں جب اسرائیل ایٹمی طاقت بننے کے لئے دن رات کوشاں ہے۔

لیکن فوجی زاویۂ نگاہ سے قطع نظر سیاسی سطح پر اس کے اثرات زیادہ اور فوری نظر آتے ہیں۔ ادھر کئی سال سے اسرائیل کی آبادی کا خاصا حصہ اس صورت حال سے بیزار اور ہراساں ہے کہ عرب ممالک اسرائیل سے کسی قسم کے سمجھوتے کے لئے تیار نہیں ہوتے، ایک جنگ کی کیفیت ہے جو طاری ہے، انھیں یقین ہے کہ عرب کسی طرح یہودیوں کی اس ریاست کو برداشت نہیں کریں گے اور موقع ملتے ہی اسے ختم کر ڈالیں گے۔ یہ صورت اتنی غیر یقینی اور پریشان کن ہے کہ اسرائیل کی بوڑھی نسل اپنی نئی نسل کے مستقبل کی طرف سے لرزاں اور ترساں ہے، ان کے سامنے یہ سوال ہے کہ وہ کس کے لئے اسرائیل کی تعمیر میں اپنی توانائی اور دولت کھپائیں؟ نئی نسل کے غیر یقینی مستقبل کے لئے اتنی بھاری قربانی کی معقولیت پر اب انھیں شبہ ہونے لگا ہے۔ باہر کے سرمایہ دار اور مہاجن جو اسرائیل کے کمزور معاشی نظام کو چلا رہے ہیں، وہ بھی سوچ رہے ہیں کہ ایسے ملک میں اپنا سرمایہ لگانے سے کیا فائدہ؟ مصر کی راکٹ سازی کا واقعہ ان کو اور خوف زدہ کر دے گا۔ مزید براں، باہر سے آکر اسرائیل میں آباد ہونے والے یہودیوں کی تعداد پر بھی اس کا اثر پڑے گا۔

عرب ملکوں کا اختلاف

شام نے متحدہ عرب جمہوریہ پر الزام لگایا ہے کہ وہ جمہوریۂ شام کی ساورنٹی اور علاقائی سالمیت کا احترام نہیں کرتی۔" شام کی اس شکایت کو رسمی طور پر سننے کے لئے اس مہینے کے تیسرے ہفتہ میں لبنان میں عرب لیگ کا اجلاس ہوگا۔ اس اجلاس میں شام اپنی شکایات کو ایک میمورنڈم کی شکل میں پیش کرے گا۔ خیال ہے کہ اس میمورنڈم کے اہم نکات حسب ذیل ہوں گے۔

۱۔ متحدہ عرب جمہوریہ کے ریڈیو اور اخبارات نے بڑے پیمانے پر شام کے خلاف پروپیگنڈے کی مہم شروع کر رکھی ہے، مقصد یہ ہے کہ شام کی حکومت کا تختہ الٹ دیا جائے، اور مصر سے اس کا الحاق ہو جائے۔

۲۔ بیروت میں متحدہ عرب جمہوریہ کا سفارت خانہ شام میں اپنے ایجنٹ بھیجتا رہتا ہے، جو بموں کے دھماکے سے خوف کی ایک فضا پیدا کرتے ہیں اور دمشق کی حکومت کے خلاف سازشیں کرتے ہیں۔

۳۔ صدر ناصر نے خود اپنی ۲۳ جولائی کی تقریر میں شام کو متحدہ عرب جمہوریہ کا شمالی علاقہ قرار دیا اور اس طرح وہ اپنی سابقہ پالیسی سے پھر گئے کہ شام کا معاملہ اہلِ شام ہی کو طے کرنا ہے۔

۴۔ کرنل عبدالحمید سراج نے جو ناصر کے آدمی ہیں، لبنان میں ایک SHADOW CABINET بنائی ہے اور وہ اس کی تیاری کر رہے ہیں کہ شام میں داخل ہو کر اپنی حکومت قائم کریں۔

ان الزامات کا جواب متحدہ عرب جمہوریہ کے پاس تیار ہے۔ قاہرہ والوں کا کہنا ہے کہ شام نے خود پروپیگنڈے کی سرد جنگ کا آغاز کیا ہے۔ لبنان کے وزیر داخلہ کمال جمبلاط نے اعلان کیا ہے کہ یہ بات بالکل بے بنیاد ہے کہ لبنان میں ناصر دوست عناصر شام کے خلاف کوئی سازش کر رہے ہیں۔ شام کو صدر ناصر نے شمالی علاقہ ضرور کہا مگر وہ محض نظری اعتبار سے، یعنی یہ کہ ایک عرب قوم ہے اور اہلِ شام اس قوم کے وطن کے شمالی حصہ میں آباد ہیں۔

صورت حال یہ ہے کہ عرب لیگ کے جلسہ میں ایک عرب قوم دوسری عرب قوم کے خلاف الزامات لگائے گی اور اس طرح عرب قومیت کے تصور کا کھوکھلا پن ثابت کرے گی، اس موقع پر سعودی عرب اور اُردن، شام کی تائید کریں گے، کیوں کہ آج کل متحدہ عرب جمہوریہ سے ان کے تعلقات خراب ہیں، عراق، جو شام کی حمایت میں ہوتا، غالباً اس جلسہ میں شریک نہیں ہوگا کیوں کہ وہ عرب لیگ سے اس لئے ناراض ہے کہ کویت کو اس کی رکنیت کیسے ملی، باقی دوسری عرب ریاستیں اس کی کوشش کریں گی کہ گھر کا یہ جھگڑا دب جائے اور معاملہ درہم برہم ہو جائے۔

تعلیمی مسائل

"یُوتھ ہوسٹل"

جرمنی کے ایک نیک دل اُستاد رچرڈ شرمن نے ۱۹۰۹ء میں "یوتھ ہوسٹلز ایسوسی ایشن" قائم کی۔ وہ بڑے شہروں میں بسنے والے بچّوں کی زندگی کو خوشگوار بنانا چاہتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ بچّوں کو مناظرِ قدرت سے لگاؤ پیدا کرنے کے لئے گھومنے پھرنے کی ترغیب دینی چاہیئے۔ لیکن خاص طور پر محدود وسائل رکھنے والے نوجوانوں کی طرف ان کا دھیان تھا تاکہ سیر و تفریح کے بہانے سے انھیں اپنے دیس سے بخوبی روشناس ہونے کا موقع مل سکے۔ اور دورانِ سفر میں قیام کے لئے مناسب جگہ میسّر آسکے۔ سب سے پہلے انھوں نے جرمنی میں الٹینا مقام پر اپنے مدرسے میں "یوتھ ہوسٹل" قائم کیا۔ تعلیمی سیر کے دوران میں ان کے مدرسے کے طلبہ نے بڑی زحمتیں اٹھائی تھیں اور قیام کے لئے کہیں معقول انتظام نہ ہو سکا تھا۔ اس صورتِ حال سے متاثر ہو کر انھوں نے مختلف مقامات سے آنے والے طلبہ کے ٹھہرنے کا بندوبست اپنے مدرسے میں کیا۔ اور دوسروں کو اس طرف توجہ دلائی۔ اُن کی یہ اسکیم کافی مقبول ہوئی اور رفتہ رفتہ اس میں وسعت پیدا ہوتی گئی۔ ابتدا میں یہ اسکیم محض مدرسے کے بچّوں تک محدود تھی لیکن کچھ عرصے کے بعد نوجوانوں کو بھی اس پروگرام میں شامل کر لیا گیا۔

تقریباً دو سال گزرے کہ رچرڈ شرمن ۸۷ سال کی عمر میں اس دارِ فانی سے کوچ کر گئے لیکن ان کی زندگی ہی میں یوتھ ہوسٹل تحریک نے بین الاقوامی شہرت اور مقبولیت حاصل کر لی اور دنیا کے بہت سے ممالک میں 'یوتھ ہوسٹل' قائم ہو گئے۔ اب ان کی تعداد میں روز افزوں ترقی ہو رہی ہے۔ 'یوتھ ہوسٹل تحریک' ساکنانِ عالم میں ربطِ باہمی پیدا کرنے کا ایک نہایت ہی دلچسپ اور موثر ذریعہ ہے۔ اس طرح آپس میں مفاہمت پیدا ہوتی ہے اور رواداری بڑھتی ہے۔ نوجوانوں کے ذہنوں میں وسعت اور دلوں میں کشادگی آتی ہے جو

انھیں انسانیت کا علم بردار بناتی ہے۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد یہ تحریک، جرمنی کے علاوہ سوئٹزرلینڈ، بلجیم اور ہالینڈ، فرانس اور انگلستان میں پھیلی۔ اور ۱۹۳۲ء میں اس کی بین الاقوامی انجمن قائم ہوئی جس کی رکنیت ہر ایک ملک کی انجمن کو حاصل تھی۔ ایسے چند اصولوں پر سب کو کاربند ہونے کے لئے کہا گیا جن کی بنا پر سیاحوں کو بیرونی ممالک میں سہولت حاصل ہو سکے۔ ہر ایک ملک کی انجمن نے ایک دوسرے کی رکنیت کا کارڈ تسلیم کیا اور سب کارڈ یکساں طرز پر تیار ہوئے۔ اس انجمن میں سب سے زیادہ قابل فخر اور نمایاں بات یہ رکھی گئی کہ اس کی رکنیت بلا اختلاف رنگ و نسل اور قوم و ملک سب کے لئے صلائے عام رہی۔ اس وقت سے بلا دقت ہر ایک ملک کی انجمن اپنے مزاج کے مطابق ترقی کر رہی ہے اور اس کی کارگزاریوں میں وہاں کی تہذیب و معاشرت کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔

'یوتھ ہوسٹل' کو ایک باقاعدہ 'اقامت گاہ' یا باضابطہ 'آسائش گاہ' نہیں سمجھنا چاہیئے انھیں ایک ایسی جائے قیام تصور کیا جا سکتا ہے جہاں صرف چند پیسوں میں دو تین دن تک مقیم رہا جا سکتا ہے۔ ان کا مقصد گھوم پھر کر دیس دیکھنے والوں اور دیس بدیس کے سیاحوں کو معمولی سہولتیں فراہم کرنا ہے۔ یہ عیش و آرام کی سہولتیں فراہم نہیں کرتے۔ انھیں تعلیمی سیر کے حصولِ مقاصد کا ایک معقول ذریعہ سمجھنا چاہیئے۔ ایشیائی ممالک میں سب سے پہلے ۱۹۴۹ء میں ہمارے ملک میں 'یوتھ ہوسٹل کی تحریک' کا آغاز ہوا۔ گذشتہ دس بارہ سال میں اس انجمن نے 'یوتھ ہوسٹل تحریک' کو مقبول بنانے میں بڑی کامیابی حاصل کی ہے۔ اس وقت تقریباً ۱۴۰ ہوسٹل موجود ہیں۔ اور مختلف ریاستوں نے متعدد ڈاک بنگلوں اور دوسری سرکاری قیام گاہوں میں یوتھ ہوسٹل انجمن کے ممبران کو 'رین بسیرے' کی اجازت صرف آٹھ آنے یومیہ پر عنایت کر رکھی ہے۔ ۱۹۵۶ء میں ہمارا ملک باضابطہ طور پر بین الاقوامی انجمن کا مستقل رکن قرار دے دیا گیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اپنے ملک کی انجمن کی تین روپے سالانہ فیس رکنیت ادا کرنے کے بعد آپ دنیا کے مختلف ممالک میں پھیلے ہوئے تین ہزار 'یوتھ ہوسٹلوں' میں قیام کر سکتے ہیں اور اس طرح دور دراز ممالک میں بسنے والوں سے 'قلمی دوستی' پیدا کی جا سکتی ہے۔ اپنے دیس سے واقفیت حاصل کرنے کی آسان صورت ہاتھ آجاتی ہے اور نوجوانوں کے کردار کی تربیت ہوتی ہے۔ ان میں ضبط پیدا ہوتا ہے اور ذمہ داری کا احساس بڑھتا ہے۔

باقاعدگی کے ساتھ صحرا نوردی کرنے سے نہ صرف جسم کو فائدہ پہنچتا ہے بلکہ ذہنی اور جذباتی آسودگی بھی حاصل ہوتی ہے۔ تفریح اور ورزش کی نیت سے دور دور تک پیدل سفر کرنے سے صرف جہاں گردی ہی نہیں ہوا کرتی بلکہ وسعت نظر بھی پیدا ہوتی ہے اور عظمت وطن کا احساس بھی بیدار ہوتا ہے۔ 'یوتھ ہوسٹل تحریک' کو ہر قسم کے امتیازات سے پاک رکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ معتقدات وخیالات اور دولت ومرتبہ کا لحاظ کئے بغیر پندرہ سال سے زائد عمر کا ہر ایک فرد 'یوتھ ہوسٹل انجمن' کا رکن بن سکتا ہے۔ یہاں پر کسی قسم کے سیاسی معتقدات کے اظہار اور تلقین کی اجازت بھی نہیں دی جاتی ہے۔ قومی ہم آہنگی اور جذباتی یگانگت پیدا کرنے کا یہ ایک بہت ہی اچھا ذریعہ ہے۔ اس کی بدولت مختلف علاقوں اور ریاستوں کے بسنے والے ایک دوسرے کے قریب آسکتے ہیں اور یک جہتی کے جذبے کو توانائی بخش سکتے ہیں۔ ہمارے دیس کے سنوارنے میں دستِ قدرت نے بڑی فیاضی سے کام لیا ہے اور تاریخ کے ہر دور میں یہاں کے رہنے والوں نے اپنے ذوقِ نظر اور قوتِ بازو سے پورے خلوصِ نیت کے ساتھ اس کو چار چاند لگائے ہیں۔ اس انجمن سے وابستگی ان سب سے لطف اندوز ہونے اور اپنی چشمِ بصیرت کو وا کرنے کا موقع فراہم کرتی ہے۔ اس کے ذریعے ربط باہمی بڑھتا ہے اور اشتراک وتعاون کی تعلیم ملتی ہے۔

یوتھ ہوسٹل انجمن کا رکن انفرادی طور پر بھی بنایا جا سکتا ہے اور اجتماعی طور پر بھی۔ ہر ایک ادارہ اپنے دارالاقامے میں 'یوتھ ہوسٹل' کے اراکین کے لئے مستقل طور پر یا کسی مخصوص زمانے میں کچھ نہ کچھ جگہ قیام کے لئے ضرور مہیا کرتا ہے اور یہ بھی بتاتا ہے کہ دیگر سہولتیں کیا کیا میسر آسکتی ہیں۔ اسی لحاظ سے سیاح آتے رہتے ہیں۔ اس کے علاوہ چند راحت فضا اور تاریخی مقامات پر مستقل عمارتیں بھی مہیا کی گئی ہیں۔ ہر ایک سیاح 'یوتھ ہوسٹل' پہنچتے ہی وہاں کے اتالیق کی خدمت میں اپنی رکنیت کا کارڈ پیش کرتا ہے اور اس ہوسٹل کے قواعد وضوابط کی پوری طرح پابندی کرتا ہے۔ دورانِ قیام میں اسے ہوسٹل کے تہذیبی اور تفریحی مشاغل میں شرکت کا موقع حاصل ہوتا ہے اور وہ وہاں کے معمولات میں حصہ لے سکتا ہے۔ روانگی کے وقت

رکنیت کا کارڈ واپس کیا جاتا ہے جو اس کے مہذبانہ طرزِ عمل کا ثبوت ہوتا ہے۔ اب ضرورت یہ ہے کہ ملک کے بیشتر تفریحی اور تہذیبی مرکزوں کے قریب 'یوتھ ہوسٹل' قائم کئے جائیں اور بڑے بڑے سب ہی تعلیمی ادارے 'یوتھ ہوسٹل انجمن' کی رکنیت اپنی تعلیمی اور اخلاقی ذمہ داری تصور کریں عموماً تعلیمی ادارے اپنی غیر نصابی دلچسپیوں میں تعلیمی سیر کو بڑی اہمیت دیتے ہیں۔ لیکن اس کی صورت اکثر و بیشتر ایک سالانہ رسم کی سی ہو گئی ہے۔ اگر اس تعلیمی سیر کے پروگرام میں 'یوتھ ہوسٹل تحریک' کی روح پھونک دی جائے اور بڑی بڑی تعطیلات کو اس ڈھنگ سے 'بھارت درشن' میں صرف کرایا جائے تو بہتر نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔ دوسرے قومی پنجسالہ منصوبے میں دس لاکھ روپیہ 'یوتھ ہوسٹل تحریک' کے فروغ کے لئے رکھا گیا تھا اور تیسرے منصوبے میں یہ رقم بارہ لاکھ تجویز کی گئی ہے۔ اب حکومت ہند کی طرف سے ایک مرکزی کمیٹی نامزد کی گئی ہے جو 'یوتھ ہوسٹل تحریک' کو نوجوانوں کی فلاح و بہبود کے کاموں میں مناسب جگہ دینے کے لئے تجاویز مرتب کرے گی اور حکومت کو اس کی ترقی کے سلسلے میں مختلف مشورے دے گی۔

ہماری "یوتھ ہوسٹل انجمن" کے نشان پر "چرن دے مدھو وِندت" درج ہے یعنی "گھومنے سے شہد حاصل ہوتا ہے"۔ یہ مقولہ ہمیں انجمن کے مقصد کی طرف توجہ دلاتا ہے اور 'سفر وسیلہ ظفر' کے قول کی یاد تازہ کرتا ہے۔ سچ ہے۔ سیر میں خیر!

'معلّم'

تعارف و تبصرہ

(تبصرہ کے لئے ہر کتاب کے دو نسخے بھیجے جائیں)

بابائے اُردو مولوی عبدالحق   مرتبہ: عبداللطیف اعظمی

سائز ۲۰×۳۰/۱۶، حجم ۳۲۰ صفحات، کتابت و طباعت عمدہ۔ مجلد مع گرد پوش
قیمت ساڑھے چار روپے۔ تاریخ اشاعت: جولائی ۱۹۶۲ء
ناشر: ادارۂ فروغ اردو۔ امین آباد پارک۔ لکھنؤ۔

۱۶ راگست ۶۲ء کو بابائے اردو مولوی عبدالحق صاحب کی وفات کو ایک سال ہو گیا ہے۔ اس عرصے میں بابائے اردو پر کس قدر لکھا گیا ہے، اس کے بارے میں ایک پاکستانی ادیب جناب حمایت علی شاعر لکھتے ہیں "بابا کے بعد کتنے رسائل نے ان کے کارناموں کا جائزہ لیا، کتنے ادیبوں نے انھیں خراج عقیدت پیش کیا؟ ــــ مجھے یاد ہے کہ کراچی اور حیدرآباد کے دو تین ماہناموں اور لاہور کے "ادب لطیف" کے علاوہ کسی رسالے کے ایڈیٹر نے یہ زحمت گوارا نہ کی کہ کوئی مبسوط نمبر شائع کرتا۔ کراچی اور لاہور کے مذکورہ رسائل نے بھی صرف چند صفحات مخصوص کئے اور بس! ــــ اس کے برعکس ہندوستان کے رسالوں نے بڑے ضخیم نمبر شائع کئے ــــ ہندوستان، جہاں اردو ختم ہو رہی ہے" (نئی قدریں۔ حیدرآباد دیاک۔ اگست ۶۲ء)

ہندوستان ہی کو یہ فخر بھی حاصل ہے کہ یہاں سے سب سے پہلے بابائے اُردو پر ایک جامع اور مبسوط کتاب شائع ہوئی ہے۔ اس کتاب میں مرحوم کی شخصیت، ان کے علمی کارناموں اور انجمن ترقی اردو کی ابتدا سے اب تک کی تاریخ پر ہندوستان و پاکستان کے مشہور اصحاب قلم کے مضامین اور مرحوم کے منتخب خطوط شامل ہیں۔ بابائے اردو کی زندگی میں اور ان کی وفات

کے بعد ان کے متعلق جو مضامین شائع ہوئے ہیں، ان میں سے شاید ہی کوئی اچھا مضمون اس کتاب میں شامل ہونے سے رہ گیا ہو۔

اس کتاب میں جن لوگوں کے مضامین شامل ہیں، ان میں ڈاکٹر سید عابد حسین، پروفیسر رشید احمد صدیقی، جناب اسلوب احمد انصاری، جناب خواجہ حمید الدین شاہد اور جناب نصیر الدین ہاشمی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

ادیب (عبدالسلام نمبر) مرتبہ: کبیر احمد جائسی

جناب کبیر احمد جائسی صاحب، مولانا عبدالسلام صاحب ندوی مرحوم سے بڑی عقیدت رکھتے ہیں۔ انھیں بجا طور پر شکایت ہے کہ مولانائے مرحوم کی وہ قدر و عزت نہیں ہوئی، جس کے وہ مستحق تھے لیکن، جیسا کہ خود جائسی صاحب نے لکھا ہے، اس کی بڑی وجہ مولانا کی خلوت پسندی ہے۔ جائسی صاحب کو مولانائے مرحوم سے بہت گہرا تعلق رہا ہے، اس لئے ان کے احوال و کوائف اور خیالات معتقدات سے انھیں براہِ راست واقفیت حاصل ہے اور بقول خود وہ مولانا کی تحریروں کے ادا شناس ہیں، اس لئے اپنی کم عمری کے باوجود وہ مرحوم کے بارے میں لکھنے کے اہل اور مستحق ہیں۔ چنانچہ انھوں نے اس طویل مقالے میں اپنی اہلیت اور واقفیت کا پورا ثبوت دیا ہے اور مولانائے مرحوم کی خصوصیات اور کارناموں کو پوری طرح اجاگر کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ لیکن اس کے باوجود یہ مقالہ مولانائے مرحوم کی شخصیت اور علمی کارناموں کا محض ایک سرسری جائزہ ہے۔ اگر موصوف چاہتے ہیں کہ مولانائے مرحوم کی صحیح تصویر دنیا کے سامنے آئے، جو ان کی خلوت پسندی اور مخصوص مزاجی کیفیت کی وجہ سے سامنے نہ آسکی، تو اس کے لئے ایک مبسوط کتاب کی ضرورت ہوگی۔

جائسی صاحب کے اس خیال سے اتفاق کرنا مشکل ہے کہ مولانا کی مطبوعہ کتابوں سے ان کے مذہبی افکار و خیالات کا صحیح اندازہ نہیں کیا جا سکتا اور موصوف نے مرحوم کے جس مسودہ کو ان کے مجتہدانہ خیالات کا واحد ماخذ قرار دیا ہے وہ جب تک مکمل طور پر شائع ہو کر سامنے نہ آجائے، محض اقتباسات کی بنا پر کوئی رائے قائم نہیں کی جا سکتی۔

بہر حال کبیر احمد جائسی صاحب نے یہ مقالہ لکھ کر ایک ضروری اور مفید کام انجام دیا ہے۔ مگر اسے محض آغاز سمجھنا چاہیئے۔

"ادیب" کا یہ خاص نمبر جامعہ اُردو۔ علی گڑھ سے خریدا جا سکتا ہے۔ ایک پرچہ کی قیمت پچاس نئے پیسے ہے اور سالانہ چندہ سات رُوپیے۔ مدیر جناب ابن فرید صاحب ہیں۔

ادارۂ تعلیم و ترقی کی معلوماتی کتابیں

ادارۂ تعلیم و ترقی کا ایک شعبہ تصنیف و تالیف ہے، جو ایک طویل عرصہ سے ان پڑھ اور نو خواندہ بالغوں کے لئے کتابیں تیار کرتا اور شائع کرتا ہے۔ اس سلسلہ میں اس نے اُردو ہندی میں بہت مفید اور ضروری کتابیں شائع کی ہیں۔ اب اس نے "اپنی دنیا" کے نام سے ایک معلوماتی سلسلہ شروع کیا ہے۔ اس سلسلے کی حسب ذیل کتابیں ابھی حال میں شائع ہوئی ہیں:۔

(۱) برف کا گھر : از محمد حسین حسان

(۲) موسم کے بارے میں سَو سوالات اور ان کے جوابات : از محمد امین

(۳) برف کے تیرتے پہاڑ : از مجیب احمد خاں

حسین حسان صاحب بچوں کے مشہور رسالہ "پیام تعلیم" کے ایک طویل عرصے تک اڈیٹر رہ چکے ہیں اور بچوں کے لئے متعدد کتابیں لکھی ہیں، اس لئے موصوف کو آسان زبان پر بڑی قدرت حاصل ہے، طرز تحریر بھی بچّوں کی مناسبت اور ان کے مزاج کے مطابق ہوتا ہے۔ اس لئے ان کی کتابیں نو عمر بچے اور نو خواندہ بالغ بڑے شوق سے پڑھتے ہیں۔ محمد امین صاحب کا خاص مضمون جغرافیہ ہے۔ اس لئے "موسم کے بارے میں سو سوالات اور ان کے جوابات" بڑی مفید اور پر از معلومات کتاب ہے۔ "برف کے تیرتے پہاڑ" پندرہ صفحے کا ایک کتابچہ ہے۔ اس میں زمین کی پیدائش کا مختصر حال بیان کرنے کے بعد آئس برگ (برف کے تودے) کے متعلق تفصیل سے بتلایا گیا ہے۔

ان تین کتابوں میں سر دو بلاک کے ذریعہ چھپی ہیں، لیتھو کی طباعت بھی بہت اچھی ہے حسب ضرورت ان میں بلاک کی تصویریں بھی ہیں۔ قیمت درج نہیں ہے۔ ادارۂ تعلیم و ترقی جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵ سے خریدی جا سکتی ہیں۔

جامعہ میں صحبت شعر و سخن

یوم آزادی کے سلسلے میں ۱۴ اگست کی رات میں ریڈیو پر کل ہند مشاعرہ ہوا تھا۔ اُن دنوں جامعہ میں چھٹیاں تھیں، اس لئے کوئی بڑا مشاعرہ تو منعقد نہیں کیا جا سکا، مگر ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب اور غلام ربانی تاباں صاحب کی دعوت پر ۱۵ اگست کو چند شعرا جامعہ تشریف لائے اور اپنے کلام سے حاضرین کو محظوظ فرمایا۔ ذیل میں وہ غزلیں پیش کی جاتی ہیں، جو اس مختصر صحبت میں سنائی گئی تھیں۔

محترمہ ممتاز مرزا

اے محوِ انتظار سحر کی دُعا نہ مانگ
کچھ اور درد مانگ خدا سے دوا نہ مانگ

شاہد ہے میرے جرم کی پیاری کائنات
مجھ سے ثبوتِ جرمِ وفا بے وفا نہ مانگ

بے آسرے گزار بھی دے اپنی زندگی!
مہر و وفا کا ذکر ہی کیا ہے جفا نہ مانگ

تیرے شعورِ غم پہ طلب کا ہے انحصار
کیسے بتاؤں عشق میں کیا مانگ کیا نہ مانگ

ہونا پڑے نہ حشر میں قاتل کو شرمسار
ممتاز جو ہوا سو ہوا، خوں بہا نہ مانگ

ڈاکٹر وحید اختر

تم گئے ساتھ اجالوں کا بھی چھوٹا ٹھیرا
روز و شب اپنا مقدر ہی اندھیرا ٹھیرا

کوئی الزام نسیمِ سحری پر نہ گیا
پھول ہنسنے پہ خطاوار اکیلا ٹھیرا

موتیاں رہ گئیں، بولے اڑی آوارہ صبا
قافلہ موجِ بہاراں کا بس اتنا ٹھیرا

روز نظروں سے گذرتے ہیں ہزاروں چہرے — سامنے دل کے مگر اک یہی چہرا ٹھیرا
وقت بھی سعیِ مداوائے الم نہ کر سکا — جب سے تم بچھڑے ہو خود وقت ہی ٹھیرا ٹھیرا
گنگنا لیں گے غزل آج وحید اخترؔ کی
نام لینا ہی جو در پردہ تمہارا ٹھیرا

جناب شاذؔ تمکنت

حیات راس نہ آئے اجل بہانہ کرے — یہ تیرے بغیر بھی جینا پڑے، خدا نہ کرے
میں روز مرتا ہوں اس انتظار کے صدقے — بُرا نہ مان اگر زندگی وفا نہ کرے
ہم ایک ہو گئے دو دن میں کس طرح اللہ — یہی دُعا ہے کوئی تیسرا جُدا نہ کرے
میں اپنی روشنیٔ طبع سے لرزتا ہوں — مرا جنوں مجھے منزل سے آشنا نہ کرے
منایا جشنِ شبِ غم کہ ایک دن تو کٹا — جو تجھ سے چھوٹ کے جیتا ہے وہ کیا نہ کرے
میں کیا بتاؤں کہ قربت کا فاصلہ کیا ہے
کہ جیسے گھر تو بنائے کوئی رہا نہ کرے

جناب اخترؔ سعید

اک کرن مہر کی ظلمات پہ بھاری ہو گی — رات ان کی ہے مگر صبح ہماری ہو گی
اسی نسبت سے سحر نکھری ہوئی آئے گی — جس قدر رات یہ بیمار پہ بھاری ہو گی
یہ جو ملتی ہے ترے غم سے غمِ دہر کی شکل — دل نے تصویر سے تصویر اُتاری ہو گی
اس طرف بھی کوئی خوشبو سے مہکتا جھونکا — اے صبا تو نے تو وہ زلف سنواری ہو گی
ہم صفیرانِ چمن مل کے پکاریں تو ذرا — یہیں خوابیدہ کہیں بادِ بہاری ہو گی
بوئے گل آتی ہے مٹی سے چمن کی جب تک
ہم پہ وحشت نہ خزاں کی کبھی طاری ہو گی

جناب نشور واحدی

اُن سرمگیں آنکھوں میں آنسو بسِ مژگاں ہے
کچھ دُھواں اندھیرا ہے کچھ دورِ چراغاں ہے

اس غم کا نگہباں ہوں جو دل سے نہیں جاتا
کانٹا ہی سہی لیکن مانوسِ گلستاں ہے

اے گردِ رہِ دانش، تو تیز قدم ہو جا
میں نکہتِ گلشن ہوں میرا سفر آساں ہے

دولت کی وہی مستی ذہنوں کی وہی پستی
وہ دَور غلامی تھا یہ دَورِ غلاماں ہے

جناب میکش اکبرآبادی

جام لا جام کہ عالم گزراں ہے ساقی
بادہ دے بادہ کہ غم دل پہ گراں ہے ساقی

کیا غمِ زیست کہ جز وہم و گماں کچھ بھی نہیں
کیا غمِ حشر کہ یاں ہے سو وہاں ہے ساقی

جمع ہے سارا زمانہ ترے مے خانے میں
جسے انسان کہیں ہم وہ کہاں ہے ساقی

پی کے جب گرنے لگوں میں تو ذرا دھیان رہے
سر مرا خوگرِ آغوشِ بُتاں ہے ساقی

کل سنوں گا غمِ فردا ابھی جو فرصت ہو گی
لا مرا ساغرِ امروز کہاں ہے ساقی

کوئی غم غیرِ غمِ بادہ نہیں مجھ کو ملال
یہ غمِ سود و زیاں دل کا زیاں ہے ساقی

ترے میکش کو نہیں خواہشِ عیشِ دو جہاں
بادہ خود مایۂ عیشِ دو جہاں ہے ساقی

کوائف جامعہ

مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کی وفات پر تعزیتی جلسہ

۲ر اگست کی صبح کو یکایک مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کی وفات کی اندوہناک اطلاع ملی تو فوراً جامعہ کے تمام اداروں میں تعطیل کردی گئی اور شیخ الجامعہ پروفیسر محمد مجیب صاحب اور ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب اسی وقت مرحوم کے جائے قیام پر تعزیت کے لئے تشریف لے گئے اور اس کے بعد ہی جامعہ کے دوسرے اساتذہ اور کارکنوں نے بھی وہاں جاکر خراج عقیدت پیش کیا۔

چند دنوں کے بعد انجمن اساتذہ کے اہتمام اور شیخ الجامعہ صاحب کی صدارت میں جامعہ کے استادوں، کارکنوں اور طالب علموں کا ایک تعزیتی جلسہ منعقد ہوا، جس میں ضیاء الحسن فاروقی صاحب، پرنسپل کالج نے مولانائے مرحوم پر ایک مضمون پڑھا، جسے ہم اسی شمارے میں شائع کررہے ہیں اور مولانا قاضی زین العابدین صاحب، استاد اسلامیات نے ایک تقریر کی، جس میں مرحوم کی خدمات پر روشنی ڈالی۔ آخر میں پروفیسر محمد مجیب صاحب نے اپنی صدارتی تقریر میں مرحوم کی امتیازی خصوصیات کو بیان کیا اور حسب ذیل ریزولیوشن پڑھ کر سنایا، جو بالاتفاق منظور ہوا:

"جامعہ ملیہ اسلامیہ کے استادوں، کارکنوں اور طالب علموں کا یہ جلسہ مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کی بے وقت موت پر اپنے رنج و غم کا اظہار کرتا ہے۔

مولانائے مرحوم مختلف فضائل و کمالاتِ علمی و عملی کا ایک گلدستہ صد رنگ و بو تھے جس کی خوشبو سے سارے ہندوستان کی فضا معطر تھی، مولانا ایک متبحر عالم، ایک نکتہ رس

مصنف، ایک شعلہ بیان خطیب اور ایک سرفروش مجاہد تھے۔ مولانا کی وفات سے ایک طرف تعلیمی وعلمی ادارے سوگوار ہیں، تو دوسری طرف سیاسی جماعتیں اور انجمنیں، نیز ہندوستان کی تمام قومیں اس رنج وغم میں شریک ہیں۔

مولانا جامعہ ملیہ اسلامیہ کی انجمن (کورٹ)، مجلس منتظمہ، اور مجلس تعلیمی کے رکن تھے، جس کی وجہ سے مرحوم کی صائب رایوں اور گراں قدر مشوروں سے بڑی مدد ملتی تھی۔ ان کی وفات سے ایک ایسا خلا پیدا ہوگیا ہے، جو بہ مشکل پُر ہو سکے گا۔ ہماری دعا ہے کہ مولانا مرحوم کے پس ماندگان کو صبرِ جمیل کی توفیق بخشے اور مرحوم کی روح کو اپنی آغوشِ رحمت میں اعلیٰ مقام عطا کرے۔"

"ہندوستانی مسلمان۔ آج اور کل"

ہم رسالہ جامعہ کی کسی اشاعت میں اس کا ذکر کر چکے ہیں کہ ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب گاندھی سمارک ندھی کی خواہش اور درخواست پر ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل پر مذکورہ بالا عنوان سے ایک کتاب لکھنے کی تیاری کر رہے ہیں۔ موصوف نے اب اس کتاب کا مقدمہ لکھ لیا ہے، جس میں کتاب کے موضوع اور اس کے پس منظر سے بحث کی ہے اور مسلمانوں کے موجودہ مسائل کی تفصیل سے وضاحت کی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اس کتاب کا جو خاکہ تیار کیا ہے، اس کے مطابق اس کے تین حصّے ہوں گے،

حصّہ اول، کل کی پرچھائیاں۔ حصّہ دوم، آج کا دھندلکا

حصّہ سوم، کل کیا؟ اندھیرا یا روشنی؟

پہلے حصہ میں مسئلے کے تاریخی پس منظر سے، دوسرے میں اصل مسئلے سے اور تیسرے میں اس کے حل سے بحث کی جائے گی۔

ڈاکٹر صاحب نے ۲۵ اگست کو مجوزہ کتاب کا مقدمہ، جامعہ کالج کے حلقۂ مطالعہ میں پڑھ کر سنایا، جسے حاضرینِ جلسہ نے بڑی دلچسپی اور ذوق سے سنا اور آخر میں متعدد حضرات نے مختلف قسم کے سوالات کئے، جن کے ڈاکٹر صاحب نے تفصیل سے جواب دئے۔ جلسے میں جامعہ کے اساتذہ اور کارکنوں کے علاوہ ڈاکٹر خواجہ غلام السیدین صاحب نے بھی شرکت کی۔



طابع و ناشر: عبد اللطیف اعظمی مطبوعہ: یونین پریس دہلی ٹائیٹل: دیال پریس دہلی

جامعہ

قیمت فی پرچہ
پچاس نئے پیسے

سالانہ چندہ
چھ روپے

شمارہ ۵ | بابت ماہ نومبر ۱۹۶۲ء | جلد ۴۷

فہرست مضامین

خط و کتابت کا پتہ

رسالہ جامعہ، جامعہ نگر، نئی دہلی

تعلیم اور روایتی قدریں

ڈاکٹر ذاکر حسین

(انڈین نیشنل کمیشن کا جو مرکزی وزارت تعلیم نے یونسکو کے ساتھ تعاون کرنے کے لئے بنایا ہے سہ روزہ اجلاس پچھلے ماہ ۲۶ ستمبر کو نئی دہلی میں منعقد ہوا۔ اس ادارہ کے متعلق ایک تعارفی مضمون "تعلیمی مسائل" کے تحت شائع کیا جا رہا ہے۔ اجلاس کے آخری دن تعلیم اور روایتی اقدار" کے عنوان سے ایک سمپوزیم ہوا تھا، جس کا افتتاح ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نائب صدر جمہوریہ نے فرمایا تھا۔ اس افتتاحی خطبہ کا ترجمہ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے ڈاکٹر صاحب نے شروع میں "افتتاحی رسم" کے روز افزوں رواج پر اپنے مخصوص انداز میں لطیف طنز فرمایا تھا، مگر ہم صرف وہی حصہ شائع کر رہے ہیں، جو اصل موضوع سے متعلق ہے۔ اس سلسلے کی بعض دوسری تقریروں کے ترجمے بھی آئندہ اشاعتوں میں شائع کیے جائیں گے۔ یہ ترجمہ ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب نے املا کرایا ہے۔)

آپ حضرات اس سوال پر غور کرنا چاہتے ہیں کہ تعلیم میں روایتی اقدار کی کیا اہمیت ہے بہتر ہے کہ پہلے ہم ان الفاظ کے معنی کو وضاحت کے ساتھ سمجھ لیں، جو اس سوال میں استعمال کیے گئے ہیں۔ میرے خیال میں آپ کو اس سے اتفاق ہوگا کہ نوع انسانی کا ہر فرد تین طرح کے وظائف انجام دیتا ہے جسمانی یا نباتی، دماغی یا حیوانی اور ذہنی یا روحانی، جنہیں ہم مخصوص انسانی وظائف کہہ سکتے ہیں۔ جسمانی اور دماغی وظائف کا اظہار پہلے ہوتا ہے۔ ان کے انجام دینے میں بچے کو پہلے پہل آسودگی یا ناآسودگی کا احساس ہوتا ہے۔ وہ بعض چیزوں، بعض کاموں کو پسند اور بعض کو ناپسند کرنے لگتا ہے، گویا وہ ان کی قدر کا تعین کرتا ہے۔ یہ منفی یا مثبت قدر

کا احساس ذہنی نشو و نما کی بنیاد ہے۔ جب بچے کے حافظے میں احساسِ قدر کے تجربوں کا ذخیرہ جمع ہونے لگتا ہے، تو اس کی ذہنی زندگی ترقی کی ایک اہم منزل طے کرتی ہے، یعنی وسائل و مقاصد کا شعور بیدار ہو جاتا ہے، مگر یہ اقدار، جن کا شعور نشو و نما کی ان ابتدائی منزلوں میں ہوتا ہے، سراسر حسّی یا مادّی ہوتی ہیں۔ بچپن کی میزان قدر میں صرف خوشگواری یا ناگواری آرام یا تکلیف، جسمانی آزادی یا جسمانی بندش، حسّی لذّت یا حسّی کوفت کا احساس تولا جاتا ہے۔ ابھی تک اس میزان کی سطح انسان کے یہاں کم بیش وہی ہوتی ہے، جو ادنےٰ درجے کے جانوروں کے یہاں۔ افسوس ہے کہ بعض انسان اسی سطح پر ٹھہر کر رہ جاتے ہیں۔

مگر طبعاً فردِ انسانی کے اندر ایک تیسری قسم کے وظائف یعنی ذہنی اور اخلاقی عمل بھی ظہور میں آتے ہیں۔ ان وظائف کے انجام پانے سے بھی کچھ قدروں کا احساس ہوتا ہے، لیکن یہ قدریں کچھ اور ہی طرح کی ہیں۔ دونوں کی نوعیت میں جو فرق ہے، اس کو ظاہر کرنے کے لئے ایک طرف حق، حُسن، خیر، قُدس اور عدل کا اور دوسری طرف جسمانی صحت، حسّی لذّت، مادی منافع یا جنسی محبت کا نام لے دینا کافی ہے۔ تعلیم فردِ انسانی کی مکمل نشو و نما کا ذریعہ ہے۔ اُسے اِنھیں مخصوص انسانی اقدار سے سروکار ہے، جو اقدار عالیہ مطلقہ کہلاتی ہیں۔ تعلیم کا سب سے بڑا اور سب سے مقدم موضوع فرد اور اس کی مخصوص انسانی قدر ہے۔ تعلیمی عمل یہی ہے کہ وہ شعور اقدار کو جو فرد کے اندر بالقوۃ موجود ہوتا ہے، تہذیبی اشیا کے ذریعے سے قوت سے فعل میں لائے۔ یہ تہذیبی اشیا خود کسی فرد یا جماعت کی ذہنی کوشش کی پیداوار ہوتی ہیں۔ چنانچہ تعلیم کو بجا طور پر معروضی تہذیب کا فرد کے اندر نئے سرے سے موضوعی زندگی پانا کہا جاتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں ہم اسے معروضی ذہن کا موضوع بن جانا کہہ سکتے ہیں۔ سچی تعلیم کے لئے پہلی شرط یہ ہے کہ ان دونوں میں مناسبت اور مطابقت ہو۔ صحیح تعلیم یہ نہیں ہے کہ متعلم کو کسی مقررہ سانچے میں ڈھال دیا جائے، جو فلاں اسکیم یا فلاں منصوبے کی رو سے ضروری سمجھا گیا ہے۔ تعلیم نام ہے متعلم کے

انفرادی نفس میں مخصوص انسانی صلاحیتوں کے بیدار ہونے اور نشو و نما پانے کا۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی تعلیمی ادارہ جو اپنے خیال میں بچے کے خالی ذہن میں تھوڑی سی یا بہت سی معلومات بھر دیتا ہے، دراصل اسے تعلیم نہیں دیتا۔ یہی وجہ ہے کہ کسی نظریے کا ٹھونس دینا تعلیم نہیں کہلاتا۔ تعلیم وہ عمل ہے، جس کے ذریعہ ذہن کو زیادہ سے زیادہ نشو و نما کا جو اس کے لئے ممکن ہے، موقع ملے اور وہ صرف انھیں تہذیبی اشیاء کے سابقے سے ہو سکتی ہے، جو اسی قسم کے ذہنوں کی دماغی کاوش کا نتیجہ ہیں اور جن کے اندر کچھ معروضی اقدار موجود ہیں۔ یہ اقدار تہذیبی اشیاء میں اس طرح پیوست ہوتی ہیں کہ جب کوئی ذہن جو ان سے مناسبت یا مشابہت رکھتا ہے، انھیں حاصل کرتا ہے یا اسے ان کا ادراک یا معرفت یا تجربہ ہوتا ہے، تو خود اس ذہن کے اندر یہ اقدار جاگ اٹھتی ہیں اور اس کی اخلاقی نشو و نما کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔

ان اقدار کے تجربے کے ساتھ ہی ان کی صحت و معقولیت، ان کے دوام اور ان کی قدر مطلق کا خوشگوار احساس ہوتا ہے۔ انسان انھیں بے چوں و چرا تسلیم کر لیتا ہے اور انھیں حاصل کرنے کی سعی کرتا ہے۔ وہ اس کے نظام زندگی کو اس کے احساسِ قدر اور معیارِ قدر کو اس کی پسند اور ناپسندیدگی اور اس کے عمل کے محرکات کو اپنے سانچے میں ڈھال لیتی ہیں۔ سچی تعلیم یہی ہے کہ انفرادی ذہن کو ان مخصوص انسانی معروضی اور روحانی اقدار کا تجربہ کرایا جائے، تاکہ وہ اسے خود بخود اس بات پر مجبور کر دیں کہ وہ اپنی زندگی اور اپنے عمل میں اسے حاصل کرے۔ یہ گویا ایک ایسی شمع جلانا ہے جو اندھیرے میں انسان کو راہ دکھائے اور وہ مضبوطی سے قدم رکھتا ہوا آگے بڑھ سکے۔ یہ شمع دراصل انسان کے مرکزِ وجود میں یعنی اس کے قلب میں روشن ہوتی ہے۔ تعلیم کو یہ شرف بخشا گیا ہے کہ وہ ہر فرد کے سینے میں شمع کی جوت جگائے۔ اس کا صرف ایک ہی ذریعہ ہے یعنی تہذیبی اشیاء، ادب، آرٹ، سائنس، صنعت، مذہب، اخلاقی اور قانونی ضابطے

اور خاص طور پر وہ پاکیزہ شخصیتیں جن میں ذہنی اور اخلاقی قوت نے مکمل شکل اختیار کر لی ہے۔

مگر یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ اس قوت سے کام لینے کے لئے اس کا ذکر کر دینا، اس کے بارے میں معلومات بہم پہنچا دینا کافی نہیں ہے، بلکہ زندگی میں اس کا تجربہ کرنے اسے برتنے کی ضرورت ہے۔ تعلیم کا خاص کام یہی ہے کہ اس تجربے کا موقع بہم پہنچائے۔ تعلیم کو متعلم کے موضوعی ذہن اور اس معروضی ذہن کے درمیان جو تہذیبی اشیاء سے معمور ہے، یا دوسرے الفاظ میں فردِ انسانی اور انسانی تہذیب کے درمیان واسطہ بننا ہے۔

عملِ تعلیم کا مرکزی مسئلہ یہی ہے کہ یہ توسط کس طرح اپنے مقصد کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکتا ہے۔ یہاں اس مسئلے پر تفصیل سے بحث کرنے کا موقع نہیں، مگر میرے خیال میں بلاشبہ ایک بات کہی جا سکتی ہے اور وہ یہ ہے کہ اس قسم کے موثر اور کامیاب توسط یعنی اچھی تعلیم کے لئے ضروری ہے کہ اس خیال کو ذہن سے بالکل نکال دیا جائے کہ محض معلومات، تجربے اور دریافت کا بدل ہو سکتی ہے۔ اگر نئی نسل کو اس چیز سے جسے ہم تہذیب کی روایتی اقدار کہتے ہیں، آشنا کرنے میں یہ رجحان غالب آ گیا کہ ہم معلومات پر اکتفا کریں اور تجربے اور دریافت کو نظر انداز کر دیں تو یہ اندیشہ ہے کہ تعلیم میں ناقابل برداشت سطحیت اور ریاکاری پیدا ہو جائے گی۔

روایتی اقدار کے ذریعہ سے تعلیم دیتے میں جس بات کا سب سے زیادہ خیال رکھنا ہے وہ یہ ہے کہ ایک تو اقدار کے انتخاب میں خاص اہتمام کیا جائے اور دوسرے ایسی موثر تدبیروں سے کام لیا جائے کہ متعلم ان اقدار سے پوری طرح فیض اٹھا سکے، اس کے لئے ضروری ہے کہ ایسے مواقع فراہم کئے جائیں جن میں ان اقدار کا تجربہ کر سکے۔ جو اس کی اپنی ذہنی اور روحانی وضع نفسی سے مطابقت رکھتی ہیں۔

میں ایک بار پھر کہوں گا کہ ہمیں اپنے بے شمار تہذیبی کارناموں میں سے جنھوں نے

معروضی شکل اختیار کرلی ہے، بڑی احتیاط سے مناسب انتخاب کرنا ہے۔ تاریخ وہ خزانہ ہے جس سے ہم اس تعلیمی مواد کا انتخاب کرسکتے ہیں، اس لئے کہ ہر قوم کی جڑیں اس کی تاریخ میں پیوست ہوتی ہیں اور وہ ماضی کی گہرائیوں میں پھیلتی جاتی ہیں تاکہ اسے مستقبل میں زیادہ سے زیادہ بلندی اور وقت کے سیل بیہم میں قرار ودوام حاصل ہوسکے۔ ٹیگور نے ایک جگہ کہا ہے :-

میں نے تیری بے آواز آہٹ کو اپنی رگوں میں دوڑنے والے لہو میں محسوس کیا
اے ابد قرار ماضی !
میں نے تیری خاموش صورت کی جھلک دیکھی ہے
وقت کے پرشور قلب میں
تو اس لئے آیا ہے کہ ہمارے بزرگوں کی ناتمام کہانی کو لکھے
خط مخفی میں ہماری زندگی کے اوراق پر
تو بھولے بسرے زمانے کو نئے سرے سے یاد دلاتا ہے
تاکہ اس کی روشنی میں نئے پیکر تراشے جائیں

یہ تو صحیح ہے مگر ماضی کی دولت بے شمار ہے تعلیم کو اس میں سے انتخاب کرتا ہے اور یہی اس کی بڑی کٹھن ذمہ داری ہے۔ انتخاب کے معنی ہیں چھانٹنا اور چھانٹنے کے لئے کوئی اصول ہونا چاہیئے۔ بعض لوگ قدیم کو انتخاب کریں گے، بعض جدید کو۔ بعض ہماری مرکب تہذیب اور مرکب قومیت کے ایک عنصر کو بعض دوسرے عنصر کو۔ ہماری میراث دراوڑوں، آریوں، عربوں، ترکوں، مغلوں اور یورپیوں کا عطیہ ہے۔ اس کی تخلیق میں ہندوؤں، بودھوں، مسلمانوں، عیسائیوں، سکھوں اور پارسیوں نے حصہ لیا ہے۔ ماضی کے وافر خزانے میں کسی چیز کا اچھا یا برا ہونا اس پر موقوف نہیں کہ وہ قدیم ہے یا جدید ہے۔ وہ ہندوؤں کی ہے یا بودھوں کی، مسلمانوں کی ہے یا سکھوں کی

عیسائیوں کی ہے یا پارسیوں کی، بنائے تمیز دراصل یہ ہے کہ ان میں سے کونسی اصلی ہے اور کونسی نقلی، کونسی عارضی اور کونسی دائمی، کونسی وقتی قیمت رکھتی ہے اور کونسی ابدی قدر کی حامل ہے۔ سماج کے سوچے سمجھے عمل یعنی تعلیم کا کام یہ ہے کہ وہ اس میراث کے وسیع سمندر کو کھنگال گراں چیزوں کو نکالے جو ہماری نئی نسلوں کی اخلاقی اور روحانی غذا بن سکتی ہیں اور اسے ان کے سامنے دسترخوان پر چن دے تعلیم کو تمیز کرنا چاہیئے ان روایات میں جو زندگی کی جڑوں کو کمزور کرتی ہیں اور ان میں جو ان کو قوت پہنچاتی ہیں۔ صرف وہ روایات جو جاں بخش اور جانفزا ہیں ابدی اقدار کی حامل ہوتی ہیں اور تعلیم کا کام کرتی ہیں، جو نشوونما اور ترقی میں رکاوٹ ڈالتی ہیں، وہ تعلیمی اعتبار سے محض بے کار ہی نہیں بلکہ مضر ہیں۔ فرد اور سماج دونوں کی زندگی کو منزل کی راہ دکھانے والی صرف معروضی ابدی اقدار ہی ہیں ان کے سوا اور کوئی چیز نہیں ہے۔ یہ اقدار خود ہی اپنے ازسرنو حاصل کئے جانے کا تقاضا کرتی ہیں اور برابر ترقی کی تحریک کرتی رہتی ہیں۔ میں نے "ازسرنو حاصل کئے جانے" کا فقرہ جان بوجھ کر رکھا ہے۔ اس لئے کہ ان اقدار کا آخری اور قطعی طور پر حاصل کرنا کسی زمانے میں بھی ممکن نہیں ہے۔ قدر بجائے خود ابدی ہے، مگر ہر نسل کو بلکہ ہر فرد کو اسے اپنے طور پر تلاش کرنا اور حاصل کرنا پڑتا ہے۔ ہماری روایتی میراث جن ابدی اقدار کی حامل ہے ان کا کام یہ نہیں ہے کہ وہ ماضی کے ٹھٹھرے ہوئے جامد جسم کو ہمیشہ سینے سے لگائے رکھیں، وہ تو زندگی اور حرکت بخشنے والی ہیں اور ہر نئی نسل کے دل میں یہ لگن پیدا کرتی ہیں کہ وہ انھیں نئے سرے سے حاصل کرے، تاکہ ایک نئی اور بہتر تہذیب کی تعمیر ہو سکے۔

ہمیں نئی نسل کو یہ بتانا چاہیئے کہ ہماری تاریخ میں یہ معروضی قدریں کس طرح حاصل کی گئیں۔ ہمیں ایسے مواقع فراہم کرنا چاہیئے کہ فرد کے شعور میں ایک یا ایک سے زیادہ قدروں کا تجربہ کرنے کی جو صلاحیت قدرتی طور پر موجود ہے، وہ قوت سے فعل

میں آسئے اور اسے ہر ممکن ذریعہ سے مدد دے کہ وہ اس قدر کو جس کا اسے تجربہ ہے، خود اپنی یا اپنے گرد و پیش کی زندگی میں حاصل کر سکے، چاہے وہ حق ہو یا حسن یا خیر یا قدس یا عدل۔ تبھی اس میں مخصوص انسانی صفات نشو و نما پا سکتی ہیں، تبھی اس کی سچی تعلیم ہو سکتی ہے، اس لئے کہ جیسا پہلے کہا جا چکا ہے، سچی تعلیم یہی ہے کہ فرد کے شعور میں اقدار عالیہ کا احساس ان تہذیبی اشیاء کے اثر سے پیدا ہو، جو اقدار کی حامل ہیں۔

ہماری روایات ایسی تہذیبی اشیاء سے مالا مال ہیں۔ ہمیں اس کا اہتمام کرنا چاہیئے کہ اسکول، کالج اور یونیورسٹی میں ان کے تعلیمی اثرات ہماری نئی نسل پر پڑیں۔ خاص طور پر ایک قدر ہے، جس کی طرف ہماری قومی زندگی کے موجودہ دور میں غیر معمولی توجہ کی ضرورت ہے۔ یہ عدل کی قدر ہے، جس کا ریاست کو حامل ہونا چاہیئے۔ ہماری روایات ہمیشہ سے یہی رہی ہیں کہ ریاست دھرم یا اخلاقی قانون کی تابع ہو۔ ہمیں زیادہ سے زیادہ کوشش کرنی چاہیئے کہ ہمارے ملک کے سارے بچوں اور نوجوانوں کو اس اثر پذیر عمر میں تعلیمی ادارے کے ذریعہ اس قدر کا تجربہ ہو سکے۔ ریاست محض قوت و اقتدار کی حامل ہونے کی حیثیت سے کوئی اخلاقی قدر نہیں رکھتی یہ ہمارے مزاج کا ایک جزو ہے۔ ہماری تاریخ کے بہترین صفحات کا ایک سبق ہے، ایک قیمتی میراث ہے، جو ہمیں اپنی تحریک آزادی کے عظیم رہنما سے ملی ہے کہ قوت کا استعمال محض جائز اخلاقی مقصد کے لئے ہونا چاہیئے۔ ہمیں اپنے آپ کو اس امن کے قیام کے لئے وقف کر دینا چاہیئے جو اخلاقی قدر سے حاصل ہوتا ہے۔ مجھے امید ہے اور یقین ہے کہ ہم اپنی قومی زندگی کی منزل کے تصور کو ہمیشہ سامراجی ملک گیری کے رجحان سے پاک رکھیں گے۔ ہم سامراج کے قدموں تلے سے نکلے ہیں اور ہم جانتے ہیں کہ ان کا بوجھ کمر توڑ دیتا ہے۔ ہم ایسی اندھی وطن پرستی کو جو جنگ جوئی سکھائے کبھی اپنے پاس نہ پھٹکنے دیں گے۔ ہماری سعی یہ ہوگی کہ افلاس، جہالت اور بیماری کو دور کر کے وہ قلیل ترین شرائط فراہم کر دیں جو ایک معمولی انسان کی طرح بسر کرنے کو درکار ہیں۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ ہم اپنے سماجی نظام

سے قبیح رسوم اور لاطائل اوہام کو خارج کر دیں گے ۔ اور اس کی اجازت نہیں دیں گے کہ کوئی انھیں ہماری میراث کے نام سے قائم رکھنے کی کوشش کرے ۔ ہم ہر قسم کی تنگ دلانہ اجتماعی خود غرضی کو، ہر قسم کی نفرت کو جو ایک مذہب کو دوسرے مذہب سے، ایک ذات کو دوسری ذات کو سے ہے، جڑسے اکھاڑ پھینکیں گے اور یہ برداشت نہیں کریں گے کہ کوئی انھیں قومی روایات کہہ کر ان کی حمایت کرے ۔ یہ سب کچھ ہم عدل و انصاف کی ان ابدی اقدار کی خاطر کریں گے۔ جو ہماری قومی میراث کا جزو ہیں ۔ ہم اس خدمت کو اخلاقی فرض سمجھ کر دل سے قبول کریں گے اور خوشی سے انجام دیں گے ۔ ہم قوت اور عدل، صنعت اور اخلاق، عمل اور فکر و مراقبے کو ایک دوسرے کے ساتھ سمونے کی کوشش کریں گے ۔ اس مشکل کام کو انجام دینے کی صلاحیت ہمارے اندر کس طرح پیدا ہوگی ؟ اس طرح کہ تعلیم ان ابدی اقدار کے ذریعہ جو خود ہماری تہذیبی اشیار میں مجسم ہوگئی ہیں، ہمارے اندر ان قدروں کو بیدار کر دے گی اور وہ صرف ہماری ہی تہذیبی اشیار سے کام نہیں لے گی، بلکہ بقیہ نوع انسانی کی تہذیبی میراث سے بھی، خواہ وہ کسی ملک اور کسی زمانے کی ہو، اس لئے کہ ہم اس کا دل سے احترام کرتے ہیں اور اس طرح اس کے وارث بن جاتے ہیں ۔

ہماری تعلیم حیات انسانی کے اور اہم وظائف کی طرح، اس کڑی کا کام دے گی جو ابدی زندگی اور زمانی زندگی، روحانی بیداری اور فنی کارکردگی، اخلاقی عقیدے اور مادی فلاح کو ایک دوسرے سے جوڑتی ہے ۔ اس میں شک نہیں کہ ابدیت، روحانیت اور اخلاق کے مفہوم کو الفاظ میں ضبط کرنا مشکل ہے ۔ مگر جو کچھ بھی ہو تعلیم کا فرض اولین ان میں اقدار کا شعور پیدا کرنا ہے ۔ اس فرض کو وہ تہذیبی اشیار مناسب انتخاب سے پورا کرنے کی کوشش کرتی ہے مگر اس کا سب سے موثر ذریعہ یہ ہے کہ خود معلموں میں ان ابدی اقدار کے جیتے جاگتے مظہر موجود ہوں، ماضی اور حال کی حقیقی شخصیتوں میں اخلاقی عظمت کے نمونے دکھائے جائیں اور مشکل اور پیچیدہ حالات میں حق پسندانہ فیصلے کرنے کے قصے سنائے جائیں ۔ ہندوستان

کی تاریخی روایات ایسی شخصیتوں کے نورِ اخلاق سے منوّر ہیں اور مجھے امید ہے کہ آنے والے زمانے میں خود ہمارے تعلیمی ادارے ایسے معلموں سے خالی نہ ہوں گے۔

میں سمجھتا ہوں کہ میں نے آپ کا بہت وقت لے لیا۔ اب میں اس سیمینار کا افتتاح کرتا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ آپ کی مشاورت ہماری تعلیم کی بہت سی اہم گتھیوں کو سلجھانے میں مدد دے گی۔

میں آپ کی کامیابی کی دُعا کرتا ہوں۔ جے ہند

میری زندگی کا ناقابلِ فراموش واقعہ

پروفیسر محمد مجیب

قدرت کا ہم پر یہ بڑا احسان ہے کہ ہم پر جو گزرتی ہے اسے ہم بھول سکتے ہیں، دکھ کا بھاری سے بھاری بوجھ وقت کے ساتھ ہلکا ہو جاتا ہے، سکھ کا مزہ ہر دفعہ نیا معلوم ہوتا ہے۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہمیں کچھ یاد نہیں رہتا۔ بعض لوگ ایک مرتبہ کوئی کتاب پڑھ لیتے ہیں تو اس کا ایک ایک لفظ یاد رہتا ہے۔ مولانا آزاد نے ایک بار کسی مسئلہ پر گفتگو کرتے ہوئے ۱۹۵۶ء میں فرمایا کہ میں نے اس کا ذکر فلاں کتاب کے فلاں صفحے پر ۱۶ سنہ میں دیکھا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ اس صفحے کا رنگ کسی وجہ سے زرد پڑ گیا تھا۔ بعض لوگ جو اور چیزیں کھوتے رہتے ہیں اور خود بھی کھوئے کھوئے سے رہتے ہیں، اپنے مطلب کی یا شوق کی بات کبھی نہیں بھولتے۔ ہم سب کا سینکڑوں آدمیوں سے واسطہ رہتا ہے، آنکھوں کا کام دیکھنا ہے، وہ دیکھتی رہتی ہیں، کسی کی صورت ذہن پر نقش ہو جاتی ہے، کسی کو دیکھنا نہ دیکھنا برابر ہوتا ہے۔ کسی کی ذرا سی ناگواری دل کو صدمہ پہنچاتی ہے، کسی کو چھیڑنے اور خفا کرنے میں لطف آتا ہے، کسی کا احسان دل پر بار ہوتا ہے، کسی سے یہ کہنے کو جی چاہتا ہے "کیجئے ہمارے ساتھ عداوت ہی کیوں نہ ہو" انسان کے حواس، اس کی آنکھ، اس کی عقل کو، یا تو اس عدالت تک رسائی نہیں ہے جہاں یہ فیصلہ کیا جاتا ہے کہ کون سا اثر قابلِ قبول ہے کون سا نہیں۔ یا خود عدالت اپنی رائے اس طرح بدلتی رہتی ہے کہ معلوم ہوتا ہے اس کے فیصلے کسی قاعدے قانون کے مطابق نہیں ہوتے، اس کی رہنمائی ایسی کیفیتیں کرتی ہیں جنھیں خود قرار نہیں۔

بہت سے لوگوں کو اس کا یقین ہے کہ ان کا نفس ایک خاص شریعت، یعنی اصولوں کے ہم آہنگ مجموعے کا پابند رہتا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ان کے قول اور عمل میں کسی قسم کا تضاد ثابت کرنا، ان

سے کہنا کہ وہ خوش ہوتے ہیں تو ایک طرح سے بات کرتے ہیں، خفا ہوتے ہیں تو دوسری طرح سے، ان پر ایک بھاری الزام ہے، ان کی عزت و آبرو، ان کی نیک نامی پر حملہ ہے اور وہ لڑنے کے لئے اس جوش اور خلوص سے تیار ہو جاتے ہیں کہ حق کی راہ میں جان دینے کی مثال سامنے آجاتی ہے ایسے لوگوں کو اس کا بھی پورا یقین ہوتا ہے کہ وہ غلط اور صحیح، حق اور باطل، ظلم اور انصاف میں تمیز کر سکتے ہیں اور کرتے رہتے ہیں اور ہر معاملہ میں ان کی رائے صحیح ہوتی ہے، اس لئے کہ وہ اصول اور اخلاق کی پابندی کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو اپنی ساری زندگی ایک کھلی ہوئی کتاب معلوم ہوتی ہے، جس کے ہر صفحے پر صحیح فیصلے اور اچھے کردار کی مثالیں درج ہوتی ہیں اور وہ اکثر آسانی سے بتا سکتے ہیں کہ کسی اچھی بات یا اچھے آدمی نے ان کی ساری زندگی کو اس کا خاص رنگ دے دیا شاعروں نے اپنی مصلحت سے ایسے تمام لوگوں کو زاہد، واعظ، ناصح کہنے کی رسم جاری کردی، دراصل اس قبیلے میں وہ سب شامل ہیں جنھیں اپنے اندر ساری خوبیاں نظر آتی ہیں، یا جن کو دوسروں کے عیبوں کا ایسا شدید احساس ہوتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو سب کی نہیں اور اکثر کی نہیں تو بہرحال ان خاص خوبیوں کی مثال سمجھنے لگتے ہیں جن سے عام طور پر دوسرے محروم ہوتے ہیں۔ شاعری زاہد، واعظ، ناصح کے مقابلے پر رند کو لے آئے، یعنی ایسے شخص کو جو اپنے بارے میں کوئی دعویٰ نہیں کرتا سوائے اس کے کہ وہ رائے رکھنے اور فیصلہ کرنے کا اہل نہیں ہے۔ بظاہر اس دعویٰ میں بڑا انکسار ہے، مگر غور کیجئے تو اس میں زاہد کے دعویٰ سے کہیں زیادہ خود ستائی ہے۔ زاہد بے چارہ عقل، علم، اصول، حکم کی بات کرتا ہے، اپنے گلے میں منطق، اخلاقیات اور دینیات کا پھندا ڈالتا ہے اور وہ بھی اس طرح کہ جس میں ہمت ہو وہ ہاتھ بڑھا کر رسی کھینچ لے اور اس کا گلا گھونٹ دے۔ اس کے خلاف رند کو دیکھیے کہ وہ کسی طرح گرفت میں آتا ہی نہیں۔ عقل کے مقابلے پر عشق کو لے آتا ہے، علم کے مقابلے پر دل کو، اصول کے مقابلے پر وجدان کو، حکم کے مقابلے پر رحم و کرم کو، اس سے مشورہ لیجئے تو وہ کہتا ہے کہ غلطی کرنا مشورہ لے کر صحیح بات کرنے سے بہتر ہے۔ آپ اس سے پوچھئے کہ آپ اپنی زندگی کے کسی واقعے کو ناقابل فراموش سمجھتے ہیں تو جواب دے گا کہ میں خود

اپنی زندگی کا تنہا واقعہ ہوں، میں چاہتا ہوں کہ اسے حتی الامکان نظرانداز کروں اور خدا کے لئے آپ بھی اسے بھول جائیے، یا کم از کم اس کا ذکر نہ کیجئے۔

رند اور بہت سی ایسی ہی بہکی بہکی باتیں کرتے ہیں۔ ساقی کی، اس مست نظر کی جو شراب بن کر پیالے میں آجاتی ہے، اس بیہوشی کی جو معرفت کی پہچان ہے، وجد اور رقص کے اس عالم کی جو اپنے آپ کو رضائے الٰہی کے سپرد کر دینے سے پیدا ہوتا ہے۔ مگر سب رند ایک سے نہیں ہوتے، ہو بھی نہیں سکتے۔ جن رندوں کو اعلیٰ کیفیتیں شعر اور ادب کی چھلنی سے چھن کر پہنچتی ہیں اور صرف دلکش خیال کی حیثیت رکھتی ہیں، وہ بھی چھوٹے منہ سے بڑی بات کہہ گذرتے ہیں، لیکن اس سے خود ان کے سوا اور کوئی دھوکا نہیں کھاتا۔ زیادہ تر رند ایسے ہوتے ہیں جو اپنی طبیعت سے واقف نہیں ہوتے، اپنے طریقے کو نہ سمجھتے ہیں، نہ سمجھا سکتے ہیں اور دیکھنے والے کو صرف ایک بے پروائی، ہر حال میں خوشی اور چین کی کوئی صورت نکال لینے کی صلاحیت، قاعدے اور اصول سے بے بہرہ رہنے کی خصوصیت نظر آتی ہے۔

مگر زاہد اور رند کا ذکر کرنا صرف بات کو طول دینے کی ترکیب ہے۔ اصل میں ہم خود غرض ہیں کوئی کچھ کم کوئی کچھ زیادہ، اور سب ایک دوسرے پر خود غرضی کا الزام رکھ کر اپنے عیب کو چھپاتے ہیں۔ جو خود غرض نہ ہو وہ بھی بے غرض نہیں ہوتا، وہ یہ چاہتا ہے کہ اپنا معاملہ صاف رکھے۔ نوکری کرتا ہے تو اسے قومی خدمت نہیں کہتا، اپنا کام جی لگا کر کرتا ہے، کام ذرا زیادہ ہو جائے تو اس کا دکھڑا نہیں روتا، لیکن یہ بھی چاہتا ہے کہ اس کی ضرورتیں پوری ہوتی رہیں، ہر مہینے کے شروع میں پچھلے مہینے کی تنخواہ مل جائے اور اس کی عزت آبرو کا خیال رکھا جائے۔ دنیا کا سہارا یہی محنت سے کام کرنے، منطق اور شاعری سے دور رہنے والے لوگ ہیں۔ ان کی زندگی خاموش بہتے ہوئے دریا کی سی ہوتی ہے، جس کے کنارے آدمی کھڑا ہو کر محسوس کرتا ہے کہ حادثے اور انقلاب فطرت کے خلاف ہوتے ہیں، دریا میں بہاؤ پیدا کرنے کے لئے کسی طاقت کی ضرورت نہیں ہوتی، سب سے اعلیٰ مطلب وہ ہے جو خاموش رہنے پر بھی ادا ہو جائے۔

میری زندگی کا ناقابل فراموش واقعہ کوئی واقعہ نہیں ہے، یہی خاموش بہاؤ ہے۔ کوئی ۳۸ برس ہوئے جرمنی میں اپنے ایک دوست سے گفتگو کرتے ہوئے میں نے کہا تھا کہ میں بھی جامعہ ملیہ میں کام کروں گا۔ اب بھی اگر آپ پوچھیں کہ میں نے یہ بات کیوں کہی تو میں کوئی جواب نہ دے سکوں گا۔ میرے سامنے یہ مسئلہ تھا ہی نہیں کہ جامعہ میں کام کروں یا نہ کروں، کروں گا تو کیا ہوگا، نہ کروں تو کون سا نقصان ہو جائے گا۔ میرے اس فیصلہ کی بہت سے لوگوں نے تعریف کی، مجھے معلوم تھا کہ میں نے فیصلہ کرنا درکنار کچھ سوچا بھی نہیں ہے۔ میرے خاندانی بزرگوں اور عزیزوں نے سمجھانا چاہا کہ جامعہ میں جانا اور تھوڑی تنخواہ پر کام کرنا بڑی نادانی کی بات ہے، جب دوسری جگہ زیادہ تنخواہ ملنے کا امکان ہے۔ میں نے کوئی فیصلہ کیا ہوتا تو شاید اس کی خواہش ہوتی کہ اسے صحیح ثابت کروں، جب یہ الزام ہی غلط تھا کہ میں نے فیصلہ کیا ہے تو مجھے حق تھا کہ مسکین خاموشی کا انداز اختیار کرکے بحث کو ختم کردوں۔ تعریف کرنے والے اب بھی نہیں ملتے، کچھ نہ کچھ کہتے رہتے ہیں، وہ بزرگ اور خیرخواہ جو مجھے نادان کہتے تھے، دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں۔ میرا جامعہ میں آنا اب کوئی واقعہ بھی نہیں کہا جاسکتا، اگر یہ غلطی تھی تو وقت کے گذرنے سے خود معاف ہوگئی ہے۔ اگر یہ اچھی بات تھی تو اس کا اب ذکر کیا کیجئے، ۳۶ برس پہلے کی بات ہے۔

(بہ شکریہ آل انڈیا ریڈیو دہلی)

عکسِ رُخ

جناب عبداللہ ولی بخش قادری

غالباً آپ کو مولانا اسمٰعیل میرٹھی کا یہ مشہور شعر یاد ہوگا:

ایک گھوڑا تھا نہایت عیب دار　　　اپنے سائے سے بدکتا بار بار

لیکن کبھی آپ نے یہ غور فرمایا کہ اس عیب داری میں کسی ایک گھوڑے یا صرف گھوڑوں کی تخصیص نہیں اور نہ صرف حیوانات کا یہ خاصہ ہے بلکہ بہت سے اللہ کے بندے بھی اپنے سائے سے بدکنے لگتے ہیں۔ یہ وہی حضرات ہیں جو ہر دم کڑی کمان کا تیر بنے، دوسروں پر مسلط رہا کرتے ہیں اور اعتراض کا تیشہ، تخریب اٹھائے ہوئے برسرِ پیکار نظر آتے ہیں۔ ذرا گنجائش نظر آئی اور یہ چراغ پا ہوئے۔ مجال کیا ہے کہ کسی میں ذرا سی خامی ہو اور ان کی نظر چوک جائے۔ دوسروں کے عیب تلاش کرتے ہیں اور بڑی جانفشانی کے ساتھ تلاش کرتے ہیں۔ انھیں محض دوسروں کی "مزاج پرسی" میں ہی اپنے "دکھ کا علاج" نظر آتا ہے۔ لیکن ایسا طرزِ عمل دراصل ردِّ عمل ہے۔ یہ تو "اپنے جہاں سے بے خبر" "سارے جہاں کا جائزہ" لے رہے ہیں اور وہ بھی اس دلِ مایوس کے سہارے پر جس میں گرمی کی رمق تک باقی نہیں رہی ہے۔ انھیں اپنی آنکھ کا شہتیر نظر نہیں آتا ہے اور دوسرے کی ذرا سی پھلی فوراً ٹٹول لیتے ہیں۔ ان کی یہ روش اگر کسی کی دل شکنی کا باعث ہو تو انھیں کیا۔ اگر کوئی جوابی حملہ کر بیٹھے تو یہ شرمسار نہ ہوں اگر کوئی درخورِ اعتنا، نہ سمجھے تو یہ خاموش نہ بیٹھیں۔ انھیں اپنے کام سے کام۔

لیکن اصل معاملہ یوں ہے کہ جب ناکام امنگوں کی آنکھ لگ جاتی ہے اور ہجر کی رات کو "امکانِ سحر" سے روشن رکھنے کا سوال باقی نہیں رہتا، اس آڑے وقت میں حقیقت سے آنکھیں چار کرنے میں بڑی مردانگی درکار ہوتی ہے اور تن آسانی کا تقاضہ یہی ہوتا ہے

کہ میدانِ کارزار سے راہِ فرار اختیار کر لی جائے۔ تاہم شعور کی خامی، اس حالت پر بھی قانع ہونے نہیں دیتی۔ "احساسِ انفعالِ ہزیمت" اتنا شدید ہوتا ہے کہ "وضع احتیاط" کے مصداق خود فریبی کی چادر تان لی جاتی ہے۔ اپنی غیر آسودہ خواہشات اور ناکام تمنائیں اس درجہ اذیت کا باعث ہوتی ہیں کہ ان کا اظہار کہیں ہو اور کسی طور ہو، خواہ مخواہ اپنے لئے سوہانِ روح معلوم ہونے لگتا ہے۔ مگر ایک جذباتی اور حساس ذہن اپنے دل کا یہ بھید ظاہر کرنے کے لئے کسی طور پر آمادہ نہیں ہوتا بلکہ اس پر تادیل کا لبادہ ڈال دیتا ہے۔ اپنی خامیوں اور کوتاہیوں کی پردہ پوشی، دوسروں کے حقیقی اور فرضی عیوب کی پردہ دری میں نظر آتی ہے۔ اس کے اپنے نصیب کی سیاہی، اُسے کچھ اس طرح گھیر لیتی ہے کہ ہر شے اسے تاریک نظر آنے لگتی ہے۔ ایک کریہہ صورت، دوسروں میں بدنمائی دیکھتا ہے اور اس پر انگشت نمائی بھی کرتا ہے۔ کبھی کبھی ایک مصنف بھی اس کمزوری کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس کی بعض تخلیق محض اس کی کدورتِ خاطر کی کارفرمائی ہو کر رہ جاتی ہے۔ اس طرح تسکینِ غم کا ایک پہلو ہاتھ آ جاتا ہے اور اندرونی کسک میں کچھ کمی محسوس ہونے لگتی ہے۔ یہ سمجھ کر کہ دوسرے تو ہم سے بھی گئے گزرے ہیں، کچھ اپنی عزت بڑھتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ ایک شخص جس کی اپنی نیت صاف نہیں ہوتی اور اسے اپنی اس خامی کا احساس بھی ہوتا ہے، زمانے کو ناقابلِ اعتبار اور بد دیانت گردان کر اپنی سُرخ روئی کا سامان فراہم کر لیتا ہے۔ وہ بظاہر زمانے کی اخلاقی کمزوریوں اور بے اعتدالیوں کا ڈھنڈورہ پیٹتا ہے لیکن فی الحقیقت بہ اندازِ دگر یہ اس کا اعترافِ گناہ ہوتا ہے۔ اس طرزِ عمل سے وہ پریشانی اور گرانی محسوس نہیں ہوتی جو صورتِ حال کو قبول کرنے سے پیدا ہو سکتی تھی، جنسی خلفشار میں یہ نوبت عموماً آ جاتی ہے۔ ایک پاپی اپنے من کا روگ چھپانے کی غرض سے ہر ایک کو بدکردار و بداعمال قرار دے ڈالتا ہے۔ ایک زلیخا کی اپنی طبیعت کا احساس اور اخفائے راز کی خواہش سب ہی زنانِ مصر کی عفت و عصمت پر حرف گیری کرنے لگتی ہے۔

عیب جوئی اور نکتہ چینی کے حربے کا یہ زاویہ نمایاں طور پر ان فنکی طبیعتوں کا وطیرہ بن جاتا ہے جو بخیالِ خویش اپنے آپ کو شہیدِ مظلومیت گردان لیتی ہیں۔ جب کوئی امید بر نہیں آتی اور نوبت یہاں تک پہنچتی ہے کہ انسان خود اپنے وجود سے شرمانے لگے تو وہ اپنے وہم کو صورتِ مجسّم پاکر بھرپور چوٹ کرتا ہے۔ دل کے پھپھولے پھوڑتا چاہتا ہے لیکن تہذیب و شائستگی مانع آتی ہیں۔ روایات کا خیال آتا ہے۔ وضعداری نباہنا ہوتی ہے۔ لہٰذا آزار، سر بازار کی گنجائش بھی نہیں نکل پاتی اور قہرِ درویش بجانِ درویش ہی رہتا ہے۔ اب اس کشاکش سے خود کو کچھ اس طرح آزاد کراتا ہے کہ اپنا "عکسِ رُخ" دوسروں کی شبیہہ میں دیکھ کر بدکنے لگتا ہے۔ الزام تراشتا ہے، اور بدگمان ہوتا ہے۔ جس پر نگہ پڑتی ہے شک و شبہ کے ساتھ پڑتی ہے۔ نہ کوئی لائقِ اعتبار رہتا ہے، نہ قابلِ اعتماد اور بالآخر یہ وسوسہ، دل میں بیٹھ کر رہ جاتا ہے کہ سارا زمانہ اس کے خلاف سازش کیے ہوئے ہے اور وہ بچارا فلکِ کج رفتار کی سفاکی کا شکار ہے۔ اسے ہوا کی ہر جنبش کا کل دہر کو کچھ اور الجھاتی ہوئی نظر آتی ہے اور ہدف وہ اپنی ذات ہی کو تصور کرتا ہے بلکہ یوں کہیے : ع آپ اُٹھا لاتے ہیں گر تیر خطا ہوتا ہے!

لیکن "خود حفاظتی تدابیر" کا یہ انداز کہ ہم محض پینترے دکھلاتے اور دھمکاتے رہیں ہمیں سرفراز کرنے کے بجائے سبک سری بناتا ہے۔ ان ہتھکنڈوں سے جس قدر ہم اپنے آپ کو محفوظ بناتے ہیں، اسی قدر جگ ہنسائی اور ہوتی ہے۔ اپنا عکسِ رُخ دیکھ کر بدکنے والی کیفیت بھی دراصل توجیہہ کا ایک انداز ہے۔ ہم اپنی بے عملی کا جواز تلاش کر کے مطمئن ہونا چاہتے ہیں یا دوسروں کو موردِ الزام قرار دے کر اپنی ذمہ داری سے بچنے کی فکر دامن گیر ہوتی ہے۔ بس اسی ذکر و فکر میں عمرِ عزیز رائیگاں جاتی ہے اور بیتے ہوئے دنوں کی یاد سوہانِ روح بنتی رہتی ہے۔ اداسی کے زاویے اگرچہ بدلتے رہتے ہیں لیکن جذبے کی شدت میں کمی واقع نہیں ہوتی ہے۔ اپنے روگ کو زمانے کی نگاہوں سے بچا کر پالتے رہے، دوسروں پر طعن و تشنیع کے تیر برساتے رہے تنقید و تنقیص کا بازار گرم رکھا۔ صرف اس لیے کہ کوئی ہماری طرف نظر نہ اٹھائے۔ لیکن وائے قسمت :

شوق ہر رنگ، رقیبِ سروساماں نکلا — قیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا

یہ ایک حقیقت ہے، تلخ ہی سہی، کہ مایوسی اور ناکامی کے بغیر زندگی میں نکھار نہیں آتا۔ بلا زحمت اور بلا محنت اگر منزلِ مقصود تک رسائی ہوا کرتی تو غالباً آسودگیٔ منزل کی مسرت بھی زائل ہو جاتی۔ لذتِ حیات کے لئے نامرادی کی چاشنی درکار ہے۔ لہٰذا ہزاروں خواہشیں ایسی سہی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے لیکن لطف اسی میں ہے کہ سب ارمان "نہ نکلنے پائیں"۔ اور یہ بھی درست ہے کہ تازیانۂ نامرادی ہی بڑی بڑی مرادیں پوری کرنے کے لائق بناتا ہے۔ مثلاً طالب علموں کی راہ میں نصاب کا اعلیٰ معیار حائل ہوا کرتا ہے۔ ان کے اپنے مقاصد کی تکمیل ہوتی نظر نہیں آتی اور عزتِ نفس پر آنچ آتی دکھائی دیتی ہے۔ ایسی صورتِ حال سے دوچار ہونے والے بیشتر طلبا عموماً اپنے آپ کو ماحول کے ساتھ ہم آہنگ کر لیتے ہیں۔ اسباب کا جائزہ لے کر مناسب راہِ عمل تلاش کرتے ہیں۔ اگر دشواریاں عقدۂ لاینحل نظر آتی ہیں تو اپنے لئے قابلِ حصول مدارج کا تعین کرتے ہیں۔ وقت کے تقاضوں کا پہچاننا اور اپنی اہلیت کا اندازہ لگانا، ایک صالح ذہن کی علامات ہیں۔ لیکن ایک جذباتی ردِ عمل بسا اوقات، ماحول سے مطابقت پیدا کرنے نہیں دیتا۔ ناکامی کے اضطراب کو مناسب راہِ عمل اختیار کر کے کم کرنے کے بجائے خود فریبی کی چال بازیوں سے کم کیا جاتا ہے۔ ایک ناکام طالب علم اپنی تسکین کے لئے مختلف بہانے تلاش کرتا ہے۔ مثلاً اپنے آپ کو کھیل کے میدان میں ممتاز سمجھ کر خوش ہو جاتا ہے یا اساتذہ کی بے رخی اور بے توجہی کو اپنی ناکامی کا ذمہ دار ٹھہرا دیتا ہے۔ کوئی پہلے ہی سے پیش بندی کر ڈالتا ہے اور بیمار پڑ کر امتحان کی آزمائش سے ہی بچ نکلتا ہے۔ کوئی ہوائی محل تعمیر کر کے "عکسِ رُخ" والی کیفیت پیدا کر کے، اپنی بے چینی دور کر لیتا ہے۔ لیکن یہ اوچھے ہتھیار نہ کبھی کسی کے معاون ہوئے ہیں اور نہ ہوں گے۔ ان سے اصل غرض نہ کبھی پوری ہوئی ہے اور نہ ہوگی۔ ان کا عمل توقیر کا نہیں، تذلیل کا ہی باعث ہوتا ہے۔ ان کے برتنے سے وقار گھٹتا اور بے وقعتی بڑھتی ہے۔ مزید برآں یہ دوسروں کے لئے بھی باعثِ آزار ہوا کرتے ہیں۔ ہم سب کو حالات کے ساتھ مطابقت پیدا کرنے کی سعی کرنی چاہیئے اور اپنے آپ کو سمجھنا چاہیئے۔ ان طور طریقوں کے ذکر سے ہم میں سے کسی کو بھی آزردہ خاطر نہیں ہونا چاہیئے اور اس بات سے قطعی پریشان نہ ہونا چاہیئے کہ ان کا بیان ہمارے چال چلن اور عادات و اطوار کی غمازی کرتا ہے۔ اگرچہ یہ سب کسی شدید ذہنی

خلفشار کے مظہر بھی ہو سکتے ہیں۔ لیکن ان کی جھلک تو کہیں بھی دکھائی دے سکتی ہے مثال کے طور پر ہم سب ہی شعوری اور غیر شعوری طور پر اپنی کوتاہیاں، دوسروں کے نامہ اعمال میں لکھتے رہتے ہیں۔ لیکن یہ ایک انتہائی صورت ہے جبکہ کوئی شخص یہ سوچ کر پریشان ہونے لگے کہ اس کے گرد وپیش سب ہی لوگ کسی متفقہ سازش کے تحت اس کے درپے آزار ہیں۔ اس وقت عیب دار گھوڑے والی بات ہوتی ہے۔

اکبر اور جذباتی ہم آہنگی

ڈاکٹر محمد عمر۔ استاد تاریخ جامعہ رورل انسٹی ٹیوٹ

آج کل مختلف مذہبی فرقوں کے درمیان جذباتی ہم آہنگی پیدا کرنے کی بڑی جدوجہد کی جا رہی ہے اور اس مقصد میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے ہر قسم کے ذرائع اور وسائل اختیار کئے جا رہے ہیں لیکن یہ مسئلہ نیا نہیں ہے۔ اس ملک میں مسلمانوں کے آنے کے بعد پہلی مرتبہ یہ مسئلہ سامنے آیا۔ مگر اس وقت اس کی وہ نوعیت نہ تھی جو آج ہے۔ اس زمانے میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان جذباتی ہم آہنگی پیدا کرنے کی ضرورت کے احساس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہوگیا ہے کہ ہندوؤں کے مختلف فرقوں کے درمیان یک جہتی اور ہم آہنگی کے لئے جدوجہد کی جائے۔

مسلمانوں کے دورِ حکومت میں اس مسئلہ کا حل صوفیاء کرام اور شاہانِ وقت نے نکالا، اور اس طرح انھوں نے اسلامی رواداری پر عمل پیرا ہو کر اپنی وسعت قلبی، دور اندیشی اور سیاسی تدبر کا ثبوت دیا۔ عہد مغلیہ کے ماقبل اس کام کو زیادہ تر صوفیاء کرام اور ہندو بھگتوں نے جو بھگتی تحریک کے رہنما تھے، کیا۔ اور وہ لوگ اپنے اس مقصد میں بڑی حد تک کامیاب بھی ہوئے۔ ان کی کامیابی کی سب بڑی وجہ یہ تھی کہ ان کا فلسفۂ حیات، خالق اور مخلوق کی محبت اور اخوت و مساوات انسانی تھا۔ ان کی زندگی میں مذہب کی خالص روح رواں دواں تھی اور وہ لوگ ہر مذہب کی ان باتوں کو، جو انسانوں میں مذہبی اختلاف کی بناء پر دشمنی، عناد و نفرت پیدا کرتی ہیں، بُرا بتاتے تھے۔ وہ لوگ کسی کے مذہب کی مذمت نہیں کرتے تھے اور نہ اپنے مذہب کی برتری ثابت کرنے کے لئے بحث و مباحثہ کرتے تھے بلکہ ان کی رائے میں ہر مذہبی فرقہ اپنے انداز سے معبود حقیقی تک رسائی حاصل کرتا ہے شیخ نظام الدین اولیاء کا یہ مصرع اس طرز و انداز فکر کی نشاندہی

کرتا ہے :-

"ہر قوم راست راہے دینے و قبلہ گاہے"

صوفیاء کرام نہ صرف ہر مذہب و ملت کے لوگوں سے شگفتہ تعلقات رکھنے کے حامی تھے، بلکہ اس کی تلقین بھی کرتے تھے اور اکثر ان کی زبان سے یہ شعر سنا جاتا تھا۔

حافظا گر وصل خواہی صلح کن با خاص و عام

با مسلماں اللہ اللہ با برہمن رام رام[۵]

حاصل کلام یہ کہ یہ صوفی اور بھگت عوام کے ساتھ فقر و فاقہ میں گزر بسر کرتے تھے اور اپنے اعمال صالحہ سے لوگوں کے دلوں کو متاثر کرتے تھے اور اپنی بلند اخلاقی، وسعت قلبی، مذہبی رواداری بلند ہمتی اور اپنی شانِ استغنا سے لوگوں کے دلوں کو موہ لیتے تھے۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان برادرانہ تعلقات اور جذباتی ہم آہنگی قائم ہو گئی۔ ان رہنماؤں میں خواجہ معین الدین چشتی اجمیری، شیخ بابا فرید گنج شکر، شیخ نظام الدین اولیا دہلوی اور حضرت امیر خسرو کبیر داس، گرو نانک، پیپا، رائے داس، دادو دیال اور چیتنا مہا پربھو خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

اکبر بادشاہوں میں اکبر وہ پہلا بادشاہ تھا جس نے اپنی رعایا کے درمیان جذباتی ہم آہنگی پیدا کرنے کی پوری پوری کوشش کی اور اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لئے کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ اکبر کے عہد میں یہ مسئلہ موجودہ زمانے کے مقابلے میں بہت زیادہ نازک اور دقت طلب تھا۔ سب سے پہلے اکبر کو اس ملک میں ایک مضبوط انتظامی مرکزیت قائم کرنا تھا اور اس کام میں اس نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ صرف کیا۔ اس نے اپنی سیاسی بصیرت، فراست اور جنگ و پیکار سے تمام شمالی ہندوستان اور جنوبی ہند کے کچھ علاقوں پر اپنا تسلط قائم کیا اور اس طرح پورے ملک کو ایک مضبوط مرکزیت بخشی۔ ایک ہی قسم کا نظم و نسق، ایک سرکاری زبان

۵۔ نافع السالکین، ص ۱۷۶

ایک ہی طرح کا سکہ، اور مرکزی ملازمت کا نظام، اس مرکزیت کے عناصر اربعہ کہے جا سکتے ہیں۔ سرکاری ملازموں کا ایک علاقے سے دوسرے علاقے کو تبادلہ کیا جاتا تھا اور یہ طریقہ کار اس بڑے ملک میں انتظامی اور سیاسی استحکام اور مرکزیت قائم رکھنے کا ایک بڑا اور موثر وسیلہ تھا۔

مذہبی رواداری اور مساوات

تاریخ کی مستند کتابیں شاہد ہیں کہ مسلمانوں کے دور حکومت میں غیر مسلم رعایا کو پوری مذہبی آزادی حاصل تھی۔ مگر کچھ سیاسی اور انتظامی قوانین ایسے تھے جن کو مذہب کا رنگ دے کر بعض مورخوں نے مسلمان بادشاہوں کو متعصب اور تنگ نظر ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔

بہر حال اکبر نے مذہبی رواداری اور مساوات کی اس پالیسی کو بہت نمایاں کر کے پیش کیا۔ مثلاً اس نے جنگ کے دوران میں پکڑے ہوئے قیدیوں کو غلام بنانے کے قاعدے (۱۵۶۲ء) جاترا ٹیکس (۱۵۶۳ء) اور جزیہ (۱۵۶۴ء) کو ختم کر کے اپنی اعلیٰ سیاسی بصیرت، تدبر اور فراست کا ثبوت دیا۔ اور اس طرح اس نے ان قوانین کو منسوخ کر دیا جو شریعت کی اصل روح اور مقتضائے زمانہ کے منافی تھے۔ اکبر کا قول تھا:

"ہم کو ہر شخص کے ساتھ صلح سے کام لینا چاہیئے۔ اگر وہ خدا کی خوشنودی حاصل کرنے میں مشغول ہے تو اس سے جنگ کرنا معیوب ہے اور اگر ایسا نہیں ہے تو ایسے افراد نادانی کے مرض میں مبتلا ہیں اور مہربانی کے قابل ہیں۔"[1]

مختصر یہ کہ اکبر اپنی صلح کل پالیسی کو عملی جامہ پہنانا چاہتا تھا اور اپنی مسلم اور ہندو رعایا کے درمیان مذہبی اعتبار سے کسی قسم کی تفریق نہیں چاہتا تھا اور اس کے اس عمل میں سیاسی نقطۂ نظر غالب تھا۔ اُس کے زمانے تک ہندوستان کی مذہبی فضا ایسی ہو چکی تھی کہ اب ہندو، اپنے مسلمان بادشاہوں کی ملازمت بخوشی قبول کرنے لگے تھے اور ابتدائی نفرت و حقارت کا جذبہ ان کے دلوں سے مفقود اور محو ہو چکا تھا۔ اکبر نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور جو ہندو

---

[1] آئین اکبری (اردو ترجمہ) ج ۲۔ ص ۳۵۲۔

اس کے یہاں ملازمت کرنا چاہتا، اُسے وہ بخوشی اور خندہ پیشانی سے ملازم رکھ لیتا۔ اکبر جیسے رعیت پرور بادشاہ کے یہاں نوکری کرنا غیر مسلم رعایا اپنے لئے باعث فخر سمجھتی تھی۔

شاہانِ ہند اور مذہبی قوانین

یہ خیال عام ہے اور اکثر مورخ بھی یہی سمجھتے ہیں کہ مسلمانوں کے عہد حکومت میں ہندوستان میں اسلامی حکومت تھی لیکن لوگ یہ بھول جاتے ہیں کہ حکمراں چاہے ہندو ہو یا مسلمان، پہلے وہ بادشاہ ہوتا ہے اور بعد میں کسی ایک مذہب کا پیرو مختصر یہ کہ سلاطین دہلی اور شاہانِ مغلیہ پہلے حکمراں اور بادشاہ تھے۔ اور بعد میں مسلمان۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے کبھی اشاعت و ترویج اسلام کو اپنا شیوہ نہیں بنایا۔

مغلوں نے جب ہندوستان فتح کیا تو انھیں یہاں ایک ایسی فضا ملی جو بھگتی تحریک کے نغموں سے معمور تھی، مسلمانوں اور ہندوؤں کو ایک ساتھ رہتے ہوئے تین سو سال بیت گئے تھے اور ایک خاص سطح پر ان میں میل جول بڑھ گیا تھا اور اتحاد و یک جہتی کے عناصر اپنا اثر ڈال رہے تھے، پھر مغلوں میں نسبتاً مروت، رواداری زیادہ تھی، اس لئے انھوں نے طبعاً اور مصلحتاً اس کی کوشش شروع کی کہ کوئی ایسا مسلک نکلے جو سب کے لئے قابلِ قبول ہو۔ مغل بادشاہوں میں اکبر نے ہندوستان کے اس ماحول کو اچھی طرح سمجھا، پھر اُسے اس کا موقع بھی ملا کہ وہ اس ماحول کو برقرار اور بہتر بنانے کی کوشش کرے۔ لہٰذا اس نے اُمور مملکت اور نظام حکومت میں مذہب کو ابتدا ہی سے دخیل نہ ہونے دیا۔ اس نے ایک غیر مذہبی حکومت قائم کرنے کی حتی الامکان کوشش کی اور اپنے اس مقصد میں وہ بڑی حد تک کامیاب بھی ہوا۔ اس نے اپنی رعایا کو ہر قسم کی مذہبی آزادی دی اور "کار جہانبانی" کو مذہب کے اثر سے الگ رکھا۔

یہ سب کچھ کرنے پر بھی اکبر کو پورا اطمینان حاصل نہ ہوا بھگتی تحریک اور صوفیاء کرام کی تمام کوششیں ایک ایسے ملک کے لئے تھیں کہ جس پر ہندو اور مسلمان دونوں شانہ بشانہ چل سکیں۔ حاصل کلام یہ کہ وہ لوگ "دینِ محبت" قائم کرنا چاہتے تھے۔ کبیر نے اس دوہے

میں اسی مقصد کی طرف اشارہ کیا ہے :

جات پات کوئی پوچھت ناہی
ہری کو بھجے سو ہری کا ہو ہی

اکبر نے اپنے ماحول کے اس تقاضے کی صدائے بازگشت سُنی اور اس نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان جذباتی ہم آہنگی پیدا کرنے کا ایک نیا طریقہ یا مسلک نکالا جو "دین الہٰی" یا "رہنمونی" کے نام سے مشہور ہے۔ اس سلسلے میں مورخوں میں کافی اختلافات پائے جاتے ہیں۔ ایک گروہ کا خیال ہے کہ یہ ایک نیا مذہب تھا اور دوسرے گروہ کا کہ صوفیائے کرام کے دیگر سلسلوں کی طرح یہ بھی ایک سلسلہ تھا۔ یہی دوسرا خیال زیادہ صحیح بھی معلوم ہوتا ہے۔ کیوں کہ اکبر پر تصوف کا بہت غلبہ تھا اور اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنی تمام رعایا کو اپنا مطیع اور فرماں بردار بنانے کے علاوہ ان کے مذہبی اختلافات کو بھی دور کرنا چاہتا تھا۔

"دین الہٰی" کے متعلق ڈاکٹر تاراچند کا یہ خیال بالکل صحیح ہے کہ یہ کوئی نیا مذہب نہ تھا بلکہ ہندوستان کی مذہبی سدھار تحریکوں کا لازمی نتیجہ تھا جس کا اظہار کبیر جیسے بزرگوں کی تعلیمات میں ملتا ہے۔

اکبر نے "دین الہٰی" کو اس انداز سے ترتیب دیا تھا کہ جس میں ہندوستان کے تمام مذاہب کی اچھی اچھی باتیں آجائیں تاکہ ہندوستان کی قدیم مذہبی فرقہ پرستی نیست و نابود ہو جائے اور تمام رعایا ایک ایسے مسلک پر عمل کرنے لگے جس کا قائدِ اعظم اکبر بادشاہ ہو۔

اس پالیسی کا فوری نتیجہ یہ ہوا کہ ہر قسم کے فقیر، سنیاسی، جوگی، سیوڑہ، قلندر، حکیم اور صوفی، ہر طرح کے اہل سیف و اہل قلم، سوداگر، کسان و پیشہ ور اکبر کی خدمت میں حاضر ہونے لگے اور اکبر کو اپنا روحانی رہنما سمجھنے لگے[1]

لوگوں کو مرید کرتے وقت اکبر جو شرائط ان پر عائد کرتا تھا، ان سے بھی یہی معلوم

---

[1] آئین۔ (اُردو) ج اول۔ ص ۳۰۷۔

ہوتا ہے کہ وہ اپنا ایک نیا سلسلہ قائم کرنا چاہتا تھا۔ جس کے افراد اکبر کے لئے جان، مال، مذہب اور عزت تک قربان کر دیں[1]۔

اس سلسلے میں اکبر نے اور جو کچھ کیا اس کے بالتفصیل بیان کی یہاں گنجائش نہیں ہے لیکن اتنا سمجھ لینا کافی ہے کہ اکبر نے اپنے سلسلے کے دستور میں تمام مذاہب کے عمدہ عمدہ اصول شامل کر لئے تھے اور اس طرح تمام فرقوں کے لوگوں کو اپنا گرویدہ بنا لیا تھا۔

ہندوستان کی تاریخ میں اکبر کا یہ بہت بڑا کارنامہ تھا اور اس کا اثر یہ ہوا کہ مختلف مذاہب کے پیروؤں میں جذباتی ہم آہنگی اور یگانگت پیدا ہو گئی اور ساتھ ساتھ اس کی حکومت کی جڑیں مضبوط اور مستحکم ہو گئیں۔

معاشرتی یک جہتی

اکبر کا دوسرا کارنامہ، جو سیاسی اور انتظامی مرکزیت قائم کرنے سے کہیں زیادہ وقت طلب تھا، یہ تھا کہ اس نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان معاشرتی ہم آہنگی پیدا کرنے اور ایک متحدہ قومیت کی بنیاد ڈالنے کی کوشش کی۔ اپنے اس مقصد کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لئے اس نے خود راجپوت گھرانوں میں شادیاں کیں۔ ان عورتوں کو مسلمان ہونے پر مجبور نہیں کیا گیا بلکہ مغل حرم سرا میں رہتے ہوئے انھیں اپنے مذہبی عقائد کے مطابق زندگی گذارنے کی آزادی دی۔ یہ رانیاں اور ان کی خادمائیں حرم سرا میں بت پرستی کرتیں اور بلا مزاحمت اپنے دیگر مذہبی رسومات ادا کرتیں۔ حرم سرا میں ہون کی رسم ادا ہوتی تھی جس کی ادائیگی کے وقت ویدوں کے منتر بھی پڑھے جاتے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ اکبر نے خود بھی ہندو رسوم اور تیوہاروں کو منانا شروع کیا۔ مثلاً جھروکہ، درشن، تولہ دان، رکشا بندھن، دسہرہ، ہولی، بسنت، دیوالی، اور شیوراتری۔

ہندوؤں کے تیوہاروں کے منانے میں اکبر کی نیک نیتی کا پتہ اس واقعہ سے چلتا ہے کہ اتفاقاً دسہرہ سے ایک دن قبل اس کی والدہ رحلت فرما گئیں۔ اکبر نے حکم دیا کہ اس شام کو سوگ نہ منایا

---

[1] بدایونی۔ ص ۲۹۹۔

جائے کیوں کہ دوسرے دن اسے بڑی دھوم دھام سے دسہرہ کا تیوہار منانا تھا۔[۵۱]

اکبر نے نہ صرف خود ہندو گھرانوں سے شادی بیاہ کرکے تعلقات پیدا کئے بلکہ اس نے ہندوؤں اور مسلمانوں میں یگانگت اور اخوت کو ایک مستحکم صورت دینے کی غرض سے اپنے لڑکوں کی شادیاں بھی ہندو گھرانوں میں کیں۔ اس کا قول تھا کہ "بیگانہ افراد میں شادی کرنا پسندیدہ ہے۔ کیوں کہ بیگانگی، یگانگت سے مبدل ہو جاتی ہے"۔[۵۲]

یہ شادیاں راجپوتوں کے رسم و رواج کے مطابق ہوئی تھیں۔ طرف ثانی کے گھر دولھا کو برات کے ساتھ لے جایا جاتا تھا اور شادی کے موقع پر ہندو اور اسلامی دونوں رسومات عمل میں آتے تھے۔

اکبر نے اپنے عزیز دل کی وفات پر ہندوؤں کے عقائد مذہبی کے مطابق اپنے سر، داڑھی اور مونچھ کے بال منڈوا کر سوگ منانا شروع کیا۔ اس نے اپنی والدہ اور اپنی مخصوص انّہ جیجی انگا کی، جس کو وہ اپنی ماں کے مثل سمجھتا تھا، وفات پر ان رسومات پر عمل کرکے سوگ منایا۔

اکبر کے اس طرز عمل کا اثر یہ ہوا کہ اعلیٰ طبقے کے مسلمانوں نے بھی سوگ کی اس رسم و رواج کو اپنا لیا۔ اُن میں ابوالفضل اور فیضی خاص طور پر قابل ذکر ہیں، جنھوں نے اپنے والد کے انتقال پر اپنے سر، داڑھی اور مونچھ کے بال منڈوائے تھے۔ اغلباً عزیز کوکا نے بھی اپنی والدہ کی وفات پر یہی عمل کیا تھا۔

دسہرہ اور دوسرے ہندو تیوہاروں کے موقعوں پر اکبر نے، اسی انداز اور پیمانے پر جس طرح وہ دونوں عیدوں کے موقعوں پر کیا کرتا تھا، دربار میں جشن منانے کی رسم جاری کی۔ ان جشنوں کے موقعوں پر انواع و اقسام کی آرائش کی جاتی، رقص و سرود کی محفلیں سجائی جاتیں اور کھانوں سے لوگوں کی ضیافت کی جاتی۔[۵۳] ان جشنوں میں اونچے درجے کے ہندو اور مسلمان دونوں مدعو

---

۵۱ اکبر نامہ (فارسی)، ج ۳۔ ص ۸۳

۵۲ آئین۔ ج ۲۔ ص ۳۶۸

۵۳ آئین اکبری (اردو ترجمہ)، ج اول۔ ص ۱۱، ۱۲

کئے جاتے تھے۔ اگرچہ ان کے نشست و برخاست کا الگ الگ انتظام کیا جاتا تھا، پھر دونوں فرقوں کے لوگوں کو ایک دوسرے کے قریب تر لانے کی غرض سے اکبر نے یہ طریقہ اپنایا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اکبر کے عہد حکومت میں ہندو اور مسلمان آپس میں ایک دوسرے کے اتنے زیادہ قریب ہو گئے اور ان کے سماجی رسومات اس قدر یکساں ہو گئے اور مذہبی اختلافات اتنے دور ہو گئے کہ ہندو اور مسلمان کی تفریق کرنا صرف ناموں یا کچھ مذہبی عقائد کی بنا پر ممکن ہو سکتا تھا۔

اکبر نے ہندو سماج کا سدھار بھی کیا اور ان کی ان رسومات کو قانونی طور پر بند کروا دیا جو نقصان رساں تھیں۔ مثلاً لڑکے، لڑکی کی شادی کی عمر کی مدت بڑھا دی، کثرت ازدواج، ستی کی رسم، حرام کاری اور شراب نوشی پر سخت پابندیاں عائد کر دیں۔ اس نے گداگری کو ختم کرنے کی بھی پوری کوشش کی۔ یہ قوانین ہندو اور مسلمان دونوں کے لئے یکساں نافذ کئے گئے تھے۔

ثقافتی یک رنگی اکبر نے ہندوستان میں ایک قوم (جو نہ تو ہندو ہو اور نہ مسلمان بلکہ ہندوستانی ہو) کے جذبے کو پیدا کرنے کی دوسری کوششیں بھی کیں۔ اس نے محسوس کیا کہ ان دو قوموں کے درمیان حقیقی تعاون اور یک جہتی کی خالص روح پیدا کرنے کے لئے ثقافتی یک رنگی بہت ضروری ہے۔

اکبر کے دربار کی زبان فارسی تھی، اس نے ضروری سمجھا کہ تعلیم یافتہ لوگوں کے لئے ایک لٹریچر ہو۔ اس کے لئے اس نے اپنے عہد کے علماء و فضلاء کو مختلف فنون کے اصلی نسخوں کو اس زبان میں منتقل کرنے کا کام سونپا۔ اپنی نگرانی میں ترجمے کرنے کا ایک شعبہ قائم کیا اور عربی، سنسکرت، ترکی اور یونانی زبان کی اعلیٰ تصانیف کے فارسی زبان میں ترجمے کرائے۔ اور اپنے درباریوں اور دیگر اعلیٰ عہدہ داروں کو یہ کتابیں بہم پہنچائیں۔ ہندوؤں مسلمانوں، پارسیوں کی مذہبی اور غیر مذہبی کتابوں کا ترجمہ فارسی میں کرایا تاکہ مختلف مذہبی گروہ ایک دوسرے کے مذہبی اور غیر مذہبی خیالات اور عقائد تک رسائی پا سکیں اور ان کو اچھی طرح سمجھ سکیں۔ ابوالفضل نے لکھا ہے کہ

"اہل زبان و زبان داں حضرات کا ایک گروہ ہمیشہ ہندی، یونانی، عربی فارسی زبانوں کی

کتابوں کا دوسری زبانوں میں ترجمہ کرتا ہے"۔ ذیل کی کتابوں کے ترجمے ہوئے۔

(۱) زیچ جدید۔ میرزائی میر فتح اللہ شیرازی کی جاں فشانی اور ابوالفضل کی امداد سے کشن جوگی گنگا دھر مہا نند نے فارسی سے ہندی میں ترجمہ کیا۔

(۲) مہابھارت کو نقیب خاں و مولانا عبدالقادر بدایونی اور شیخ سلطان تھانیسری نے ہندی سے فارسی میں ترجمہ کیا۔

(۳) رامائن، نقیب خاں، مولانا عبدالقادر بدایونی اور شیخ سلطان تھانیسری نے فارسی میں ترجمہ کیا۔

(۴) اتھروید کو حاجی ابراہیم سرہندی نے فارسی زبان کے قالب میں ڈھالا۔

(۵) لیلاوتی کو، جو فن حساب کی بہترین تصنیف ہے، فیضی نے فارسی کا جامہ پہنایا۔

(۶) تاجک کو، جو علم نجوم کی بہترین اور معتبر کتاب ہے، مکمل خاں گجراتی نے فارسی زبان میں ترجمہ کیا۔

(۷) تزک بابری۔ مرزا خان خاناں نے ترکی سے فارسی میں ترجمہ کیا۔

(۸) معجم البلدان، کو، ملا احمد اللہ و قاسم بیگ و شیخ منور نے عربی سے فارسی زبان میں ترجمہ کیا۔

(۹) ہربنس، جو سری کشن کے حالات کا ایک معتبر نسخہ ہے، مولانا شیری کی کوشش سے فارسی زبان میں ظاہر ہوا۔

(۱۰) کلیلہ دمنہ۔ ابوالفضل نے عیار دانش کے نام سے اسے فارسی میں منتقل کیا۔

(۱۱) نل دمن کا، جو ہندی زبان میں ایک جگر گداز افسانہ ہے، فیضی نے فارسی میں ترجمہ کیا۔

مندرجہ بالا کے علاوہ دوسری کتابوں کے بھی ترجمے ہوئے تھے۔

اکبر نے طریقۂ تعلیم اور نصاب میں بھی سدھار کئے۔ نصاب سے فرسودہ کتابوں کو نکال کر ان کتابوں اور مضامین کا اضافہ کرایا جو عوام کے لئے باعثِ دلچسپی ہو سکتے تھے علاوہ ازیں

ایک ہی درسگاہ میں ہندو اور مسلمان بچوں کو ایک ساتھ تعلیم حاصل کرنے کے طریقے کو رائج کیا۔ اس وقت سے ہندوؤں نے بڑی دلچسپی کے ساتھ فارسی زبان سیکھنا شروع کی اور تھوڑی ہی مدت میں اس زبان پر اتنا عبور حاصل کرلیا کہ مسلمانوں سے کسی طرح پیچھے نہ رہے۔

اس کے ساتھ ساتھ اکبر نے سنسکرت زبان اور ہندی شاعری کی بھی حوصلہ افزائی اور سرپرستی کی۔ اور یہ اسی کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ وہ دور ہندی ادب کا سنہری دور کہلاتا ہے۔ اس کے دربار سے کئی ہندی کے شاعر وابستہ تھے۔ مثلاً مہاپاتر نرہری بندی (۱۵۰۵ء تا ۱۶۱۰ء) کو اکبر نے مہاپاتر کے خطاب سے سرفراز کیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ مہاپاتر نے گائے کی تعریف میں ایک شعر کہا تھا کہ اس کو سُن کر اکبر اتنا متاثر ہوا کہ اس نے گائے کُشی بند کروادی تھی۔ عالم، ٹوڈرمل، منوہر کوی، عبدالرحیم خانخاناں، بیربل، گنگ بھی اکبر کے دربار سے وابستہ تھے۔ ان کے علاوہ سورداس، تلسی داس، بلبھدر مسر، جمال، کیشوداس اسی کے عہد میں پروان چڑھے تھے۔

اکبر نے خود بھی ہندی میں شعر کہنے کی کوشش کی تھی اور ذیل کا ہندی کا شعر اسی کا بتایا جاتا ہے جو اس نے بیربل کی وفات پر کہا تھا۔

दीन देखि सब दीन, एक न दीन्हों दुसह दुःख।

सो अब हम कहँ दीन, कुछ नाहिँ राख्यो बीरबल॥

فنِ تعمیر

تہذیبی یک رنگی اور جذباتی ہم آہنگی کے منصوبے کے پیش نظر اکبر نے فنونِ لطیفہ کے میدان میں بھی کچھ کارہائے نمایاں انجام دیئے، اس سلسلے میں سب سے پہلے ہم فنِ تعمیر کا ذکر کریں گے۔ اکبر کے مزاج میں بڑی جدّت اور طبیعت میں بڑی جودت تھی، اس کا ثبوت اس کی اس کوشش میں ملتا ہے کہ اس نے ہندو فنِ تعمیر اور مسلم فنِ تعمیر کے مابین ایک خوشگوار اور حسین امتزاج پیدا کرنے اور ایک نئے فنِ تعمیر کی ترقی کے سامان اور مواقع فراہم کئے۔ اُس کی سرپرستی میں ہندو مسلم ماہرینِ فن نے مل کر ہندو مسلم فنِ تعمیر کا ایک خاص دبستان قائم کیا۔

ترکوں کے ہندوستان میں ورود سے پہلے یہاں فن تعمیر کے بڑے بڑے شاہکار موجود تھے اور وہ زیادہ تر ہندوؤں اور بدھوں کے مندروں اور مٹھوں کی شکل میں تھے۔ ہندوؤں کا اسلوب تعمیر یہ تھا۔ چھتیں شہتیر دار اور چورس ہوتی تھیں، مکانوں میں مورتیاں بھی ہوتی تھیں، مکان اور مندر کی دیواریں نقش و نگار سے مزین اور آراستہ، بڑے بڑے ستون اور ستون دار مکانوں کی چھتوں کے چاروں طرف پتھر یا اینٹ کی باہر کو نکلی ہوئی آڑیں، مخروطی گنبد اور بیرمی اصولوں پر بنی ہوئی محرابیں۔

اس کے برخلاف مسلمان اپنے ساتھ مسلم فنِ تعمیر لائے تھے، مثلاً وہ عمارت کے جوڑنے میں ایک مسالہ کا استعمال کرتے تھے، محراب، مینار، کاشی کاری، بسنت کاری، لداؤ چھتیں۔ نصف گنبد دار دوہرے پھاٹک اور چوڑا کھلا ہوا صحن، اور سب سے بڑھ کر خطاطی۔ اکبر کی سرپرستی میں مسلم معماروں نے ہندو طرزِ تعمیر کی بعض خوبیوں کو اپنا لیا اور ان کو اپنے فنی شاہکاروں میں اس طرح سمویا کہ وہ اس فن کا جزولاینفک بن گئیں۔

اس ہندو مسلم فنِ تعمیر کے اعلیٰ نمونے آگرہ کے قلعے، فتح پور سیکری، الہ آباد اور لاہور کے قلعوں کی عمارتوں میں ملتے ہیں۔ پانچ سو عمارتیں جو بنگالی اور گجراتی طرز پر بنوائی گئیں، ان میں جہانگیری محل، جو قلعہ کے اندر اکبر نے تعمیر کروایا خاص طور سے قابلِ ذکر ہے، اگرچہ اس کی ترتیب اسلامی ہے، لیکن اس کا خاکہ اور صناعی ہندو فنِ تعمیر کے اسلوب پر ہے۔ اس کی چھتیں ہموار، اور دروازے چوکور ہیں۔ اور اس کے سنہرے منقش پتھروں کو دیوارگیریوں سے آراستہ کیا گیا ہے، جن پر پتھر کے شہتیر قائم ہیں۔ ان کی بناوٹ ہندو فنِ تعمیر کے طرز پر ہے فتح پور سیکری میں اکبر کی تعمیر کردہ عمارتوں میں دیوانِ خاص، مریم مکانی کا محل، جودھا بائی کا محل اور ترکی سلطانہ کا محل ہندو مسلم فنِ تعمیر کے امتزاج کے اعلیٰ نمونے ہیں۔ شیخ سلیم چشتی کے مقبرے کی عمارت میں بھی اس نئے اسکول کے اثرات نمایاں ہیں۔

اکبر نے مجسمے سازی کے فن کی بھی حوصلہ افزائی کی۔ اس نے چتوڑ کے بہادروں ——

جےمل اور پاٹا — کے پتھر کے ہاتھی پر سوار مجسمے بنوائے اور ان کو آگرے کے قلعہ کے دہلی دروازے کے سامنے نصب کرایا۔ فتح پور سیکری میں اپنے قلعہ کے ہاتھی پول دروازے کی زینت اس لئے سرخ پتھر کے دو ہاتھیوں سے بڑھائی۔ مریم مکانی کے محل کے مکانوں کے سائبان کی دیواروں کے چاروں طرف چھجے پر ہاتھی اور دوسرے جانوروں کے مجسمے نصب تھے۔ لاہور کے قلعے میں کثرت سے طاؤس اور دوسرے پرندوں اور جانوروں کے مجسمے لگے ہوئے تھے۔

مصوری، خطاطی اور دیواری تصاویر

تاریخ کی مستند کتابیں شاہد ہیں کہ "عہد سلطنت میں تصویر کشی رائج تھی اور دیواروں اور شاہی محلوں پر مختلف قسم کی تصویریں بنائی جاتی تھیں[۵۱]۔ لیکن مغلوں کے عہد میں اس فن کی اتنی ترقی ہوئی کہ یہ فن اپنے نقطۂ کمال کو پہنچ گیا۔ دربار اکبری علم و فن کا بہت بڑا مرکز تھا اور اس کی سرپرستی میں فن مصوری نے ایسا عروج حاصل کیا کہ مغلیہ زمانے کے مصوروں کا اپنا ایک مخصوص دبستان وجود میں آیا۔

اکبر کو ابتدائے عمر سے ہی فن مصوری سے بڑی رغبت تھی۔ ابوالفضل لکھتا ہے:

"جہاں پناہ کو اس فنِ لطیف سے ابتدائے عمر سے ذوق و شوق ہے اور ہمیشہ اس امر پر توجہ فرماتے ہیں کہ اس فن کی روز افزوں ترقی ہو۔"

"قبلۂ عالم کی قدردانی و پرورش سے اس دلکش جادو نگاری کو انتہائی ترقی نصیب ہوئی اور ایک گروہ کثیر اس فن کا یکتائے روزگار استاد بن گیا۔"[۵۲]

اکبر نے ایک دن خلوت کدے میں جہاں صرف مریدان خاص کا مجمع تھا کہا:

" ایک گروہ فنِ تصویر کشی کا دشمن ہے اور اس پیشے کے معائب بیان کرتا ہے

---

[۵۱] برائے تفصیل ملاحظہ ہو: فتوحاتِ فیروز شاہی (علی گڑھ فارسی مطبوعہ) ص ۱۱، تاریخ فیروز شاہی ص ۲۹۰، ۳۷۴، ۳۸۴، مسلم ثقافت ہندوستان میں۔ ص ۳۸۱۔

[۵۲] آئین (اردو ترجمہ) ج اول، ص ۱۹۳۔

لیکن ان کے اقوال و دلائل کو دل سے قبول نہیں کرتا بلکہ قرینِ قیاس و عقل یہ ہے کہ مصور اکثر طبقات انسانی سے زیادہ خدا شناس ہو سکتا ہے۔ اس لئے کہ یہ شخص جانور کی تصویر اتارتا ہے، اس کے ہر عضو کی شبیہ کھینچتا ہے اور تصویر کو تمام کر کے جب یہ دیکھتا ہے کہ باوجود اس ظاہری سحر نگاری کے وہ اس میں روح پھونکنے سے عاجز و عاری ہے تو اس کو خالق مطلق کی قدرت کاملہ کا اندازہ ہوتا ہے اور صانع باکمال کے آگے سربسجدہ ہو جاتا ہے۔"[1]

وسط ایشیا میں فنِ مصوری کی بڑی قدر تھی۔ خراسان کے حکمران سلطان حسین مرزا کی سرپرستی میں اسے بہت فروغ ملا۔ بہزاد اس کے دربار سے منسلک تھا۔ اس نے چین کے فنِ مصوری کے بعض عناصر وسط ایشیائی فن مصوری میں شامل کئے۔ بہزاد کے چابکدست شاگرد آغا مرزا تبریزی، سلطان محمد اور مرزا علی نے فنِ مصوری کے اعلیٰ شاہکار پیش کئے۔ سلطان حسین مرزا کے انتقال کے بعد بہزاد ایران کے سلطان اسمٰعیل صفوی کے دربار سے وابستہ ہو گیا اور اس نے چینی یا منگولی فنِ مصوری میں ایرانی رنگ اس خوش اسلوبی سے سمویا کہ اس میں ایرانی طرز کی چمک دمک نمایاں ہو گئی۔

اکبر کی قدردانی اور سرپرستی کی بنا پر یہ فن اسی صورت میں ہندوستان لایا گیا۔ اس نے خواجہ عبدالصمد شیرازی کو، جو ہندوستان میں آنے سے پہلے ہی اس فن میں کافی شہرت حاصل کر چکا تھا اور ہمایوں کی دعوت پر ہندوستان آچکا تھا، بادشاہ کے لئے تصویریں اور دیواری تصاویر بنانے کا حکم دیا۔

اکبر نے ہندو مصوروں کو بھی اپنے یہاں ملازم رکھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ ایرانی اور ہندوستانی فن مصوری کے امتزاج سے ایک نیا طرز رونما ہوا، جس کو ہندو مغل دبستانِ مصوری کہتے ہیں۔ رفتہ رفتہ اس فن سے بیرونی اثرات زائل ہو گئے اور یہ فن

---

[1] آئین۔ ج اوّل۔ ص ۱۹۵۔

خالص ہندوستانی ہوگیا۔[۱]

موسیقی مسلمان بادشاہوں نے موسیقی کے فنِ لطیف کی ترقی اور تہذیب کے سلسلے میں بھی کارہائے نمایاں انجام دیے۔ مسلمانوں کو ہندوستانی موسیقی سے عمومی شغف تھا اس سلسلے میں مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کا ذیل کا بیان بڑا اہم ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ:

"اب ہندوستان کے علوم وفنون مسلمانوں کے لئے غیر ملکی نہیں رہے تھے۔ بلکہ خود ان کے گھر کی دولت بن گئے تھے۔ اس لئے ممکن نہ تھا کہ وہ ہندوستانی موسیقی کے علم وذوق سے تغافل برتتے۔ چناں چہ ساتویں صدی ہجری میں امیر خسرو جیسے مجتہدین کا پیدا ہونا اس حقیقتِ حال کا واضح ثبوت ہے۔ اب ہندوستانی موسیقی، ہندوستانی مسلمانوں کی موسیقی بن چکی تھی اور فارسی موسیقی غیر ملکی موسیقی سمجھی جانے لگی تھی۔۔۔۔۔۔ خلجی اور تغلق کے درباروں میں ہندوستانی موسیقی کی مقبولیت اور قدر دانیوں کے واقعات تاریخ میں موجود ہیں۔ لیکن جس شاہی خاندان نے موسیقی سے بحیثیت فن کے خاص اعتنا کیا، وہ غالباً جون پور کا شرقی خاندان تھا۔۔۔۔ مالوہ، بنگال اور گجرات کے بادشاہوں کے ذاتی اشتغال وذوق کے واقعات تاریخ میں کثرت میں ملتے ہیں۔ گور کے سلاطین ملکی زبان اور ملکی موسیقی دونوں کے سرپرست تھے۔ مالوہ کے باز بہادر کو روپ متی کے عشق نے ہندی کا شاعر بھی بنا دیا اور موسیقی کا ماہر بھی۔"[۲]

دوسرے فنون لطیفہ کی طرح اکبر نے فن موسیقی میں بھی بے حد دلچسپی لی اور اختراعات کئے۔ اکبر کو اس فن سے ابتداء عمر سے دلچسپی اور شغف تھا۔ ابوالفضل نے لکھا ہے کہ:

"قبلۂ عالم اس فن پر خاص توجہ فرماتے ہیں۔ اور ہر موسیقی داں کے سرپرست اور مربّی ہیں۔"[۳]

---

[۱] اکبر کے دربار سے وابستہ ہندو مصوّروں کے ناموں کے لئے ملاحظہ ہو۔ آئین (اردو ترجمہ) ج اول ص ۹۵، ۱۹۴

[۲] غبار خاطر۔ صفحات ۳۱۹، ۳۲۵۔

[۳] آئین۔ ج اول، ص، ۵۳۷۔

تان سین گوالیاری بھی اکبر کے دربار میں ملازم تھا۔ اس نے فنِ موسیقی کی تعلیم گوالیار کے اس اسکول میں پائی تھی جس کو راجہ مان سنگھ تومر نے قائم کیا تھا۔

چوں کہ اکبر کے دربار میں ہندو مسلم دونوں فرقوں کے مشہور موسیقار جمع ہو گئے تھے، اس بنا پر اکبر کی سرپرستی میں ہندی اور اسلامی فن موسیقی میں اختلاط ہوا اور قدیم ہندی راگ و نغمہ میں بڑی حد تک تبدّل و تغیّر ہوا۔ اور اس طرح موسیقی کے ایک نئے دبستان کا قیام عمل میں آیا۔

مولانا فضل حق خیرآبادی

مولانا امداد صابری

علامہ فضل حق خیرآبادی فرنگی ۱۲۱۲ھ مطابق ۱۷۹۷ء میں خیرآباد میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد مولانا فضل امام اپنے دور کے عالموں میں ممتاز درجہ رکھتے تھے۔ دہلی میں دارالسلطنت میں صدر الصدور کے عہدہ پر فائز تھے۔ مولانا فرنگی کے دادا مولانا محمد ارشد نے ہرگام سے خیرآباد رہائش اختیار کی تھی۔

آپ کا سلسلۂ نسب ۳۳ واسطوں سے خلیفہ ثانی حضرت عمر رضی اللہ عنہ تک پہنچتا ہے۔ علامہ کے مورث اعلیٰ شیر الملک بن شاہ عطار الملک ایرانی تھے۔

مولانا فضل امام بڑے ذہین تھے۔ مولانا سید عبدالواجد کرمانی خیرآبادی سے علوم مروجہ کی تحصیل کی۔ ۱۲۲۵ھ مطابق ۱۸۱۰ء میں تیرہ سال کی عمر میں تمام مروجہ علوم نقلیہ وعقلیہ کی تکمیل کی، چار ماہ اور کچھ دنوں میں قرآن مجید حفظ کیا، منقولات کی تحصیل حضرت شاہ عبدالقادر محدث اور حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی سے کی۔

تعلیم کی تکمیل کے بعد ہی درس وتدریس کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔ ایک طالب علم مولانا فضل امام سے پڑھنے کے لئے آیا تھا۔ مولانا نے اس سے کہا کہ تم بھی فضل حق سے پڑھ لیا کرو۔ حسب الحکم وہ آپ کی خدمت میں آیا۔ اس کی عمر زیادہ تھی۔ غریب آدمی تھا۔ صورت کا بھی اچھا نہیں تھا۔ یہ نازک طبع چودہ برس کا سن اس کو تھوڑا سا سبق پڑھایا تاڑ گئے کہ کند ذہن ہے اس کی کتاب پھینک دی۔ اور ڈانٹ کر نکال دیا۔ وہ افسردہ مولانا کے پاس پہنچا اور جو سلوک اس کے ساتھ کیا گیا تھا اس کو بیان کیا۔ فرمایا بلاؤ خبیث کو۔ حاضر ہوئے مولانا نے ایک تھپڑ زور سے مارا اور فرمایا طلبہ کی منزلت نہیں جانتا [illegible] اگر ایسا کیا تو اچھا نہیں ہوگا۔ یہ خاموشی کے ساتھ کھڑے روتے رہے [illegible] ایسے برتاؤ سے گریز کیا۔[۱]

---

[۱] [illegible] ص ۱۲۳۔

علامہ کی والدہ ماجدہ کے انتقال کے وقت اٹھارہ سال کی عمر تھی۔ اکبر شاہ ثانی کا عہد تھا دہلی کے رزیڈنٹ کے محکمے میں سررشتہ دار عدالت دیوانی مقرر ہوئے۔ حکام تنک مزاج تھے علامہ نے استعفیٰ دے دیا۔ نواب فیض محمد خاں والیٔ جھجر کے ہاں پانچ سو روپیہ ماہانہ پر ملازم ہوئے انھوں نے اپنے پاس بلا لیا۔ دہلی سے روانگی کے وقت بہادر شاہ ظفر جب کہ ولی عہد تھے علامہ کو بلوایا اور ایک دوشالہ ان کو عنایت کیا اور جاتے وقت آبدیدہ ہو کر فرمایا۔

"چوں کہ آپ جانے کے لئے تیار ہیں میرے لئے بجز اس کے کوئی چارۂ کار نہیں کہ میں بھی اس کو منظور کر لوں۔ مگر خدا علیم ہے کہ لفظ وداع زبان پر لانا دشوار ہے۔"

ایک عرصہ تک جھجر رہے۔ پھر مہاراجہ الور کے ہاں مدعو ہوئے دو سال سہارن پور میں ایک اعلیٰ عہدہ پر رہے۔ نواب ٹونک کے ملازم بھی ہوئے۔ نواب یوسف علی خاں والیٔ رام پور نے محکمۂ نظامت سپرد کیا اور تلمذ کی عزت حاصل کی۔ آٹھ برس رام پور میں رہے پھر لکھنؤ تشریف لے آئے۔ وہاں صدر الصدور مقرر ہوئے۔ ۱۳ فروری ۱۸۴۷ء کو واجد علی شاہ تخت نشین ہوئے۔ گورنر جنرل نے دوسرے سال ۱۸۴۸ء میں لکھنؤ آکر ایک کچہری حضور تحصیل کے نام سے مقرر کی۔ اس کے مہتمم آپ مقرر ہوئے۔

زمانہ ملازمت میں ایک واقعہ پیش آیا۔ دہلی کے کسی پل پر کسی وجہ سے آمد و رفت ممنوع قرار دی گئی تھی۔ علامہ کے پاس کچھ لوگ آئے اور برات پہنچانے کی اجازت چاہی علامہ نے ... "بازدکومت جانے دو" نگرانی کرنے والوں نے پرچہ دیکھ کر جانے دیا مگر ... نگرانی کرنے والوں نے اجازت نامہ پیش کیا علامہ سے باز پرس ... نے لکھا تھا "ردکومت جلد شود" علامہ نے اپنی دانائی سے برات والوں کا کام بھی کر دیا اور اپنے اوپر الزام بھی نہیں آنے دیا۔

علامہ سے مرزا غالب کے بےتکلفی و گہرے تعلقات تھے۔ یہ دونوں ہم سن تھے۔

۱۷۹۶ء میں پیدا ہوئے تھے ایک جان دو قالب مانے جاتے تھے۔

مرزا غالب کی شعر گوئی کا طرز جداگانہ تھا۔ مرزا مشکل اور مغلق الفاظ استعمال کرتے تھے اور ترکیبیں بھی اس قسم کی استعمال و ایجاد کرتے تھے۔ لوگ معترض ہوتے تھے کہ ایسے اشعار طبیعت کو مکدر کر دیتے ہیں۔ مرزا غالب نے دوسرے اعتراضوں کی پرواہ نہیں کی جب علامہ فضل حق نے سمجھایا کہ یہ اشعار عام لوگوں کی سمجھ میں نہیں آئیں گے تو مرزا پر اثر ہوا۔ اس واقعہ کو مولانا محمد حسین آزاد اپنے الفاظ میں یوں بیان کرتے ہیں[1]

"مولوی فضل حق صاحب فاضل بے عدیل تھے۔ ایک زمانے میں دہلی میں سررشتہ دار تھا اس عہد میں مرزا خاں کوتوال تھے وہ مرزا قتیل کے شاگرد تھے نظم و نثر فارسی اچھی لکھتے تھے۔ بغرض کہ یہ دونوں باکمال مرزا صاحب کے دلی دوست تھے ہمیشہ باہم دوستانہ جلسہ اور شعر و سخن کے چرچے رہتے تھے۔ انھوں نے اکثر غزلوں کو سنا اور دیوان کو دیکھا تو مرزا صاحب کو سمجھایا کہ یہ اشعار عام لوگوں کی سمجھ میں نہ آئیں گے مرزا نے کہا جو کچھ کر چکا اب تدارک کیا ہو سکتا ہے انھوں نے کہا کہ خیر ہوا سو ہوا، انتخاب کرو اور مشکل شعر نکال ڈالو۔ مرزا صاحب نے دیوان حوالے کر دیا۔ دونوں صاحبوں نے وہ دیکھ کر انتخاب کیا۔ وہ یہی دیوان ہے جو آج عینک کی طرح لوگ آنکھوں سے لگائے پھرتے ہیں۔"

چنانچہ مرزا غالب کے کلام میں سے دو ثلث کے قریب نکال دیا گیا اور اس روش پر چلنا بالکل چھوڑ دیا۔[2]

علامہ کی سخن فہمی کا اندازہ اس واقعہ سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ مرزا کے ایک فارسی قصیدے کی تشبیب کا شعر ہے ؎

ہم چناں در تتق غیب ثبوتے دارند ۔۔۔ بوجودے کہ ندارند ز خارج اعیان

---

[1] آب حیات ص ۵۱۲ ۔ [2] یادگارِ غالب ص ۱۰۲۔

مولانا حالی لکھتے ہیں کہ مرزا صاحب خود مجھ سے کہتے تھے کہ ہیں" ثبوتے" کی جگہ "نمودے" لکھا تھا۔ مولوی فضل حق کو جب یہ شعر سنایا تو انھوں نے کہا کہ اعیان ثابتہ کے لئے نمود کا لفظ نامناسب ہے اس کی جگہ ثبوت بنا دو۔ چنانچہ طبع ثانی میں بجائے نمود کے ثبوت بنا دیا ہے۔[۱]

مولانا علوم دینیہ پر اس قدر حاوی و قادر تھے کہ علوم کے بڑے اہم مسائل کا سلجھانا معمولی بات سمجھتے تھے۔ صاحب تذکرہ علماء ہند لکھتے ہیں: "۱۲ھ کو لکھنؤ میں مولانا کی خدمت میں پہنچا آپ حقہ نوشی اور شطرنج کھیلنے کی حالت میں طالب علم کو افق المبین کا سبق دے رہے تھے اور حسن بیانی کے ساتھ اس کے مطالب کو دل نشین کرا رہے تھے۔"

علامہ فضل حق کی قابلیت و ذہانت و ذکاوت کے ان کے ہم عصر معترف تھے۔ سر سید مرحوم آثار الصنادید میں اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہیں۔

"جمیع علوم و فنون میں یکتائے روزگار ہیں اور منطق و حکمت کی تو گویا انھیں فکر عالی نے بنا ڈالی ہے۔ علماء عصر فضلائے دہر کو کیا طاقت ہے کہ اس سرگروہ اہل کمال کے حضور میں بساط مناظرہ آراستہ کر سکیں۔ بارہا دیکھا گیا کہ جو لوگ آپ کو یگانہ فن سمجھتے تھے جب ان کی زبان سے یک حرف سنا دعویٰ کمال کو فراموش کر کے نسبت شاگردی کو اپنا فخر سمجھے با ایں ہمہ کمالات علم ادب میں ایسا علم سرفرازی بلند کیا ہے کہ فصاحت کے واسطے ان کی عبارت شستہ محضر عروج معارج ہے اور بلاغت کے واسطے ان کی طبع رسا دستاویز بلندی مدارج ہے۔"

منشی امیر احمد مینائی انتخاب یادگار میں تحریر فرماتے ہیں۔

"افضل الفضلا، اکمل الکملا، فضائل دستگاہ فواضل پناہ جناب مولانا مولوی فضل حق صاحب فاروقی برد اللہ مضجعہ، فنون حکمیہ میں مرتبہ اجتہاد بڑے ادیب، بڑے منطقی، نہایت ذہین نہایت ذکی، طلیق و ذلیق، انتہا کے صاحب تدقیق و تحقیق... جس شہر میں آپ رونق افروز ہوئے صدہا آدمی بہرہ اندوز ہوئے۔"

---

[۱] یادگار غالب ص ۷۹

ہندوستان پر انگریز کے تسلط سے ہر باشعور ہندوستانی متاثر تھا اور اس کے طوق غلامی کو توڑنا چاہتا تھا چنانچہ انہی حالات کو دیکھ کر شاہ عبد العزیزؒ نے ہندوستان کو دار الحرب قرار دیا تھا۔ شاہ عبد العزیزؒ کے شاگرد مولانا سید احمد بریلوی مولانا اسمٰعیل دہلوی اور مولانا عبد الحیٔ صاحبان نے پہلے اس فتویٰ پر عمل کیا۔ علامہ فضل حق گرچہ ملازمت کر رہے تھے لیکن ہندوستان کے سیاسی حالات سے غافل نہیں تھے ان کا بغور مطالعہ کر رہے تھے جس کا اظہار انھوں نے رسالہ الثورۃ الہندیہ میں کیا ہے۔

" برطانوی نصاریٰ جن کے دل ممالک ہند کے دیہات و شہر پر قبضہ اور اس کے اطراف واکناف و سرحدوں پر تسلط کے بعد عداوت و کینہ سے بھر گئے تھے۔ اور تمام ذی عزت اعیان کو ذلیل و خوار کر کے ان میں سے ایک کو بھی اس قابل نہیں چھوڑا تھا کہ سر نافرمانی کو جنبش دے سکے انھوں نے تمام باشندگان کو کیا امیر کیا غریب چھوٹے بڑے مقیم و مسافر، شہری و دیہاتی سب کو نصرانی بنانے کی اسکیم بنائی ان کا خیال تھا کہ ان کو نہ کوئی مددگار معاون نصیب ہوگا اور نہ انقیاد و اطاعت کے سوا سرتابی کی جرأت ہو سکے گی۔ یہ سب کچھ اس لئے تھا کہ سب لوگ انہی کی طرح ملحد بے دین ہو کر ایک ہی ملت پر جمع ہو جائیں اور کوئی بھی ایک دوسرے سے ممتاز فرقہ نہ رہ سکے انھوں نے اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ مذہبی بنیاد پر حکمرانوں سے باشندوں کا اختلاف تسلط و قبضہ کی راہ میں سنگ گراں ثابت ہوگا اور سلطنت میں انقلاب پیدا کر دے گا اس لئے پوری جانفشانی اور تن دہی کے ساتھ مذہب و ملت کو مٹانے کے لئے طرح طرح کے مکر و حیلہ سے کام لینا شروع کیا انھوں نے بچوں اور ناسمجھوں کی تعلیم اور اپنی زبان و دین کی تلقین کے لئے شہروں اور دیہات میں مدرسے قائم کئے پچھلے زمانے کے علوم و معارف اور مدارس و مکاتب کے مٹانے کی پوری کوشش کی۔ دوسری ترکیب یہ سوچی کہ مختلف طبقوں پر قابو اس طرح حاصل کیا جائے کہ زمین ہند کے غلہ کی پیداوار، کاشتکاروں سے لے کر نقد دام ادا کئے جائیں اور ان غریبوں کو خرید و فروخت کا کوئی حق نہ چھوڑا جائے۔ اس طرح بھاؤ کے گھٹانے بڑھانے اور منڈیوں تک اجناس پہنچانے اور نہ پہنچانے کی خود ہی ذمہ دار بن بیٹھیں اس کا مقصد اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ خدا کی مخلوق مجبور و معذور ہو کر ان کے قدموں پر آ پڑے اور خوراک نہ ملنے پر ان نصاریٰ اور ان کے اعوان و انصار کے حکم کی تعمیل اور ہر مقصد کی تکمیل کرے۔ ان ترکیبوں کے علاوہ

ان کے دل میں اور بھی بہت سے مفاسد چھپے ہوئے تھے مثلاً مسلمانوں کو فتنہ کرانے سے روکنا شریف و پردہ نشین خواتین کا پردہ ختم کرانا ۔نیز دوسرے احکام دین کو مٹانا وغیرہ ۔اپنے مکر کی ابتداء اس طرح کی کہ سب سے پہلے اپنے ہندو مسلم لشکریوں کو ان کے رسوم و اصول سے ہٹانے اور مذہب و عقائد سے گمراہ کرنے کے درپے ہوئے ان کا گمان تھا کہ جب بہادر لشکری اپنے دین کو بدلنے اور احکام نصرانیت بجالانے پر آمادہ ہوجائیں گے تو پھر دوسرے باشندوں کو سزا و عتاب کے ڈر سے خود ہی مجال انکار نہ ہوسکے گی۔ انھوں نے ہندو لشکریوں کو جو تعداد میں بہت زیادہ تھے گائے کی چربی اور مسلمان سپاہیوں کو جو تھوڑی تعداد میں تھے سور کی چربی چکھانے پر زور ڈالا یہ شرمناک روش دیکھ کر دونوں فرقوں میں اضطراب پیدا ہوگیا اور اپنے اپنے مذہب و اعتقاد کی حفاظت کی خاطر اس کی اطاعت و انقیاد سے منہ موڑ لیا ان کے اس اضطراب نے خرمن امن پر چنگاری کا کام کیا گروہ نصاریٰ کا قتل ڈاکہ زنی، ان کے سرداروں اور سپہ سالاروں پر حملہ شروع کر دیا "

ان واقعات و حالات کو دیکھنے کے بعد علامہ فضل حق خاموش ہوکر بیٹھنے والے نہیں تھے ۔ میرٹھ سے دہلی میں محبان وطن ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء کو انگریزوں سے مقابلہ کرنے کے لیے پہنچ گئے تھے ۔بہادر شاہ ظفر ہندوستان کی رہنمائی کر رہے تھے ۔جنگ جاری ہوگئی تھی ۱۶ اگست یا ۱۸ اگست کو الور سے علامہ دہلی پہنچے ۔ بہادر شاہ ظفر کی خدمت میں حاضر ہوئے ۔

بہادر شاہ ظفر کے مقدمہ کا فائل نیشنل آرکائیوز نیو دہلی میں ہے جس میں مولانا فضل حق خیرآبادی کا ذکر ہے فائل نمبر ۱۲۲/۱۲۵ III دہلی نیوز ۱۹ اگست ۱۸۵۷ء میں خبروں کی رپورٹیں شامل ہیں اس میں لکھا ہے کہ مولوی فضل حق ۱۸ اگست ۱۸۵۷ء کو دہلی میں ملازمت کے لئے آئے ۔ تراب علی جاسوس و مخبر ۲۴ اگست ۱۸۵۷ء کی چٹھی کے ذریعہ اطلاع دیتا ہے ۔

"مولوی فضل حق الور سے دہلی میں ایک ہفتہ ہوا آئے ہیں اور شاہی کونسل انتظامی میں انگریزی حکومت کی انتہائی مخالفت کی وجہ سے داخل کئے گئے ہیں ان کا بیٹا سہارنپور کا ناظم مقرر ہوا ہے اور مولوی میاں جان جوان کا بھتیجا ہے پہلے نائب سرشتہ دار گوڑگانوہ تھا ہیں

گوڑ گانوہ کا ناظم مقرر کیا گیا۔"

دہلی کی جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے دوران میں محبان وطن نے جو خط و کتابت کی تھی وہ انگریزوں کے قبضہ میں آگئی تھی یا مخبروں نے اپنے انگریزی آقاؤں کو جو خطوط لکھے تھے۔ ان خطوط کو بہادر شاہ ظفر کے مقدمہ میں پیش کیا گیا تھا ان خطوط میں ایک خط انگریزوں کے مخبر مکند لال کا ہے۔ جو بہادر شاہ ظفر کا سکریٹری بنا ہوا تھا۔ اس نے ۱۸ اگست ۱۸۵۷ء کی انتظامی کونسل کی رپورٹ ان الفاظ کے ساتھ لکھی ہے کہ جب بہادر شاہ ظفر دربار کرنے کے بعد اپنے کمرہ خاص میں تشریف لے گئے تو مولوی فضل حق نواب احمد علی خاں، بدھا صاحب اور مرزا اختر صاحب بہادر نے یہ تحریری احکام دئے تھے۔ وہ مفصلہ ذیل ہیں۔ احکام کی تعداد ۲۷ ہے۔ ان میں سے ضروری اور اہم حکم نقل کئے جاتے ہیں تاکہ معلوم ہو جائے کہ کن کن چیزوں کے لئے حکم دئے گئے تھے۔

راؤ تلارام کے پتہ پر روپیہ بھیجا ہے حسب ہدایت شمشیر الدولہ قلم بند کر لیا۔

بنام بخشش علی حسب ہدایت حسن بخش عرف بیگی لکھا گیا بابت بھرتی پانچ سو پیدل برائے ملا گڑھ۔

لکھنؤ جانے کا پروانہ راہداری بموجب درخواست محمد بخش حسب ہدایت کلیات اللہ بیگ و حسن بخش خاں عرف بیگی تحریر کیا گیا۔

بنام راؤ تلارام: سدھر ولی کی آمدنی پہنچنے کے لئے حسب ہدایت شمشیر الدولہ۔

بنام راؤ تلارام: خزانہ بھیجئے اور معتمد ایجنٹ بھیجا جائے حسب ہدایت شمشیر الدولہ۔

بنام حسن بخش عرف بیگی علی گڑھ کی آمدنی وصول کرنے کے لئے مولوی فضل حق کی موجودگی میں لکھا گیا۔

بنام فیض محمد ا سے ضلع بلند شہر و علی گڑھ کی آمدنی وصول کرنے پر مقرر کیا گیا حسب ہدایت مولوی فضل حق تحریر کیا گیا۔

بنام ولیداد خاں مذکورہ دونوں آدمیوں کی آمدنی وصول کرنے میں مدد دینے کے لئے تحریر کیا گیا۔ مولوی فضل حق۔

بنام مولوی عبدالحق خاں ضلع گوڑ گانوہ کی مالگذاری کی آمدنی وصول کرنے کا انتظام کیا جائے حسب ہدایت مولوی فضل حق لکھا گیا جن کا بھتیجا گوڑ گانوہ جائے گا۔

روزنامچہ عبداللطیف میں ۲۷ ذی الحجہ ۱۹ اگست ۱۸۵۷ء میں مولوی فضل حق کے بارے میں تحریر ہے۔

"جب زمانۂ شور و شر پھیلا مولوی فضل حق خیرآبادی نے عزم کیا اور بارگاہ میں باریابی کے آرزو مند ہوئے نذر اور نثار کے لئے بہت سا روپیہ پیش کیا وہ حصول عہدہ کے خواہش مند تھے جب کامیابی کے اشتیاق نے انھیں بے صبر کر دیا بادشاہ نے فرمایا کہ جب تک تمھاری مراد کی خوشخبری ظہور میں آئے کشتیٔ آرزو ساحل مقصود تک پہنچے صبر کرو۔"

منشی جیون لال مخبر کے روزنامچہ میں بھی مولانا فضل حق خیرآبادی اور ان کے صاحب زادے کا ذکر آیا ہے وہ لکھتا ہے۔

(۱) مولوی فضل حق شریک دربار ہوئے انھوں نے اشرفی نذر میں پیش کی اور صورت حال کے متعلق بادشاہ سے گفتگو کی۔ (۱۶ اگست ۱۸۵۷ء)

(۲) بادشاہ دربار عام میں تشریف فرما ہوئے مرزا الٰہی بخش، مولوی فضل حق، میر سعید علی خاں اور حکیم عبدالحق آداب بجا لائے۔ (۲ ستمبر ۱۸۵۷ء)

(۳) مولوی فضل حق نے اطلاع دی کہ متھرا کی فوج آگرہ چلی گئی ہے اور انگریزوں کو شکست دینے کے بعد شہر پر حملہ کر رہی ہے۔ (۶ ستمبر ۱۸۵۷ء)

(۴) بادشاہ دربار خاص میں رہے حکیم عبدالحق، میر سعید علی خاں، مولوی فضل حق، بدرالدین اور دیگر تمام امراء، رؤساء شریک دربار ہوئے۔ (۷ ستمبر ۱۸۵۷ء)

(۵) عبدالحق خاں (خلف مولوی فضل حق) اور مولوی فیض احمد لگان وصول کرنے کی غرض سے گوڑ گانوہ گئے (۱۹ اگست ۱۸۵۷ء)

یہ تو محب وطن حضرات کے مخبروں جاسوسوں اور دشمنوں کی رپورٹیں اور روزنامچوں میں اپنے

اندازہ میں مولانا فضل حق نے ۱۸۵۷ء کی دہلی کی جنگ آزادی میں جو حصہ لیا تھا اس کے بارے میں رائے ہے۔ قابل اعتماد اور لائق اعتبار ہستی جو مولانا فضل حق کے دوستوں میں شمار کی جاتی تھی۔ وہ منشی ذکاء اللہ صاحب کی ہیں انھوں نے اپنی مشہور تصنیف تاریخ عروج سلطنت انگلشیہ ہند میں مولانا فضل حق خیرآبادی کی خدمات کا ذکر کیا ہے جو انھوں نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں انجام دی تھیں اور ان کی پاداش میں ان کو جلاوطن ہونا پڑا تھا۔

ضلع گوڑگانوہ کے زمینداروں کی طرف سے درخواست آئی کہ سارے ضلع میں بدنظمی ہو رہی ہے کوئی حاکم انتظام کے لئے بادشاہ کی طرف سے بھیجا جائے۔ بادشاہ نے یہ کام مولوی فضل حق کے سپرد کیا مولوی صاحب متبحر عالم مشہور تھے وہ الور سے ترک ملازمت کر کے دہلی میں آئے تھے انھوں نے بادشاہ کے لئے ایک دستورالعمل سلطنت لکھا تھا جس کی دفعہ اول یہ مشہور ہوئی تھی کہ گائے کہیں بادشاہی علمداری میں ذبح نہ ہو جس پر مولویوں نے ان کا خوب مضحکہ اڑایا مگر یہ دستورالعمل کہیں کسی کے ہاتھ نہیں آیا۔ ان کو اس بغاوت کی سبب سے جلاوطنی کی سزا ملی تھی۔ وہ رہا ہوئے مگر جلاوطنی ہی میں روح نے جسم کی قید سے رہائی پائی۔ انھوں نے گوڑگانوہ میں اپنے بیٹے مولوی عبدالحق کو کلکٹر اور آدمیوں کو تحصیلدار مقرر کیا جس کی عمل درآمد نہیں ہوئی۔" (۶۸۷)

یہ بات تو مسلمہ ہے کہ مولانا فضل حق خیرآبادی نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں حصہ لیا چنانچہ خود مولانا نے بھی قصائد فتنۃ الہندیہ میں تسلیم کیا ہے۔

"میں بیٹھنے والوں کو لڑائی میں برابر آگے بڑھاتا رہا اور لڑائی شروع ہو جانے پر خود بیٹھا رہا میں اپنی سستی کی وجہ سے ایسے مواقع پر باز رہا، یہ میں نے بڑا جرم کیا ہے جب نیک بخت حضرات نے مجھے شہادت کے لئے بلایا تو میں حاضر نہ ہوا یا شہادت سے محروم رہا جبکہ سعادت مندوں نے جام شہادت نوش کیا۔ اے آموزگار! میرے قصور کو معاف کر، اور جو کچھ مجھ سے خطا سرزد ہوئی، اس سے درگذر کر، تجھ سے ہی عفو و درگذر کی امید ہے۔"

جب دہلی شہر پر انگریزوں کا مکمل طور پر قبضہ ہو گیا اور کوئی لشکر و شہری باقی نہ رہا۔ غلہ اور

پانی دشمنوں کے استبداد کی وجہ سے ناپید ہوگیا تو مولانا فضل حق پانچ روز تک بھوکے پیاسے مکان میں بند رہے پانچویں روز اسی حالت میں اپنی کتابیں، مال و اسباب چھوڑ کر خدا پر بھروسہ کرکے اہل وعیال کے ساتھ نکل کھڑے ہوئے۔ دریا پار گئے جنگلوں میں سے گذرے اور بھیکن پور ضلع علی گڑھ میں اٹھارہ روز مقیم ہوئے۔ اس کے بعد آپ کے چچا نواب عبدالشکور رئیس بھیکن نے سانگرہ کے گھاٹ سے بدایوں اور بریلی کی طرف اتروایا۔ اس کے بعد مولانا روپوش ہو گئے۔ ان کی مخبری ایسے دو مرتد جھگڑالو اور شریر افراد نے کی جو مولانا سے اس آیت پر مجادلہ کرتے تھے جس کا یہ حکم تھا کہ نصاریٰ کا دوست بھی نصرانی ہے۔ وہ دونوں نصاریٰ کی موقت و محبت پر مصر تھے۔ انھوں نے مرتد ہو کر کفر کو ایمان سے بدل لیا تھا۔[1]

جس وقت ملکہ نے عام امن و معافی کا اعلان کیا اس پر اعتماد کرکے مولانا اپنے گھر چلے آئے اور ان کے روپوش ساتھی بھی منظر عام پر آ گئے لیکن پولس نے صرف مولانا کو گرفتار کیا۔ اور ان کی گرفتاری سیتاپور سے ہوئی اور ۱۸۵۹ء کو لکھنؤ میں مقدمہ چلا۔

عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ مولانا فضل حق پر مقدمہ دہلی کی جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کی شرکت کے سلسلے میں چلا ہوگا لیکن جناب امتیاز علی عرشی لائبریرین رضا لائبریری رامپور نے ایک مضمون مولانا فضل حق خیرآبادی اور ۱۸۵۷ء کا فتویٰ جہاد رسالہ تحریک دہلی ۱۹۵۷ء میں چھپا ہے۔ ایک خط مولانا فضل حق بنام نواب یوسف علی خاں والئ رامپور نقل کیا ہے۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ مولانا پر اس مقدمہ میں دہلی کی جنگ آزادی میں شرکت کا کوئی ذکر یا الزام نہیں ہے بلکہ ان پر یہ الزامات لگائے گئے تھے۔

(۱) نواب خان بہادر خاں نبیرہ حافظ رحمت خاں بہادر نے جب انگریزوں کے خلاف بریلی میں بغاوت کی تو مولانا نے ان کا ساتھ دیا اور اس کی طرف سے نظامت پیلی بھیت کا کام انجام دیا۔

(۲) جب انگریزوں نے بریلی فتح کر لی تو مولانا یہاں سے بھاگ کر اودھ پہنچے اور خان علی خاں

---

[1] الثورۃ الہندیہ

کی طرف سے ریاست محمدی کے ٹھیکہ دار مقرر ہوئے۔

(۳) مولانا نے اس کے بعد ایک باغی لشکر کی کمان اپنے ہاتھ میں لی۔

چنانچہ مولانا نے اس خط میں ان تینوں الزامات کی تردید کی ہے کہ ان واقعات کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں ہے بلکہ یہ کارنامے دراصل میر فضل حق شاہ جہاں پوری کے ہیں۔ میرے ہم نام ہونے کی وجہ سے مخبروں کو غلط فہمی ہوئی ہے جس کی بنا پر انھوں نے اپنی خفیہ رپورٹوں میں یہ بھی اضافہ کر دیا کہ ان کا ایک بھائی مہاراجہ پٹیالہ کا ملازم ہے۔ جو واقعتاً صحیح ہے۔

اس خط کو دیکھنے کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ واقعی انگریزی حکومت اتنی اندھی تھی اور دہلی کے حکام اور خفیہ پولیس کا عملہ اتنا غافل تھا کہ دہلی جو بغاوت کا مرکز بنی ہوئی تھی اس کے مخصوص واہم شخصیتوں اور باغیوں کو جنھوں نے دہلی کی جنگ آزادی میں نمایاں حصہ لیا تھا ان کو نظر انداز کر دے۔ اور جن حکام نے بہادر شاہ ظفر کے مقدمہ کی تیاری و تفتیش کی ہوگی انھیں مولانا فضل حق خیرآبادی کے باغیانہ واقعات کا علم نہیں ہوگا۔ اور کیا دہلی اور لکھنؤ کے حکام نے مل کر مقدمہ کی تفتیش نہ کی ہوگی۔ اس مقدمہ میں دہلی کے باغیانہ واقعات و الزام کا ذکر کیوں نہیں کیا گیا۔ کیا خان بہادر خاں کی شخصیت بہادر شاہ ظفر کے مقابلہ میں اور بریلی و بیلی بھیت وغیرہ وغیرہ کی بغاوت دہلی کی بغاوت سے زیادہ اہم تھی جو مولانا کے مقدمہ میں خان بہادر خاں اور بیلی بھیت وغیرہ کے واقعات کو اہمیت دی اور بہادر شاہ ظفر اور دہلی کے واقعاتِ بغاوت کو فراموش کر دیا۔ جبکہ دشمن کی کوشش یہ ہوتی ہے۔ کہ سخت سے سخت الزامات و شکنجوں میں مخالف کو کسا جائے۔

دوسرا غور طلب مسئلہ یہ ہے کہ میر فضل حق شاہ جہاں پوری نے بیلی بھیت اور محمدی میں جو کچھ کیا تھا وہاں کے حکام و مخبران سے ناواقف تھے اور ان کے متعلق کوئی رپورٹ ان کے پاس نہیں ہوگی۔ نیز کوئی وجہ بھی معلوم نہیں ہوتی کہ بیلی بھیت اور محمدی کے حکام و مخبر میر فضل حق شاہجہاں پوری کے باغیانہ واقعات کو مولانا فضل حق خیرآبادی پر تھوپیں۔ جبکہ ان کے پاس مولانا خیرآبادی کے خلاف دہلی کے باغیانہ واقعات حرکات سکنات کی رپورٹیں موجود تھیں۔

مولانا فضل حق خیرآبادی نے جن دو مجرموں کا ذکر کیاہے اور ان سے جو وجہ مخاصمت بیان کی ہے ان سے واضح ہوتا ہے کہ یہ دونوں مجرم دہلی کے تھے ۔ پہلی بھینٹ اور جھڑپ دہلی میں جب مولانا کا گذر ہی نہیں ہوا تو وہاں کسی سے مجادلہ و مباحثہ ممکن نہیں ہے اور مولانا کے مجرم وہی تھے ، جن سے مولانا کا مجادلہ ہوا تھا۔[۱]

نواب یوسف علی خاں والئ رامپور ان ہر دو حضرات میر فضل حق (شاہجہاں پوری) اور مولانا فضل حق خیرآبادی سے بخوبی واقف تھے اور دہلی کی جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں جو لوگ برطانوی حکومت کے خلاف حصہ لے رہے تھے ان کو بھی خوب اچھی طرح جانتے تھے۔

مولانا فضل حق خیرآبادی نواب رام پور کے استاد تھے انھوں نے ان کو محکمہ نظامت سپرد کر رکھا تھا۔ اور کافی عرصے تک یہ رام پور میں رہے تھے۔

اسی طرح میر فضل حق شاہجہاں پور کے نہیں بلکہ رام پور کے رہنے والے تھے۔ رام پور میں ہی سید احمد علی خاں صاحب کے عہد میں پیدا ہوئے تھے رام پور میں نائب سررشتہ دار محکمہ صدر رہ چکے تھے نواب یوسف علی خاں ان کی بے حد تعظیم و تکریم کرتے تھے۔ جب میر صاحب فیروز شاہ کے شریک ہوگئے تھے تو نواب یوسف علی خاں نے ان کو ہر چند چاہا کہ رام پور چلے آئیں انھوں نے جواب کہلا کے بھیجا اب تو تمنائے شہادت ہے چنانچہ یہ جھانسی میں شہید ہوئے[۲] گویا نواب یوسف علی خاں میر صاحب کی سیاسی سرگرمیوں سے بھی واقف تھے۔

جبکہ نواب رام پور ان دونوں بزرگوں کی بے پناہ عزت کرتے تھے اس کی سیاسی سرگرمیوں سے بھی ناواقف نہیں تھے اور ان کی حکومت برطانیہ کے حکمرانوں میں کافی رسائی تھی اگر مولانا فضل حق پر یہ بے بنیاد الزامات لگائے جاتے تو ان کے علم میں یہ بات ضرور آتی اور ان کو انگریزی حکمرانوں سے مولانا کی صفائی دینے کا سنہری موقع ملتا جس میں وہ کامیاب بھی ہو جاتے۔ لیکن یہ حقیقت نہیں ہے کہ مولانا پر مذکورہ بے بنیاد الزامات لگائے گئے تھے جس کی بنیاد صرف یہ خط ہے، جو

---

[۱] الثورۃ الہندیہ۔ [۲] تذکرہ کاملان رام پور۔ ص ۳۲۰۔

انتہائی مشتبہ، غیر مستند اور ناقابلِ اعتبار ہے اس کو مولانا سے منسوب کرنا صحیح نہیں ہے۔

مولانا فضل حق پر بہادر شاہ ظفر کا ساتھ دینا، اور انگریزوں کے خلاف دہلی کی جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں شریک ہونا وغیرہ اور کچھ مخبروں کے من گھڑت الزامات عائد کئے گئے تھے۔ جس کی بنا پر مولانا صاحب جلاوطن ہوئے۔ چنانچہ منشی ذکاء اللہ صاحب نے بھی اس بات کی مذکورہ عبارت میں تصدیق کی ہے کہ "وہ ان کو اس بغاوت کی سبب جلاوطنی کی سزا ملی تھی"۔

مولانا پر جب مقدمہ چلایا گیا تو اس کی باقاعدہ پیروی کی گئی مقدمہ کے خاص پیروکار منشی کرم احمد خیرآبادی تھے اور مولانا کے صاحبزادے مولوی عبدالحق نے بھی مقدمہ کی پیروی کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا کر نہیں رکھا تھا ان کی ہی درخواست پر مولوی نبی بخش، مولوی قادر بخش اور مولوی سید فضل حسین مولانا کی صفائی دینے کے لئے لکھنؤ آئے تھے چنانچہ ان حضرات کا ذکر اور مقدمہ سے رہائی کی امید کا اظہار منشی کرم احمد خیرآبادی نے سید اعظم علی کے ایک خط میں کیا ہے۔[۵۱]

مقدمہ کی شنوائی کے لئے جو حضرت مقرر کئے گئے تھے وہ انگریز تھے ان سے بھلائی و رہائی کی امید کرنا بے معنی تھی چنانچہ مولانا فضل حق خیرآبادی نے اس مجسٹریٹ و جج کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کیا۔[۵۲]

"میرا معاملہ ایسے ظالم حاکم کے سپرد کر دیا جو مظلوم پر رحم کرنا ہی نہ جانتا تھا۔ اس ظالم حاکم نے میری جلاوطنی اور عمر قید کا فیصلہ صادر کر دیا اور میری کتابیں جائداد، مال و متاع اور اہل و عیال کے رہنے کا مکان غرض ہر چیز پر غاصبانہ قبضہ کر لیا"۔

اس فیصلے کے بعد مولانا کو جزیرہ انڈمان روانہ کر دیا اور مولوی عبدالحق اور مولوی شمس الحق نے خواجہ غلام غوث میر منشی لفٹننٹ گورنر مغربی و شمالی کی اعانت سے اس مقدمہ کے خلاف اپیل کی جو بے نتیجہ ثابت ہوئی، ماتحت عدالت کا فیصلہ ہی بحال رہا۔ مصیبت میں دوست و آشنا عزیز و اقارب بھی کترانے لگتے ہیں چنانچہ مرزا غالب نے اپنے ایک خط میں مرزا یوسف کو اپیل کی نامنظوری کی اطلاع تو دی ہے لیکن بچتے بچاتے، ان کا نام نہیں لکھا صرف لفظ مولانا پر اکتفا کیا ہے۔[۵۳]

مولانا کا حال کچھ تم سے مجھ کو معلوم ہوا کچھ تم مجھ سے معلوم کرو مرافعہ میں حکم عدالت حبس بحال رہا بلکہ

---

۵۱ ملاحظہ ہو الثورۃ الہندیہ ص ۷۱، ۵۲ اردوئے معلی ص ۳۳۴۔

تاکید ہوئی ہے کہ جلد دریائے شور کی طرف روانہ کرو۔ چنانچہ تم کو معلوم ہو جائے گا ان کا بیٹا ولایت میں کیا چاہتا ہے کیا ہوتا ہے سو ہونا تھا ہو لیا انا للہ و انا الیہ راجعون۔"

مولانا فضل حق کی دوستی اس قدر مضبوط و گہری تھی کہ ان کی یاد مرزا غالب کے دل سے نہیں جاتی تھی۔ جب مرزا غالب کو معلوم ہوا کہ میاں داد خاں سیاح کلکتہ میں ہے تو ان سے مولانا فضل حق کے بارے میں ایک خط کے ذریعہ دریافت کرتے ہیں۔

"ہاں خاں صاحب آپ جو کلکتہ پہنچے ہوا اور سب صاحبوں سے ملے تو مولوی فضل حق کا حال اچھی طرح دریافت کر کے مجھ کو لکھو کہ اس نے رہائی کیوں نہ پائی اور وہاں جزیرہ میں اس کا کیا حال ہے گزارا کس طرح ہوتا ہے۔"

مولانا فضل حق پر ہندوستان کی جیلوں اور کالے پانی میں کیا گذری، کیا کیا مصائب برداشت کئے انگریزی حکام نے کس طرح دل کھول کر ان سے بدلہ لیا، یہ دردناک داستان مولانا کی زبانی سنئے جو انھوں نے قصائد فتنۃ الہند میں تحریر فرمایا ہے۔

"جب میں قیدی بن کر ان کا اطاعت گزار نہ بنا تو ان کی طرف سے رنج و تکلیف میں اور بھی زیادتی کر دی گئی انھوں نے مجھ پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا میرے رات دن سخت گرمی میں اور اندھیری میں گذرتے ہیں گویا کہ سخت موسم گرما کے دن اور آخر ماہ کی اندھیری راتیں ہیں رات تو دوامی شکل اختیار کر چکی ہے جس کی صبح نہیں ہے اور نہ دن کے لئے شام اور رات ہی ہے مجھے جب تصرفات سے روک کر ایک کوٹھری میں بند کر دیا جس میں زہریلی ہوا کے سوا اور کسی قسم کی ہوا نہ پہنچ سکتی تھی کیسی مصیبت تھی، اس کی کوٹھری کی دیواریں انسانی اعضاء کو بھونتی تھیں اور اس کی مٹی تپتی ہوئی زمین تھی۔ کیسا پریشان کن قید خانہ تھا، نہ تو اس کے میدان میں پیشاب خانہ تھا نہ اس کے پاخانہ میں آب دست خانہ تھا۔ انھوں نے سختی کے ساتھ، دوستوں، بھائیوں، اور بیٹوں کو مجھ سے ملنے سے روک دیا میرے کپڑے چھین کر مجھے تہبند اور کملی پہننے کے لئے دے دی گئی، کپڑے اتار کر قیدیوں کی کملی پہنا دی میرے پاس اس خراب کملی کے سوا کوئی دوسری چادر نہ رہی، میرے برتن، اور جوتے بھی ظلماً چھین لئے میرے

استعمال کے لئے کوئی برتن اور پیالہ بھی باقی نہ چھوڑا..... ظلم وستم کے لئے میری قید ہی کافی نہ سمجھی گئی بلکہ جلاوطنی اور غربت، مسافرت کی سزا بھی دی۔ قید کر کے مجھے رات میں ایسے پہاڑ پر لے گئے جہاں پہنچ کر قیدی ہلاک ہو چکے ہیں۔ اس پہاڑ کی گھاٹیوں کو دریا گھیرے ہوئے ہیں موت کے سوا اس کا کوئی صحن نہیں یہاں کی آب و ہوا ناموافق اور آنے والے کے لئے وبال ہے۔ دبائیں ہر طرف عام ہیں۔ یہاں شریف ذلیل وگریہ کناں ہیں، دوا ناپید اور بیماریاں بے شمار ہیں اس کی گھاٹیوں میں عفونت و ہلاکت عام ہے اس میں دم دار دھی بیماری میں اضافہ کرتی ہے اس میں نہ تو پیاسے کے حلق سے پانی اترتا ہے اور نہ بھوکے کو غذا اچھی معلوم ہوتی ہے۔ ماش کی دال غذا ہے، گوشت و پیاز، ترکاری، لگڑی کچھ میسر نہیں وہ دریا کا کنارہ ہے جہاں میدان گیہوں اور شیرینی کسی چیز کا پتہ نہیں قیدیوں کے گروہ کے گروہ مر چکے ہو بچے ہوئے ہیں وہ نہ مردوں میں نہ زندوں میں، میت کی نماز جنازہ، قبر، کفن اور پوشش کا یہاں کوئی سوال نہیں وہ ایسی خراب جگہ ہے جہاں طاقت ور انسان پر بھی رہنے کے بعد زرد بتوں کا غلبہ ہو جاتا ہے قیدیوں کو ایسی مشقت میں مبتلا کیا گیا کہ ان کی ایذا ہلاکت کے درجہ تک پہنچ گئی۔ بلاؤں اور سختیوں نے انھیں ہلاک کیا چوکی دار ومصیبتوں نے رنج میں مبتلا کر دیا۔ انھوں نے مجھے ایسے مہلکہ میں ڈال دیا جہاں ان میں زمین ہے نہ آسمان، آسمان ہے اس کا قریبی آسمان وہ بادل ہے جن کی بارش غموں کا سیلاب ہے اور اس کی زمین سنگریزے ہیں اس میں بارش نہیں ہوتی گرمی کی شدت سے فضا آسمانی سے بخارات کا پسینہ گرنے لگتا ہے۔ بادلوں نے آسمان کو ڈھانپ رکھا ہے جس کی وجہ سے دن میں سورج اور رات کو چاند نظر نہیں آتا۔ رات میں اندھیرے پر اندھیرا چھایا رہتا ہے اور دن اندھیری رات کی طرح ہے اس کے سیاہ افق پر کسی نے چاند نکلتا نہیں دیکھا اور نہ گرگٹ ہی سورج دیکھ سکا وہ خود تاریک ہے اور تاریک دریا سے گھرا ہوا ہے اس دریا میں نہ موتی ہے نہ روشنی یہاں نہ گرمی ہے نہ جاڑا..... مجھے ظلماً اہل و وطن سے اچانک دور کر دیا گیا میری کمزور وضعیف ذریت کو بھی نہ چھوڑا ان کو زبردستی ان کے مکان سے نکالا گیا۔ ان کے لئے آرام و سکون کی کوئی جگہ نہیں چھوڑی وہ مسکین و فقیر بن گئے کیوں کہ مکان روزی اور کوئی چیز بھی ان کے

لئے نہیں رہتی میں نے انھیں حالت گرسنگی میں چھوڑا نہ ان کے پاس مال و دولت ہے نہ مسکن و منفعت
ان کے اپنے، بیگانے بن کر علیحدہ ہوگئے اور برابر والوں نے ظلم و ستم اختیار کیا۔ میرے خاندان اور اولاد
کو قید و بند نے دور کر دیا اب یہاں پانی کے سوا کوئی دوست نہیں ہے۔ میرے بیٹوں سے میری خبریں
ایسی پوشیدہ ہیں جیسی ان کی مجھ سے ۔ مجھے وحشیوں میں بسا دیا گیا ہے۔ اس قید خانہ (جزیرے)
میں دو قسم کے وحشیوں اور اجنبیوں کے سوا کچھ نہیں۔ اس کی آب و ہوا ناموافق اور وبائی ہے
میری مصیبت میں میرے بدن کے عارضوں قولنج، فتق (فوطوں میں پانی اترنا) اور قوبا (داد) نے
اضافہ کر دیا ہے " (۴۳۶ تا ۴۴۵)

مولانا فضل حق ان مصیبتوں میں مبتلا تھے جیل کا سپرنٹنڈنٹ ایک شریف و علم نواز انگریز تھا جو مولانا کی قابلیت و لیاقت سے واقف نہیں تھا۔ اسی زمانہ میں اس کی منشی میں ایک قیدی مولوی صاحب تھے، اس نے ایک فارسی کی کتاب جو ہیئت پر تھی ان کو اس کی عبارت کی صحت و درستگی کے لئے دی مولوی صاحب کی یہ بس کی بات نہیں تھی خود اصلاح نہ کر سکے، مولانا سے عبارت درست کرائی مولانا نے عبارت کی درستگی کے ساتھ حاشیہ پر اور بہت سے مسائل کا اضافہ کر دیا اور کتابوں کے حوالے بھی لکھ دئے جب یہ کتاب سپرنٹنڈنٹ نے دیکھی تو بہت خوش ہوا داد و تحسین دی مولوی صاحب نے حقیقت بیان کی تو مولانا سے ملنے کا اشتیاق پیدا ہوا۔ مولوی صاحب اس کو مولانا کی بارک میں لے گئے، مولانا وہاں تشریف فرما نہیں تھے۔ سپرنٹنڈنٹ نے انتظار کیا تھوڑی دیر کے بعد کیا دیکھتا ہے کہ آپ بغل میں ٹوکرا دبائے چلے آرہے ہیں اس حالت کو دیکھ کر آبدیدہ ہوا معذرت چاہی اور آپ کو کلرکی میں لے لیا۔ اور گورنمنٹ سے سفارش بھی کی ادھر مولانا کے صاحب زادے مولوی شمس الحق اور خواجہ غلام غوث بے خبر رہا کرانے کی سعی میں تھے۔ پروانہ رہائی حاصل کر کے مولوی شمس الحق انڈمان پہنچے۔ جہاز سے اترے تو معلوم ہوا کہ مولانا کل، ۱۲ صفر ۱۲۷۸ھ مطابق ۱۸۶۱ء کو فوت ہو چکے ہیں۔

ہندوستان اور یونسکو

انجمنِ اقوام متحدہ کا تعلیمی سائنسی اور تہذیبی ادارہ جس کا انگریزی میں مختصر نام یونسکو ہے، ۱۹۴۶ء میں قائم ہوا۔ ہندوستان اس کا ایک اساسی رکن ہے۔ اور اس کی متنوع بین الاقوامی سرگرمیوں میں برابر تعاون کرتا رہا ہے۔ اس ادارے کے ساتھ اشتراکِ عمل کو فروغ دینے کی غرض سے ۱۹۴۹ء میں حکومت نے ایک عارضی کمیشن مقرر کیا جسے ۱۹۵۱ء میں مستقل حیثیت دے دی گئی۔ مرکزی وزیرِ تعلیم اس کمیشن کے صدر ہیں۔ دو سال ہوئے کہ کمیشن کی چوتھی کانفرنس میں غیر سرکاری قومی جماعتوں کے تعاون پر زور دیا گیا تھا۔ کمیشن کی پانچویں کانفرنس ۲۶ ستمبر ۱۹۶۲ء کو دہلی میں منعقد ہوئی اور تین روز تک جاری رہی۔ اس موقع پر مرکزی وزیرِ تعلیم نے اپنے خطبۂ صدارت میں فرمایا کہ اب اس کمیشن کی تنظیم میں خاطر خواہ وسعت پیدا کر دی گئی ہے اور یونسکو کے روز افزوں مشاغل کے پیشِ نظر اس کے پانچ ذیلی کمیشن بھی بنا دئے گئے ہیں جو یونسکو کے پانچ اہم میدانِ عمل یعنی 'تعلیم' 'طبیعی علوم' ' سماجی علوم' 'علم و ادب بشمول تہذیبی مشاغل' اور خبر رسانی کے عام روابط' سے متعلق معاملات میں تعاون کریں گے۔

'یونسکو' کا نصب العین نوعِ انسانی کو امن و آشتی کی ضرورت سے آگاہ کرنا اور اشتراکِ عمل کے ذریعے سے بین الاقوامی مفاہمت پیدا کرنا ہے۔ غالباً اس بات سے عموماً لوگ واقف نہیں ہیں کہ یہ ادارہ افریقہ اور ایشیا کے اُن ممالک میں تعلیمی توسیع و ترقی کے کاموں میں کس قدر دستگیری کر رہا ہے جو اپنی پچھڑی ہوئی حالت کو چھوڑ کر آگے بڑھ رہے ہیں۔ ہندوستان، یونسکو کے چند اہم خصوصی منصوبوں میں بھی شریک ہے۔ جنوبی ایشیا میں صنعتی ترقی کے سماجی اثرات کی تحقیق کرنے کی غرض سے ایک علاقائی مرکز ۱۹۵۶ء میں کلکتہ میں قائم کیا گیا تھا۔ اب اس مرکز کے مقاصد میں سماجی اور معاشی ترقی کو بھی شامل کر لیا گیا ہے اور اب وہ دہلی منتقل ہو گیا ہے۔ ۱۹۵۷ء میں بنجر زمینوں

کے بارے میں سائنسی تحقیق کا ایک منصوبہ تیار ہوا۔ اس وقت سے ہندوستان اس منصوبے میں برابر پرجوش عملی تعاون کر رہا ہے۔ اس سلسلے میں بنجر زمینوں سے متعلق ایک مرکزی تحقیقی ادارہ جودھپور میں قائم کیا جا چکا ہے۔ مشرق و مغرب کی تہذیبی روایات کی باہمی قدر شناسی کے بڑے منصوبے میں بھی ہندوستان نے نمایاں طور پر شرکت کی ہے۔ بین الاقوامی مفاہمت اور تعاون کی اسپرٹ کو ابھارنے کے لئے 'یونسکو' کے زیر اہتمام مختلف ممالک میں چند منتخب مدارس اور ٹریننگ کالج کئی سال سے 'پروجیکٹ' چلا رہے ہیں۔ اس وقت ہندوستان کے نو ثانوی مدارس اور تیرہ ٹریننگ کالج اس میں شرکت کر رہے ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ طلبہ کے دلوں سے تہذیبی مغائرت نکلے اور ان میں کشادگی قلب و نظر پیدا ہو سکے۔

۱۹۶۱ء میں ٹیگور کی صد سالہ سال گرہ کی عالمی تقریبات اور 'رام کرشنا مشن انسٹی ٹیوٹ' کی مشرق و مغرب کی تہذیبی کانفرنس' میں 'یونسکو' کا پُرخلوص تعاون بھی اس بات کا ثبوت ہے کہ 'یونسکو' کے نزدیک بین الاقوامی مفاہمت اور تہذیبی لین دین کی کتنی اہمیت ہے۔ دہلی میں ایک علاقائی مرکز جنوبی ایشیا میں طبعی علوم کے معاملات میں تعاون کی راہیں استوار کرنے کی غرض سے ۱۹۴۸ء میں قائم ہو چکا ہے اسی ادارے کی طرف سے بحرِ ہند کی بین الاقوامی مہم کی تنظیم کی گئی ہے۔ یہ بحرِ اعظم طولِ ارض کا ساتواں حصہ اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے اور دنیا کی ایک چوتھائی آبادی اس کے اردگرد بستی ہے۔ وہ حیوانی اور نباتاتی دنیا کے عجائبات کا مخزن ہے۔ اس مہم کے کامیاب ہونے کی صورت میں اس بحرِ اعظم سے ملحق سب ہی دیسوں کو بڑے فوائد حاصل ہوں گے اس مہم کے تحت جو کچھ کام کوچین میں ہو رہا ہے، اس میں 'یونسکو' کی پوری اعانت و عنایت ہمارے ساتھ ہے۔ علاوہ ازیں مدراس میں چمڑے کی تحقیق کے قومی انسٹی ٹیوٹ، بنگلور میں سائنس انسٹی ٹیوٹ، احمد آباد میں کپڑے کی تحقیقی ایسوسی ایشن اور کھڑگ پور، بمبئی کی انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی کو بھی 'یونسکو' مختلف عنوانات سے امداد بہم پہنچا رہا ہے۔

۱۹۶۰ء کے آغاز پر پندرہ ایشیائی ممالک نے 'یونسکو' کی سرگردگی میں بیس سالہ کراچی

منصوبے' کا آغاز کیا۔ یہ ممالک افغانستان سے لے کر فلپائن تک پھیلے ہوئے ہیں جن کی مجموعی آبادی کے بارے میں اندازہ لگایا گیا ہے کہ ۱۹۸۰ء تک گیارہ ہزار آٹھ سو پچاس' لاکھ ہو جائے گی اور اس منصوبے کے تحت توقع کی جاتی ہے کہ ۱۹۸۰ء تک سات سال کی مفت اور لازمی تعلیم دو ہزار تین سو ستر لاکھ بچوں کو دی جا سکے گی۔ اس وقت بہ مشکل چھ سو لاکھ بچے چار پانچ سال کی ابتدائی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ 'کراچی منصوبے' نے ایشیا میں تعلیمی ترقی کے ایک نئے باب کا آغاز کیا ہے۔ اس سلسلے میں 'یونسکو' نے چار علاقائی مرکز قائم کئے ہیں۔ ان میں سے ایک دہلی میں قائم کیا گیا ہے۔ اس مرکز میں ابتدائی تعلیم کے اعلیٰ ماہرین تربیت پائیں گے تاکہ وہ اپنے اپنے ممالک میں تعلیمی رہنمائی کے فرائض بخوبی انجام دے سکیں۔ کام کا اندازہ لگانے کی غرض سے ایک 'یونسکو سیموزیم' اس سال کے آغاز پر دہلی میں منعقد کیا گیا تھا اور جون کے مہینے میں 'کراچی منصوبے' کے معاملات و مسائل کا جائزہ لینے کے لئے متعلقہ ممالک کے وزراء تعلیم کی ایک میٹنگ ٹوکیو میں ہوئی تھی۔ اس موقع پر یہ احساس کچھ اور قوی ہو گیا کہ تعلیم نہ صرف ایک شہری کا بنیادی حق ہے بلکہ اس کے ذریعے معاشی حالت بھی سدھرتی ہے۔ اور یہ بات تسلیم کی گئی کہ سماجی اور معاشی ترقی کے ایک جزو کی حیثیت سے تعلیم کی ایک مبسوط اسکیم تیار کی جائے جس میں ۱۹۸۰ء تک تعلیمی اخراجات کو بڑھا کر قومی میزانیہ کا پانچ فیصدی کر دیا جائے۔ اس اضافہ کی اہمیت کا اندازہ اس طور پر لگایا جا سکتا ہے کہ ہندوستان جو کہ 'کراچی منصوبے' میں شریک ہونے والے ممالک میں ایک نہایت ہی ترقی یافتہ ملک ہے، اس وقت اپنے قومی میزانیہ کا تقریباً دو فیصدی سے کچھ زائد تعلیم پر صرف کر رہا ہے اور ابتدائی تعلیم پر کل تعلیمی اخراجات کا پینتیس فیصدی صرف ہوتا ہے۔ اب اگر تدریجی ترقی کے ساتھ ۱۹۷۵ء تک ابتدائی تعلیم کے اخراجات کل تعلیمی اخراجات کے آدھے کر دیئے گئے جو کہ قومی میزانیہ کا صرف دو فیصدی ہوں گے تو گیارہ سال تک کے تمام بچے مفت اور لازمی تعلیم حاصل کر سکیں گے۔ اس وقت روس میں قومی میزانیہ کا تقریباً سات فیصدی تعلیم پر صرف ہوتا ہے اور یہ دنیا کا سب سے اعلیٰ معیار ہے۔ اپنے مختلف مشاغل اور مقاصد کی تکمیل کے سلسلے میں 'یونسکو' کی طرف سے ہمیں پچھلے سال تک چھتر لاکھ ڈالر سے بھی کچھ زائد رقم مل چکی ہے۔ ثانوی تعلیم کی منزل پر اس وقت 'نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف ایجوکیشن' اور اس سے

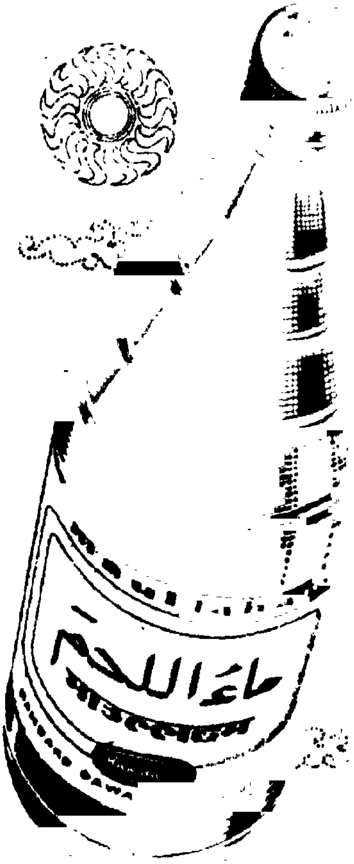
متعلق چار علاقائی کالجوں میں سائنس کی تدریس کے طریقوں کو بہتر بنانے کے لئے 'یونسکو' نے مدد دینے کا فیصلہ کیا ہے اسی طرح اعلیٰ تعلیم میں تحقیقی کام کے لئے بھی ہمیں 'یونسکو' سے مدد ملے گی۔ امید کی جاتی ہے کہ ۱۹۶۳ء سے لے کر ۶۹ء تک کے عرصے میں یونسکو کے ذریعے دی گئی مالی امداد غالباً بیس لاکھ ڈالر تک پہنچ جائے گی۔

اس مرتبہ یونسکو کے قائم مقام ڈائرکٹر جنرل رین ماہیو بھی 'انڈین نیشنل کمیشن' کی کانفرنس میں شریک تھے جنھوں نے اپنے خطبے میں ہندوستان کے تعاون کو بہت سراہا۔ کانفرنس کے آخری روز تعلیم اور روایتی اقدار کے موضوع پر ایک دلچسپ 'سمپوزیم' منعقد ہوا جس کا افتتاح ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نائب صدر جمہوریہ ہند نے فرمایا۔ اس میں بارہ مختلف ماہرین تعلیم اور عالموں نے اپنے اپنے مقالات مباحثے کے لئے پیش کئے جن میں یونسکو کے قائم مقام ڈائرکٹر جنرل اور ہمارے شیخ الجامعہ پروفیسر محمد مجیب صاحب کے مقالات بھی شامل ہیں۔

ہمارے اس دورِ ترقی میں جبکہ فکرِ انسانی نے فضا سے لے کر خلا تک سب کچھ تسخیر کر لیا ہے اور اس کی راہ میں نہ 'قعرِ دریا' حائل رہا ہے۔ اور نہ 'پہنائیِ فلک' سفینۂ حیات ایک ایسی منزل پر آلگا ہے کہ انسان خود اپنی 'عظمت کا کفن' سیتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ ان حالات میں صرف 'یونسکو' جیسے ادارے ہی شعاعِ امید سے انسانی دل و دماغ کو منور کر سکتے ہیں۔ اس معاملے میں ہماری ذمہ داری دوسروں سے کچھ زائد ہی ہے کیونکہ ہماری سرزمین پر کرشن کی بنسی بجی ہے، یہاں پر گوتم نے دھیان گیان کیا ہے یہاں چشتی نے 'پیغامِ حق' سنایا ہے اور نانک نے 'وحدت کا راگ' گایا ہے۔ یہاں گاندھی نے اہنسا اور پریم کا پرچار اپنے خونِ جگر سے کیا ہے۔ ہمیشہ سے یہاں کے بھگتوں کے گیت میں شکتی اور شانتی کے نغمے گونجتے رہے ہیں اور ہمیشہ یہی پیغام ملا ہے کہ دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے، لہٰذا ہمیں پورے خلوصِ نیت کے ساتھ ایسے نظام کے لئے جد و جہد کرنا ہے جو محبت و مروت اور اشتراک و اتحاد پر قائم ہو۔ ہمیں یہ اعتماد رکھنا چاہیئے کہ فضائے عالم میں گلہائے اخوت و یگانگت کی مہک جلد پھیلے گی اور یہ بات یقینی ہے کہ اس عظیم و برتر کام میں 'یونسکو' کا ایک نمایاں مقام ہوگا۔

نمودِ صبح کاذب ہی دلیلِ صبح صادق ہے ۔۔۔ افق سے زندگی کی دیکھ وہ ابھری کرن ساقی

"معلم"



طابع و ناشر عبداللطیف اعظمی — مطبوعہ زین پریس دہلی — ٹائٹل: دیال پریس دہلی

جامعہ

سالانہ چندہ
چھ روپے

قیمت فی پرچہ
پچاس نئے پیسے

جلد ۴۷ | بابت ماہ دسمبر ۱۹۶۲ء | شمارہ ۶

فہرست مضامین

خط و کتابت کا پتہ

رسالہ جامعہ، جامعہ نگر، نئی دہلی

بہادر شاہ ظفر

از ڈاکٹر ذاکر حسین ــــ ترجمہ: ڈاکٹر سید عابد حسین

آج سے پورے سو سال پہلے، نومبر کو بہادر شاہ ظفر اپنی پیاری دلّی اور اپنے محبوب لال قلعہ سے دور رنگون میں بے کسی اور تنہائی کے عالم میں دنیا سے رخصت ہوگئے۔ اپنی زندگی کے آخری دنوں میں جب وہ زمانے کے نشیب و فراز اور زندگی کی دھوپ چھاؤں پر غور کرتے ہوں گے تو انھیں اپنے ذی ہوش اور منچلے بزرگوں کے کارنامے یاد آتے ہوں گے جنھوں نے ہندوستان میں ایک ایسی وسیع سلطنت تعمیر کی جو ہندوکش سے کاویری تک پھیلی ہوئی تھی، جس کی بے شمار دولت، بے مثل صنعت و حرفت اور بے نظیر خوشنما اور شاندار عمارتوں کی سارے سنسار میں دھوم تھی، جس کے علوم و فنون، شاعری اور موسیقی کا دیش بدیش چرچا تھا۔ اس سلطنت کے نظم و نسق کی عمارت گاؤں پنچایت کے پرانے خود اختیاری نظام پر قائم تھی اور منزل بہ منزل سرکار، ضلع، صوبے اور مرکزی حکومت تک جس کا فرماں روا شہنشاہ تھا، اٹھتی چلی گئی تھی۔ اس کے حکمرانوں نے دانش مندی سے کام لے کر اپنی ساری رعایا کی حمایت حاصل کر لی تھی، اور وہ ہندو مسلمان دونوں کو اپنے قصر حکومت کے ستون سمجھتے تھے۔ وہ ہندوستانی علم و حکمت اور فنون لطیفہ کے قدردان اور سرپرست تھے اور ان کے زمانے میں دیسی بھاشاؤں، برج بھاشا، اودھی اور بنگلہ نے بہت فروغ پایا اور سور، تلسی، بہاری اور کاشی رام کے لافانی کلام سے ہندوستانی ادب کو مالا مال کر دیا۔

بہت سے نیک اور پرہیزگار بزرگوں نے جن میں بعض شہنشاہ بھی شامل تھے اس بات کی کوشش کی کہ مختلف مذہبی عقیدوں میں ہم آہنگی پیدا کر کے ایک مشترک زندگی

کی بنیادیں رکھیں۔ وہ صلح کل کے مسلک کو اپنا کر ایک ایسی راہ نکالنا چاہتے تھے جس پر سبھی سالک دوش بدوش چل سکیں اور سعادت کی ابدی منزل تک پہنچ سکیں۔

پھر بہادر شاہ ظفر یہ سوچتے ہوں گے کہ خدا کے بھید خدا ہی جانتا ہے اور تقدیر کا لکھا اٹل ہوتا ہے۔ ہندوستان میں آپس کے جھگڑے اٹھ کھڑے ہوئے، بھائی بھائی سے لڑنے لگا، ایک ذات دوسری ذات کی، ایک مت دوسری مت کی خون کی پیاسی ہو گئی اور ہزاروں میل دور سات سمندر پار سے ایک بدیسی قوم آئی، اور آپس کی پھوٹ سے فائدہ اٹھا کر ہندوستان کی مالک بن بیٹھی۔

اس ناٹک کے آخری سین میں خود بہادر شاہ محض تماشائی نہیں بلکہ خود ایکٹر کی حیثیت سے بہت اہم حصہ لے رہے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ سلطنت آنے والی بلا کو ٹالنے کا موقع کھو چکی تھی۔ مگر اس کی دو سو سال کی شان و شوکت کی گہری چھاپ ہندوستانی قوم کے دلوں پر موجود تھی۔ اٹھارھویں صدی میں مغل شہنشاہ کی سیاسی طاقت برائے نام رہ گئی تھی، پھر بھی اس کے نام کا اور اس خاندان کی روایات کا جادو اب تک کام کرتا تھا۔ پرانے راجپوت راجا اب بھی دہلی کے دربار سے خطاب اور خلعت پاتے تھے، مرہٹہ پیشوا اور ان کے سردار اب بھی اس کی عنایات سے سرفراز ہوتے تھے، خود مختار صوبہ دار اب تک اپنی غصب کی ہوئی حکومت پر جواز کا پردہ ڈالنے کے لئے سندیں حاصل کرتے تھے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کا گورنر جنرل اب بھی اپنے آپ کو شہنشاہ کا فدوی کہتا تھا۔ نئے بادشاہ کی تخت نشینی سے اب بھی سنہ جلوس شروع ہوتا تھا۔

بہادر شاہ ظفر اکتوبر ۱۷۷۵ء میں پیدا ہوئے اور ۱۸۳۷ء میں تخت سلطنت پر بیٹھے۔ ان کی قلمرو لال قلعہ کی دیواروں تک محدود تھی۔ سلطنت کی بس ایک پرچھائیں رہ گئی تھی اور دربار کی حیثیت جھگڑالو، بیکار، شہزادوں، مرشد زادوں، درباریوں اور چوبداروں کی ایک بھیڑ سے زیادہ نہ تھی۔ اس اداس گھٹتے ہوئے ماحول میں بہادر شاہ اپنے جاہ و منصب کے وقار کو قائم رکھنے اور اپنے بزرگوں کی تہذیبی روایات کو نبھانے کی اپنی سی کوشش کرتے تھے۔

اس قلعے میں اب بھی اہلِ سخن اور اہلِ قلم کا جمگھٹ رہا کرتا تھا۔ دہلی والوں کے محبوب میلوں اور تیوہاروں کو پہلے کی طرح اب بھی دربار کی سرپرستی حاصل تھی۔ بادشاہ کے جلوس کو دیکھ کر اب بھی لوگوں کو سلطنت کی عظمتِ رفتہ یاد آجاتی تھی۔ اور اس کے دم قدم سے شہر کے آس پاس باغوں اور سبزہ گاہوں کی رونق کو چار چاند لگ جاتے تھے۔ خزانے میں روپے پیسے کا توڑا تھا۔ پھر بھی خانقاہوں اور دھرم شالوں، غریبوں اور محتاجوں کے لئے تھیلیوں کے منہ کھلے ہوئے تھے۔

بہادر شاہ ظفرؔ علم دوست اور شاعر تھے اور ان کے وقت کا بڑا حصہ ادبی مشاغل میں گزرتا تھا۔ وہ کئی زبانوں پر قدرت رکھتے تھے اور فارسی، اردو، ہندی اور پنجابی میں شعر کہتے تھے۔ ان کے اردو و ہندی کلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ فن کی باریکیوں کو سمجھتے تھے، ستھرا اور پاکیزہ مذاق رکھتے تھے اور محاورے اور روزمرہ کے استاد تھے۔

بہ ظاہر ان کی پرسکون زندگی کا بندھا ہوا ڈھرا بدلنے کی کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی مگر ہندوستانی زندگی کی خاموش اور ساکن زندگی کی سطح کے نیچے بے چینی اور شورش کا ایک طوفان چھپا ہوا تھا۔ ان حکمراں خاندانوں کے سینوں میں جو اپنے تاج و تخت سے محروم کر دیئے گئے تھے، انتقام کی آگ بھڑک رہی تھی۔ عام لوگوں کو یہ شکایت تھی کہ حکومت کی پالیسی جبر و تشدد پر مبنی ہے انصاف مہنگا ہے، عدالت کی کارروائیوں میں بہت دیر لگتی ہے اور بڑی ذلت اٹھانی پڑتی ہے وہ اپنے دین دھرم، ذات پات کو بدیسی حکمرانوں کے ہاتھوں خطرے میں پاتے تھے۔ اور ان کی خود پسندی اور غرور سے بیزار تھے۔ یہ مادہ جو اندر ہی اندر پک رہا تھا ۱۸۵۷ء کی زبردست شورش کی شکل میں پھوٹ نکلا۔

اس مہیب اور خطرناک مہم کی رہنمائی کے لئے لوگوں نے ہندوستان کی عظمتِ رفتہ کے نشان سلطنت کے نام و نگین کے وارث، اکبر اور شاہجہاں کے جانشین بہادر شاہ کو چنا۔ زبانِ خلق سے ایسی دعوت بہت کم لوگوں کو ملتی ہے اور جنھیں ملتی ہے ان میں بھی بہت کم ہیں جو سود و زیاں کے اندیشے سے بے نیاز ہو کر اس پر لبیک کہتے ہیں۔ مگر بہادر شاہ نے اس ذمہ داری کو قبول کیا

اور بھی شاہانہ شان سے بنھایا۔ وہ محاصرۂ دہلی کے یادگار زمانے میں جنگ آزادی کے روح رواں بن گئے۔ لڑنے والی فوج کی ہمت بڑھائی، اس کے لئے مالی وسائل فراہم کئے اور ان پُر آشوب دنوں میں شہری امن قائم رکھا۔

اس آزمائش کے موقع پر ان کے دل میں بس ایک ہی لگن تھی کہ جس کام کا بیڑا اٹھایا ہے اسے پورا کرنے میں کوئی کوشش اور کوئی تدبیر نہ اٹھا رکھیں۔ چنانچہ جب انھوں نے دیکھا کہ شہزادوں کی نااہلی اور خود پسندی سے کامیابی خطرے میں پڑ گئی ہے تو فوج کی کمان ایک قابل اور آزمودہ کار سپہ سالار جنرل بخت خاں کے ہاتھ میں دے دی۔ فوجی اور ملکی امور کے انجام دینے کے لئے ایک انتظامی کونسل قائم کی، جو ہو بہو ایسٹ انڈیا کمپنی کے گورنر جنرل کی کونسل کا نمونہ تھی۔

مگر ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے ہندو مسلمانوں میں پھوٹ ڈالنے والوں کی ناپاک کوششوں کو چلنے نہیں دیا۔ وہ ساری عمر اپنی خاندانی روایات کے مطابق ہندوؤں کے تہوار رکشا بندھن، بسنت، ہولی، دیوالی اس طرح مناتے آئے تھے جیسے یہ ان کے اپنے تہوار ہوں۔ ان کا قول تھا: اگر مسلمان مجھے ایک آنکھ کی طرح عزیز ہیں تو ہندو بھی دوسری آنکھ کی طرح پیارے ہیں۔" چنانچہ انھوں نے محاصرے کے زمانے میں اپنے ہندو سپاہیوں کے جذبات کا احترام کرتے ہوئے گاؤکشی کی ممانعت کر دی اور یہ فرمان جاری کیا کہ جو لوگ فرقہ وارانہ کشیدگی پیدا کریں گے انھیں سخت سے سخت سزا دی جائے گی۔

ان کی یہ بے نفسی بھی یادگار رہے گی کہ انھوں نے اعلان کر دیا کہ ہندوستان کی آزادی کے بعد وہ اپنے لئے کوئی منصب نہیں چاہتے اور تحریک آزادی کے کارکنوں پر چھوڑ دیں گے کہ ملک کے مستقبل کے بارے میں جو فیصلہ چاہیں کریں۔

بہادر شاہ نے ملک کی آزادی کے لئے اپنا سب کچھ داؤں پر لگا دیا، اور وہ ہار گئے، ہاں وہ ہار گئے، مگر اس لڑائی کا جو آزادی کو حاصل کرنے کے لئے اور اس لڑائی کا جو آزادی کو قائم رکھنے کے لئے لڑی جاتی ہے، انجام ہمیشہ ایک ہی ہوتا ہے۔ اور وہ فتح ہے آزادی کے علمبردار

کی۔ بیشک بہادر شاہ ہار گئے، مگر جو تحریک انھوں نے شروع کی تھی وہ دھیرے دھیرے بڑھتی گئی، پھیلتی گئی۔ یہاں تک کہ نوے سال بعد کامیاب ہو کر رہی۔ آزادی کی جدوجہد جب شروع ہوتی ہے تو نفع نقصان کا کھاتہ نہیں کھولا جاتا۔ آزادی وہ قدرِ اعلیٰ ہے جو ہر قیمت پرستی ہے، اس لئے کہ اس کے بغیر زندگی میں اخلاقی ذمہ داری نہیں رہتی، بلکہ سچ پوچھئے تو زندگی زندگی نہیں رہتی، آزادی کے بغیر زندہ رہنا موت سے بدتر ہے۔ آج ہمارا بڑا کڑا مقابلہ ہے اس ہمسائے سے جس کے ساتھ امن وعافیت سے رہنے اور دوستی کے نبھانے میں ہم نے کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ مگر ہم اس آزادی کی جسے ہم نے اپنا خون پسینہ ایک کر کے حاصل کیا ہے، حفاظت کرنا بھی جانتے ہیں۔ ہماری قوم کا یہ عزم کہ ہم مرتے مر جائیں گے مگر آزادی کا سودا نہیں کریں گے ہماری کامیابی کی کافی ضمانت ہے، لڑائی کتنی ہی کڑی کتنی ہی کٹھن کیوں نہ ہو ہم فتح کی منزل پر پہنچ کر دم لیں گے۔ ہاں بہادر شاہ ہار گئے کہ ہماری جیت کے لئے راہ کو ہموار کر دیں ہاں، وہ ہار گئے۔ ان کے بیٹوں کو بے دردی سے ان کی آنکھوں کے سامنے گولی مار دی گئی، ان کو ذلیل کیا گیا اور ایک برطانوی عدالت کے سامنے، جس کو قانون کی رو سے ان پر کوئی اختیار نہ تھا، ان کے خلاف مقدمہ چلایا گیا۔ انھیں جلاوطنی کی سزا سنائی گئی اور قید کر کے رنگون بھیج دیا گیا، جہاں وہ اپنے گھر بار سے دور، بہت دور تھے، جہاں ان کا کوئی عزیز، کوئی دوست ان کی خدمت اور دلجوئی کے لئے نہ تھا۔ ان کی زندگی کے یہ آخری دن رنج ومصیبت کے دن تھے، مگر ان کی زبان پر کبھی حرف شکایت نہیں آیا اور وہ اس آزمائش سے صبر ووقار کے ساتھ گزرے۔ ان کا یہ راضی بہ رضا رہنا ان کی روحانی رفعت کی دلیل ہے، ان کے اہل وطن انھیں شکر گذاری کے جذبے کے ساتھ یاد رکھیں گے کہ انھوں نے ہندوستان کی آزادی کے لئے بڑی ہمت کی اور بہت دکھ اٹھائے۔ مجھے امید ہے کہ سارے ہندوستان میں ان کی صد سالہ برسی ان کے شایان شان اس آہنی عزم کے ساتھ منائی جائے گی کہ ہم سب کندھے سے کندھا جوڑ کر حملہ آور قوت کا مقابلہ کریں گے اور اس آزادی کی حفاظت کے لئے جو ہم نے بہت کٹھنائیاں اٹھا کر حاصل کی ہے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیں گے۔ جے ہند

(انگریزی سے ترجمہ)

بہ شکریہ آل انڈیا ریڈیو۔ دہلی

غزل

بہادر شاہ ظفر مرحوم

کہاں خلقت عزیز دزیرِ چرخ پیر پھرتی ہے
یہ فانوسِ خیالی میں ہر اک تصویر پھرتی ہے
نہ چرخِ آسیا ہوں، نے بھنور ہوں، نے بگولا ہوں
مجھے تو کیوں لئے اے گردشِ تقدیر پھرتی ہے
ہوا ہے جوشِ گل سے جوشِ وحشت اس قدر پیدا
کہ ہر موجِ ہوا لیتے ہوئے زنجیر پھرتی ہے
نہیں آتا ہی زیرِ چرخ خواب اے غافلو کیوں کر
کہ شب کو کہکشاں کھینچے ہوئے شمشیر پھرتی ہے
اترتے ہیں گلے میں گھونٹ آبِ زندگانی کے
چھری جب حلق پر قاتل دمِ تکبیر پھرتی ہے
ظفر کو منزلِ مقصود پر تقدیر لے پہنچی
کدھر بھٹکی ہوئی یہ عقلِ بے تدبیر پھرتی ہے

قومی دفاع اور ہماری ذمّہ داریاں

از: پروفیسر محمد مجیب   ترجمہ: عبداللطیف اعظمی

ہم نے اپنی قومی تاریخ کا ایک نیا ورق الٹا ہے، ہماری شمالی سرحدوں پر حملہ کیا گیا ہے، اور ساری قوم حملہ آور کا مقابلہ اور اس کو پسپا کرنے کے لئے متحد ہو کر اٹھ کھڑی ہوئی ہے۔ اس حملے سے ہمیں صدمہ پہنچا ہے۔ لیکن اس صدمہ سے زیادہ شدید اس بات کا صدمہ ہے کہ ہماری دوستی کے ساتھ بے وفائی کی گئی ہے اور ہمارے جذبۂ خیر سگالی کو بیروں سے کچلا گیا ہے۔ اس لئے اپنی حکومت کا ہاتھ بٹانے کے لئے اپنی فوج کے حوصلے کو بڑھانے کے لئے اور اپنے وطنِ عزیز کی مدافعت میں سب کچھ نچھاور کرنے کے لئے ہم سب ایک ہو گئے ہیں۔ اس لڑائی نے ہم سب کو ایک جسم اور ایک دماغ کی طرح کام کرنے پر آمادہ کر دیا ہے۔

ہم نے نہ صرف اپنے لئے بلکہ دنیا کی تمام قوموں کے لئے امن کی خواہش اور کوشش کی تھی اور اس خواہش اور کوشش کی بنا پر یہ سمجھنا کہ امن قائم رہے گا کوئی غلطی نہیں تھی، اب بھی ہم کو یہی سمجھنا چاہیئے کیونکہ امن کی خواہش اور پرامن طریقوں کی حمایت اور وکالت ایسی قیمتی اور اعلیٰ قدر ہے جسے محض ایک ملک کی غداری کی وجہ سے چھوڑا نہیں جا سکتا۔ چینی حملہ درحقیقت ہمارے لئے ایک امتحان اور ایک چیلنج ہے اور اس کا بہترین جواب یہ ہے کہ ہم یہ ثابت کردیں کہ ہم میں اتنی طاقت ہے کہ اپنی امن کی خواہش کو اور زیادہ موثر بنا سکتے ہیں۔

ہم اپنی طاقت کو کس طرح بڑھا سکتے ہیں؟ یقیناً اس سوال کے بہت سے جوابات ہو سکتے ہیں اور یہ سب مل کر قوم کا متفقہ جواب ہو سکتے ہیں۔ میں صرف وہ عرض کروں گا۔ جو میں نے تعلیمی تجربوں سے سیکھا اور سمجھا ہے کہ یہی میرا میدان عمل رہا ہے۔

میرا خیال ہے کہ ہم نے یہ فرض کر لیا ہے کہ ہماری تعمیر و ترقی کی راہ میں امن و سکون کے سوا اور کچھ نہیں، یہی ہماری تقدیر ہے اور ہماری پہلی اور آخری منزل۔ باوجود اس کے کہ ہم نے منصوبے بنائے اور ان کو کامیاب بنانے کے لئے مدت مقرر کی، مگر حالات کے شدید تقاضوں کے مطابق آگے نہیں بڑھے۔ دوسرے الفاظ میں ہم یہ

محسوس نہ کرسکے کہ ہمارے سامنے ایک دشمن کا چیلنج ہے، یعنی ہم زندگی اور بقا کی خاطر لڑ رہے ہیں لیکن اب ایک دشمن سامنے کھڑا ہے اور دانشمندی اور احتیاط کا تقاضا ہے کہ اسے نہ صرف بیرونی بلکہ اندرونی خطروں کی بھی علامت سمجھیں ضرورت ہے کہ اب ہم اپنے ساتھ سختی برتیں۔ ہم بیکار بحثوں میں پڑے رہے۔ ہماری بحثوں کی کوئی انتہا نہیں ہے، حقیقت تو یہ ہے کہ ہم پر یہ الزام لگایا جاسکتا ہے کہ ہم کسی نتیجہ پر پہنچنے کے لئے نہیں بلکہ بحث کی خاطر بحث کرتے رہے اور اگر ہم کسی نتیجہ پر پہنچے بھی تو ہم نے پورے طور پر اپنی یہ ذمہ داری نہیں محسوس کی کہ اس پر عمل بھی کریں۔ ہم نے اپنی قوت فکر کا بھی بیجا استعمال کیا ہے۔ ہم میں سے ہر شخص کی یہ خواہش رہتی ہے کہ جو کچھ کسی اور نے سوچا ہے اس میں اپنی فکر پیمائی کا ایک چھوٹا سا جزو ضرور شامل کردے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان معمولی خیالات کا ایک انبار لگ جاتا ہے اور ان کو ایک دوسرے سے الگ کرنا یا سلجھانا ناممکن ہوجاتا ہے۔ ہم نے دنیا کی سب سے قیمتی چیز وقت کو بھی پوری فیاضی کے ساتھ ضائع کیا ہے، کیونکہ یا تو ہم بہت پیچھے دیکھتے ہیں، اپنی تہذیب کے آغاز سے بھی پیچھے، یا بہت آگے دیکھتے ہیں، تصور سے بھی پرے۔ اب ہمیں اپنے تصورات اور خیالات میں توازن پیدا کرنا اور ناقابل انکار حقائق کا سامنا کرنا چاہئیے۔

بے نتیجہ بحثوں کا نام جمہوریت نہیں ہے، اگر جمہوریت کے اصول کا تقاضا ہے کہ ہر ایک کو آزادئ تقریر حاصل ہو، تو اس پر کامیابی کے ساتھ عمل کرنے کے لئے ایسی وفاداری کی ضرورت ہے، جس میں کسی خارجی تحریک کو دخل نہ ہو اور اس میں شعور و دانشمندی ہو۔ ایسی صورت میں ہم حاکموں اور آقاؤں کی اطاعت نہیں کریں گے بلکہ خود اپنی کریں گے۔ ہمیں خاموش رہنے کے لئے حکم دینے کی ضرورت پیش نہ آئے، خود ہم کو خاموش رہنا چاہیئے، تاکہ ہم اپنے غور و فکر اور بحث و نظر میں کسی نتیجہ پر پہنچ سکیں، اپنے اوپر پابندیاں عائد کرکے ہم اپنے کو آزادی کا زیادہ مستحق بنائیں گے۔ ہماری شخصیت تقریروں کی کثرت کے مقابلے میں فکر انگیز خاموشی میں زیادہ بہتر طور پر نشو و نما پاسکے گی اور ترقی کرے گی اور ہم فیصلوں کی دیانتداری کے ساتھ تعمیل کرکے اس کے مقابلے میں کہیں زیادہ سیکھ سکیں گے کہ ان فیصلوں کی حکمت و دانائی کی مسلسل جانچ پڑتال کرتے رہیں۔

اس وقت بہت سی باتیں ہیں جن پر غور و فکر کی ضرورت ہے۔ چین جس کی دشمنی سے آج ہم دوچار ہیں، ایک طویل تاریخ کا حامل ہے، یہ تاریخ علاقائی توسیع کی تاریخ رہی ہے، جس نے بعض اوقات سیاسی سامراج کی شکل اختیار کرلی ہے، صبر و تحمل اور محنت و مشقت کی تاریخ بھی ہے، دیوار چین، عظیم الشان نہر اور ایسے ہی دوسرے کارنامے اس کے شاہد ہیں۔ یہ اب ایسے لوگوں کی بھی تاریخ ہے، جو چھوٹی چھوٹی

جماعتوں کی شکل میں دنیا کے مختلف حصوں میں پھیل سکتے ہیں اور اپنے آپ کو مستحکم کر کے ایک آزاد معیشت کی مضبوط بنیاد بن سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر ملایا اور انڈونیشیا کے چینیوں کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ چینیوں کو جب کسی ایک شعبۂ زندگی میں ناکامی ہوئی ہے تو انھوں نے کسی اور شعبۂ زندگی میں قدم جما لئے ہیں۔ اس لئے جب میں کہتا ہوں کہ غور و فکر کی ضرورت ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمیں صرف اسی کی فکر نہیں کرنی چاہیئے کہ چینی فوجوں نے ہماری شمالی سرحدوں پر حملہ کیا ہے، ہمیں اس امکان پر بھی غور کرنا چاہیئے کہ چینی ہمارے قومی محاذ میں مختلف شکلوں میں داخل ہو سکتے ہیں، ہمیں ہر قسم کے خطروں کے لئے تیار رہنا چاہیئے، ہمیں اپنے اپنے مذاق اور طبعی میلان کے مطابق ان فوجی، سیاسی اور معاشی تدبیروں کا مطالعہ کرتے رہنا چاہیئے۔ جو چینی اختیار کر سکتے ہیں۔ یہ لڑائی جو آج شروع ہوئی ہے غالباً جلد ختم نہیں ہوگی اور اگر جلد ختم ہو جائے تو بھی ہمیں یہ ضرور یاد رکھنا چاہیئے کہ دیرپا امن صرف ہماری پیش بینی اور طاقت کی بنا پر ممکن ہے۔

میرا خیال ہے کہ ہم یہ سمجھتے تھے کہ امن و امان برقرار رہے گا، اس لئے ہم نے شخصی اہلیت کے معیاروں کی طرف کوئی توجہ نہیں کی ہے ہم اپنے آپ کو جانچنے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ امتحانوں اور ڈگریوں کی قدر و قیمت ہمارے نزدیک زیادہ ہے اور حقیقی علم کی بہت کم۔ یونیورسٹیوں کے قاعدے ضابطے صورت حال کو نہیں بدل سکتے، یہ اسی وقت ممکن ہے جب نوجوانوں میں جو پڑھ رہے ہیں اور اساتذہ میں جو ان کی رہنمائی کر رہے ہیں، یہ جذبہ پیدا ہو جائے کہ وہ اپنی اہلیت کو بڑھائیں گے اور تعلیم کو زیادہ سے زیادہ مفید بنائیں گے، بجائے اس کے کہ کم سے کم پڑھیں اور کم سے کم پڑھائیں خود اپنے سے ہمارا یہ مطالبہ ہونا چاہیئے کہ زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کریں گے اور زندگی کے ہر شعبہ میں اپنے کو اہل بنائیں گے۔

اہلیت ایسی چیز نہیں ہے، جسے امن کے زمانے میں غیر ضروری سمجھا جائے، بلکہ میں نے اکثر اس کا خدشے کے ساتھ ذکر کیا ہے، کیوں کہ اسے "تعلیمی وعظ" کی حیثیت دی جا سکتی ہے، اس وقت میں اسے ایک فوری ضرورت سمجھتا ہوں جسے قومی مفاد کے پیش نظر یہ ہر قیمت پورا ہونا چاہیئے۔ اس وقت ضرورت ہے کہ نوجوان اپنی جسمانی صحت کو بہتر بنائیں۔ کیونکہ ملک کو فوجی خدمات کے لئے ان کی کسی وقت ضرورت پڑ سکتی ہے، ان کی معلومات زیادہ سے زیادہ وسیع اور صحیح ہونی چاہئیں، انھیں لڑائی کی حکمت عملی اور اس کے مختلف داؤ پیچ، فوجی تنظیم اور رسل و رسائل کی ضروری باتیں بھی معلوم ہونی چاہئیں، انھیں سفر کرنے پر پابندیاں عائد کرنے کی ضرورت کو سمجھنا چاہیئے اور یہ کہ خام اشیاء اور تیار شدہ مال کی مدافعت

کے لئے کیا اہمیت ہے، انھیں یہ بھی معلوم ہونا چاہیئے کہ اس زمانے میں ذخیرہ اندوزی اور چور بازاری کو روکنا ضروری ہے، انھیں اس پر بھی نگاہ رکھنی چاہیئے کہ ان کے آس پاس کے بازاروں میں حکومت کے احکامات کی خلاف ورزی تو نہیں کی جارہی ہے اور غیر سماجی عناصر ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش تو نہیں کر رہے ہیں۔ انھیں این سی سی کے ماتحت چھوٹے ہتھیار کا استعمال سیکھنا چاہیئے یا اس کے لئے رائیفل کلب قائم کرنے چاہئیں، تاکہ وہ اس قابل ہوں کہ اپنے محلوں کو غنڈوں اور شرپسند عناصر سے محفوظ رکھ سکیں۔ مختصر یہ کہ بظاہر چاہے وہ سویلین معلوم ہوں، مگر ذہنی لحاظ سے فوجی ہوں اور ان کی پوری زندگی فوجی ضابطوں کی پابند ہو۔ انھیں یہ سب کچھ کرنا اور سیکھنا چاہیئے، مگر ساتھ ہی ساتھ ان کی تعلیم حسبِ معمول جاری رہنی چاہیئے اور یہ مقصد پیش نظر رہنا چاہیئے کہ انھیں اپنے مخصوص رجحانات کے مطابق اپنے علم اور اپنی قابلیت میں اضافہ کرنا ہے۔

اساتذہ اور طلباء اگر ٹائم ٹیبل کی سختی سے پابندی کریں اور یہ محسوس کریں کہ انھیں ہر لمحہ سے زیادہ سے زیادہ حاصل کرنا ہے، تو اس سے یہ فائدہ ہوگا کہ دوسروں کو بھی اسی طرح تنظیم اور پابندی کے ساتھ کام کرنے کی ترغیب ہوگی۔ کم سے کم مہمل باتیں ہوں گی، کم سے کم بے توجہی اور تاخیر ہوگی، کم سے کم پبلک مقامات گندے ہوں گے، پبلک کی آسائش اور سہولت کے لئے حکومت جو چیزیں مہیا کرتی ہے ان کا کم سے کم غلط استعمال ہوگا، ریلوں اور بسوں وغیرہ کے کام میں کم سے کم خرابی اور رکاوٹ ہوگی ـــ اسی طرح شکست خوردگی اور خرابی کی مختلف شکلوں کو بے توجہی کے ساتھ قبول کر لینے کے بجائے ہمارے نوجوان پرفضت اور بہترین کارکردگی اور ادائیگی فرض کی مثال پیش کریں گے ـــــــ دوسرے ملکوں کے معاشرے میں اس قسم کی اہلیت پیدا کرنے میں پوری کامیابی ہوئی ہے، وہاں یہ کامیابی مقابلے کے ذریعہ حاصل کی گئی ہے، لیکن ہمیں یہ شبہ رہا ہے کہ ایسی اہلیت قابل قدر ہو سکتی ہے، جو صرف مقابلے کے ذریعہ یا اس نظریے کے ماتحت کہ صرف اسی کو زندہ رہنے کا حق حاصل ہے، جو سب سے بہتر ہے حاصل کی جائے۔ مہاتما گاندھی اور ہمارے وزیر اعظم ایسے معاشرے کے قائل ہیں، جس کی بنیاد ایک دوسرے کے تعاون پر قائم ہو، یعنی ایک ایسی سوسائٹی جس میں اہلیت کو شعوری طور پر سماجی مقاصد کے لئے استعمال کرنا چاہیئے۔ مجھے اس سے بہتر کوئی سماجی سطح نظر معلوم نہیں ہے، لیکن بدقسمتی سے بجائے اس کے کہ ہم اس سوسائٹی کے مقاصد کو عملی جامہ پہنانے کے لئے اپنے فرائض ادا کریں، ایسی سوسائٹی کے فوائد کے بارے میں سوالات کرتے رہتے ہیں۔

چینی حملہ آوروں کے بارے میں جب ہم سوچیں، تو ان تمام باتوں پر غور کریں۔ ہم صرف علاقے اور مجروح وقار کی خاطر نہیں لڑ رہے ہیں، بلکہ زندگی کے ایک آئیڈیل کے لئے بھی لڑ رہے ہیں، جس کے لئے بڑی سے بڑی قربانی بھی کم ہے۔

(انگریزی سے ترجمہ)

بہ شکریہ آل انڈیا ریڈیو، دہلی

ہندوستانی تاریخ میں فرقہ وارانہ زہر

شری چندر گپت ودیالنکار

(شری چندر گپت ودیالنکار ہندی کے مانے ہوئے ادیب ہیں اور تاریخ ان کا مخصوص مضمون ہے۔ پیش نظر مضمون جامعہ رورل انسٹی ٹیوٹ کے ایک استاد جناب شیام سروپ شرما صاحب نے ہندی کی ایک کتاب سے ترجمہ کیا ہے، جسے ہندی دکشن بھارت پرچار سبھا مدراس نے شائع کیا ہے)

تاریخ کی تعلیم ہر قوم کی زندگی کا ایک ضروری حصہ ہے۔ کیونکہ اپنی تاریخ کی یادگار ہی قوم کا احساس خودی ہے۔ اپنے بزرگوں کو اپنا سمجھ کر یاد کرنا اور ان کے زندگی کے حالات اور کارناموں کے مطالعے میں دل کا لگنا قومی بیداری کا تقریباً ساٹھ فیصدی یہی تو ہے "न हि तृप्यामि पूर्वेषां शृण्वानश्चरितं महत्" (بزرگوں کی زندگی کی عظیم کہانی سنتا ہوا میں نہیں تھکتا) مہابھارت کے مصنف نے جنمے جیہ کے منہ سے یہ الفاظ کہلوائے ہیں۔ لیکن ان میں زندہ اقوام کے ہر بچے کے دل کی صحیح تصویر کھینچی ہے۔ یہ کوئی غرور نہیں نہ ہی کوئی خود فریبی ہے۔ یہ صحت مند انسانی ذہن کی بالکل قدرتی پیداوار ہے۔ کیوں کہ جیسا کہ سرید و ناتھ سرکار نے کہا ہے کہ "ہم اپنے تاریخی ماضی کے زندہ پیغمبر ہیں۔ وہ ماضی ہمارے خون اور ہماری ہڈیوں میں، ہمارے خیالات اور ہمارے یقین میں گھل مل گیا ہے۔" اس کے لئے کشش محسوس نہ کرنا ہی بیماری کی علامت ہے۔ وہ قومی انسان کی زندگی میں بالکل ویسی ہی بیماری ہے جیسے کسی غم سے پاگل انسان کا اپنی زندگی سے بیزار رہنا۔

آج دنیا کی بہت سی اقوام میں اپنے بزرگوں کے حالات زندگی کی طرف کشش کا مطلب

ہو گیا ہے اپنے پڑوسی ملک کے بزرگوں کے حالاتِ زندگی سے نفرت۔ تاریخ اس طرح لکھی جاتی ہے۔ اور اس طرح اس کی تعلیم دی جاتی ہے کہ جہاں لوگوں کے دل میں اپنی قوم کے لئے بے انتہا محبت پیدا ہو وہاں پڑوسی کے لیے انتہائی نفرت بھی بھڑک اٹھے۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخ کی تعلیم ایک بین الاقوامی مسئلہ بن گئی ہے۔

لیکن ہمارے بھارت کا مسئلہ بالکل دوسرا ہے۔ یہاں انگریز سامراجی مصنفوں نے وقت کو بھی فرقے وار بانٹنے کی کوشش کی ہے اور ان کے اندھے پیروؤں نے اس تقسیم کو ایک ہمیشہ ہمیشہ سے چلی آ رہی صداقت اور اصلیت مان رکھا ہے۔ صرف اتنا ہی نہیں، جس شکل میں ہمارے بچوں کو تاریخ کی تعلیم دی جاتی ہے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہندو آج بھی محمود کی بُت شکنی کو یا اورنگ زیب کی کم اندیشی کو معاف نہیں کرنا چاہتا اور مسلمان آج بھی پرتاپ یا شواجی کے "غدر" کو دل سے بھولنے کو تیار نہیں ہوتا۔ ہندو کو ہندو زمانہ اور تاریخ ہی اپنی محسوس ہوتی ہے اور مسلمان کو قدیم ہندوستان کا نام بھی زبان پر لانا پسند نہیں۔ اس کو شام، فلسطین اور افریقہ میں اسلامی تاریخ کا راستہ ہی زیادہ پرکشش محسوس ہوتا ہے۔ اپنے بزرگوں کی یادگار کا بھی ہم اسی طرح بٹوارہ کرنا چاہتے ہیں جس طرح جھگڑالو بھائیوں نے وراثت میں ملی نوکرانی کا کیا تھا۔

اس ذہنی حالت کا نتیجہ یہ ہے کہ ۵-۶ برس کی عمر سے ہی ہمارے بچوں کی تعلیم کے راستے الگ الگ ہو جاتے ہیں اور اسی وقت سے ان کے دلوں میں ایک دوسرے سے نفرت کے بیج بوئے جانے شروع ہو جاتے ہیں۔ اس طرح یہ فرقہ وارانہ زہر ہماری قومیت کے درخت کو جڑ تک مارے جا رہا ہے۔

فرقہ وارانہ رنگ میں تاریخ کی جو تصویر کھینچی گئی ہے وہ اصل میں جھوٹ اور فریب پر مبنی ہے اور ایک ایسا دھوکا ہے جس کا کوئی جواب نہیں۔ ہماری سستی اور لاپرواہی نے سامراجیوں کو وہ موقع عطا کر دیا ہے جس کو فرقہ واریت کے رنگ کی گرد اڑا کر وہ لوگ ہم کو گمراہ کئے ہوئے ہیں اور اس رنگ کا نشہ اتنا رنگین بن گیا ہے کہ ہم میں سے بہت سے لوگوں کا اب

اس کو ترک کرنے کو دل نہیں چاہتا۔ دوسری طرف سستی اور لاپرواہی کی تھپکیاں ہم کو میٹھی نیند سلائے ہوئے ہیں اور بنے ہوئے راستے کو توڑ کر نیا راستہ بنانے کی محنت ہمیں مشکل معلوم ہوتی ہے۔ کڑوی سچائی کو سننا اور اپنے پرانے پلے ہوئے خیالات کو چھوڑ دینا دل کو اچھا نہیں لگتا۔ ہمارے زمانے کے عظیم رہنما نے سیاست کو بھی صداقت کے راستے پر چلانا چاہا ہے۔ لیکن سچائی کے راستے پر ہمیشہ گلاب نہیں بچھے رہتے۔ عدم تشدد کا دوسرا نام رواداری ہے۔ سچائی کی روشنی اور رواداری کا پانی ہے کہ اگر ہم اپنی تاریخ کے راستے کو صاف کرنے کا ارادہ کر سکیں تو فرقہ وارانہ زہر کی دھول بہت جلد بیٹھ جائے۔

محمود غزنوی ہماری تاریخ کا ایک ایسا کردار ہے جس کی یاد آج بھی بھڑکانے والی سمجھی جاتی ہے۔ اس کی زندگی کا مقصد ہندو حکمرانوں کو لوٹنا اور ہندو عبادت گاہوں کو توڑنا بتایا گیا ہے۔ محمود افغانستان کے لئے جو کہ ہندوستان کا صوبہ تھا ایک غیر ملکی تھا۔ غیر ملکی حملہ آور کی شکل میں اس نے افغانستان، پنجاب اور سندھ کو فتح کیا۔ سیاسی نقشے پر جب ہم اس کے کارناموں کے نشان لگاتے ہیں تو وہ صرف لٹیرا ہی نہیں ثابت ہوتا۔ اس کے حملوں میں ایک صاف منصوبہ اور ترتیب ہے اور وہ اپنی حکومت کو ایک سلسلے میں بڑھاتا ہوا اس کو ایک سامراج کی شکل دیتا ہوا ملتا ہے۔ کلمے کے سنسکرت ترجمے والے اس کے سکّے ملے ہیں جن کو رائے بہادر کاشی ناتھ دکشت روشنی میں لائے ہیں۔ ان پر لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ کا ترجمہ کیا گیا ہے۔

अव्यक्तमेकं मुहम्मद अवतार صاف ظاہر ہے کہ اسلام کے اللہ اور ویدانت کے برہم کا ایک ہونا پہچان لیا گیا تھا اور رسول اور اَوتار کا خیال بھی ایک سا ہے یہ سمجھ لیا گیا تھا۔ کیا یہ ہندو مذہب اور اسلام کے میل کی، اسلام کے ہندوستانی بننے کی شروعات نہیں ہے؟

مندر برباد کرنے کی بات قابل غور ہے۔ زمانہ وسطیٰ میں ہندوستانیوں کے خیالات

کا سلسلہ ایک طرح سے رک سا جاتا ہے اور وہ علم، تہذیب اور تمدن، سیاست وغیرہ کسی بھی طرف بڑھنا چھوڑ دیتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اپنی فالتو پونجی کا کوئی نیا استعمال ان کی سمجھ میں نہیں آتا۔ ملک خوش حال تھا اور مندر بنانے کے فن میں ہی سب فالتو پونجی لگ رہی تھی۔ وہ فن بھی تنزل کی طرف جا رہا تھا اور خوب صورت تخیل کی جگہ زیورات اور باہری سجاوٹ لیتے جا رہے تھے۔ مندر ملک میں ضرورت سے کہیں زیادہ بن رہے تھے۔ ان میں ملک کی دولت اکٹھی ہو رہی تھی لیکن اس دولت کی حفاظت کرنے کی طاقت اس کے مالکوں میں کم زور پڑتی جا رہی تھی۔ اس حالت میں کسی نہ کسی حکومت کی تبدیلی میں اس کا لُٹنا ضروری تھا۔ محمود سے سو برس آگے پیچھے دو ہندو راجہ ہوئے ہیں۔ جن میں سے ایک نے مندروں کی جائدادیں ضبط کیں اور دوسرے نے ایک देवोत्पाटना नायक (مندر اکھاڑنے والا افسر) کا تقرر کیا۔ اس افسر کا کام تھا۔ مندروں کو چپکے سے ناپاک کرا دینا اور بعد میں ضبط کر لینا۔ اس طرح مندروں کا بہت تعداد میں بننا اور بعد میں ٹوٹنا صرف اقتصادی اور سماجی حالات کی ایک کروٹ تھی۔ انھیں اقتصادی اور سماجی حالات کی بنا پر محمود کی فالتو دولت سے غزنی میں محل اور مسجدیں بنیں اور ان کی بھی غوریوں کے ہاتھ وہی حالت ہوئی جو محمود کے ہاتھ سومناتھ کی ہوئی تھی۔

اور اگر محمود نہ آتا اور اگر کوئی دوسرا انقلاب بھی نہ ہوتا تو کیا وہ مندر محفوظ رہتے ہندوؤں کی جس نیند کی وجہ سے وہ سرحدی لیٹروں سے نہ بچ سکے کیا اُس نیند کے موجود ہوتے وہ گھاس اور دیمک سے بچ جاتے؟ کیا عوام کی پیٹھ ان کو قائم رکھنے کا وزن ڈھوتی رہتی؟ ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ پرانے مندروں کی بربادی کی سب سے بڑی وجہ یہ ہی ہے۔ آج چتوڑ میں جا کر دیکھیے، راجا بھوج کے مندر سے چمگادڑوں کی بدبو کس طرح دور تک اڑتی ہے۔ جہاں حیدرآباد میں اجنتا کی ایک ایک تصویر کی حفاظت کا کوئی طریقہ باقی نہیں چھوڑا جاتا، جہاں بھوپال دربار سانچی کے ستوپ کو اپنے محلوں کی طرح چمکا چمکا رکھتا ہے

وہاں چتوڑ میں خوبصورت فن کے انوکھے نمونے اینٹوں کے ملبے میں دبے برباد ہو رہے ہیں اور ادوے پور کے عجائب گھر میں دیواروں کے سہارے پڑے ہوئے کتبوں اور مورتوں پر بھی دیواروں کے ساتھ ہی سفیدی پوت دی جاتی ہے۔ آج بہار کے کسانوں سے پوچھیئے ـــــ کیا ان کی پیٹھ اپنے مندروں اور مسجدوں کی زمینداریوں کا وزن آرام سے برداشت کر رہی ہے۔ اقتصادی حالات کیا آج پھر ایک کروٹ بدلنے والے نہیں ہیں؟

ادھ پڑھے پنڈتوں کی ایک پکار ہے ـــــ مسلمانوں نے مندر توڑ کر ہندو فنون لطیفہ کو برباد کر دیا۔ وہ یہ نہیں جانتے کہ ہندو کلا کا دم جب بندھی روایات کی بیہودگیوں، باہری سجاوٹ کی باریکیوں اور اونچے تخیل کی کمی کی وجہ سے گھٹ رہا تھا اس وقت اسلام نے اسے نیا تخیل دے کر اس کی روح کو بچا لیا۔ جونپور، پانڈوا، مانڈو، اور احمد آباد میں فن کے جو نمونے اس زمانے کے ملتے ہیں ان کو مسلم فن کہنا فضول ہے۔ وہ ہندوستانی آرٹ کا ایک نیا رخ ہے۔ وہ انھیں پرانے کاریگروں کے کارنامے ہیں، احمد آباد کی مسجدوں میں تو وہی قدیم کمل وغیرہ کے اشارے موجود ہیں۔ لیکن اس کاریگری میں اسلام نے ایک نئی روح پھونک دی ہے۔ میرے کہنے کا کوئی تعصبی مسلمان یہ مطلب نہ لگالیں کہ اسلام میں فن کو دوبارہ زندہ کرنے کی کوئی دائمی طاقت ہے۔ اس زمانے میں وہ طاقت تھی آج ختم ہو چکی ہے۔ تاریخ کی کوئی پیداوار دائمی نہیں ہوتی۔ ہم کو ہمیشہ ترقی پسند ہونا چاہیئے کسی بھی چیز کو ہم دائمی سمجھ کر اس سے چمٹے رہیں گے۔ تو پیچھے رہ جائیں گے، یہی تاریخ سے سبق حاصل ہوتا ہے۔

محمود کے بعد شہاب الدین غوری نے مسلم حکومت کو پنجاب سے سارے شمالی ہندوستان تک پھیلا دیا۔ غوری کے ناگری سکّے کافی تعداد میں موجود ہیں جن پر لکشمی یا بیل کی شکلیں کھدی ہوئی ہیں۔ اگر شہاب الدین کا مقصد صرف اسلام کو پھیلانا ہی تھا تو ان سکّوں کا کیا مطلب ہے؟

غوری نے اجمیر اور قنوج کے ہندو راج خاک میں ملا دئے، لیکن اگر غوری نہ آتا تو ان کی کیا حالت ہوتی؟ چیدی کی مثال سے ہم اندازہ لگا سکتے ہیں۔ چیدی حکومت گیارھویں اور بارھویں صدیوں میں بہت ترقی یافتہ اور خوشحال تھی لیکن تیرھویں صدی کے شروع میں خود بخود بکھر جاتی ہے اور جگہ جگہ لوگ سر اٹھا لیتے ہیں۔ ایسی حالت میں بہت سے مندروں کی دولت بھی کیا مقامی لٹیروں کے ہاتھ نہ پڑی ہوگی؟

جادا کا بلو تکت سامراج بیرونی بھارت کی آخری ہندو حکومت تھی جس کو رانی جے وشنو وردھنی کی خواہشات اور کوششوں نے ایک سامراج کی شکل دے دی تھی۔ یہ سمجھا جاتا ہے کہ اسے مسلمانوں کی نمک حرامی نے برباد کیا، لیکن کتبوں سے اب یہ ثابت ہوا ہے کہ وہ اسی طرح خود بخود ٹوٹا اور اس کے بعد وہاں مسلم حکومت قائم ہوئی۔

مہارانا کنبھا کے اندراجات میں یہ بات درج ہے کہ اس نے ناگوار کی مسجد کو زمین دوز کر دیا۔ کیا کنبھا اسلام کا دشمن تھا؟ اپنے پڑوس کے دو مسلم حکمرانوں کو شکست دینے کے بعد اس نے چتوڑ میں ایک کیرتی کا ستون بنوایا۔ اسی مینار پر جس جگہ برہما، وشنو، مہیش کی مورتیں بنی ہیں اسی جگہ ان کے ساتھ پتھر میں اللہ اللہ بھی کھودا گیا ہے۔ کیا اس سے صاف ظاہر نہیں ہے کہ اس نے اپنی حکومت میں اسلام کو جگہ دی تھی؟ پھر دونوں باتوں کا میل کس طرح ہو؟ ہم اس طرح میل کر سکتے ہیں کہ ناگور کے شرارتی حکمرانوں کی سرکوبی کے لئے اسے زیادہ سے زیادہ سختی کی ضرورت تھی اور ایک بار یہ دکھانا ضروری ہو گیا تھا کہ سیاسی ضروریات ہونے پر وہ کہاں تک جا سکتا تھا؟ اور مسجد میں بھی کوئی جادو نہ تھا۔ سکھ تاریخ کی کئی ایک دوسرے سے مخالف دکھائی دینے والی باتوں کی اصلیت بھی یہی ہے۔

اورنگ زیب کی بھول کے لئے کیا آج صرف ہندوؤں کو افسوس ہونا چاہیئے کیا آج کے ہندوستانی مسلمان اس کی کرنی کی یاد سے دل ہی دل میں خوش ہوتے ہیں؟ اس کے اپنے وقت میں اس کے خسر نے اس کی مخالفت کی، اس سے لڑا اور مارا گیا۔ اس کی بیٹی

اور بیٹوں کو قید اور ملک بدر کی تکلیفات اٹھانی پڑیں۔ وہ سبھی اس کے اکبر کی پالیسی کو چھوڑ دینے کو غلط سمجھتے تھے جس وقت ہندوستان کے ساحل کے پاس حاجی جہازوں کی دولت اور سید عورتوں کی عزت انگریز ڈاکوؤں کے ہاتھ لوٹی جا رہی تھی اسی وقت اورنگ زیب کا ہندوؤں سے لڑنے میں اپنی حکومت کی طاقت کو برباد کرنا کیا ایسا کام تھا جس سے کسی مسلمان کو خوشی ہو سکتی ہے؟ اگر ہوتی ہے تو وہ سراسر بے وقوفی ہے۔

اور اس کی کم اندیشی کے بارے میں ہم جو کچھ کہیں، لیکن اس کے مضبوط ارادے، بے انتہا فرض شناسی اور ہوشیار محنت، انتھک طاقت اور بے داغ بلند کرداری کی تعریف کیا مسلمانوں کے ساتھ ساتھ ہندو بھی نہیں کر سکتے۔ ہمارے بچے مضبوط کردار اور ارادے کے لاثانی نمونے کو بھول جائیں اور تیس مار خاں دارا شکوہ کا نام رٹا کریں، اس سے کوئی فائدہ نہیں۔

اورنگ زیب کی طرح بالاجی باجی راؤ پیشوا کی کم اندیشی کے لئے آج ہندو اور مسلمان ساتھ ساتھ افسوس کر سکتے ہیں۔ انگریز جب بنگال اور تامل ناڈ میں مراٹھوں کے منہ کا لقمہ چھینتے جا رہے تھے، ابدالی اور نجیب جب اس سے سمجھوتہ کرنے کی منت کر رہے ہیں، اس وقت بھی وہ پنجاب واپس لینے کی منا نہیں چھوڑتا، ابدالی کی ایک چڑھائی سے فائدہ اٹھا کر کلائیو بنگال پر قبضہ کر لیتا ہے۔ اس کی دوسری لڑائی میں مراٹھوں کو پھنسا دیکھ کر تامل ناڈ کو پوری طرح فتح کر لیتا ہے مراٹھوں اور روہیلوں کے آپس میں لڑتے رہنے سے ہی ہندوستان کی موجودہ غلامی شروع ہوتی ہے۔

لیکن جہاں ہمیں اس کی اس بے وقوفی کے لئے افسوس ہوتا ہے وہاں ہم یہ بھی نہیں بھول سکتے کہ کاویری سے چناب تک اور کاٹھیا واڑ سے کٹک تک ہندوستان کے اتحاد اور آزادی کے لئے اس زمانے میں اگر کوئی جان کی بازی لگا رہا تھا تو وہ مراٹھے ہی تھے۔

اور مراٹھوں اور روہیلوں سے سمجھ کی غلطی چاہے جیسی ہوئی ہو لیکن جب وہ لڑے تو مردوں کی طرح لڑے۔ جب انھوں نے حالات کو سمجھا تو مردوں کی طرح کھلے دل سے اس غلطی کا

اعتراف کیا صرف اعتراف ہی نہیں بلکہ اس غلطی کو اپنی قربانیوں سے برابر کرنے کی کوشش بھی کی۔ آج کی گری ہوئی فرقہ وارانہ بیچ کچ میں جو ۱۸۵۷ء کے بعد سے سامراجی طاقت نے دونوں فرقوں کے کچھ خود غرض اور بہکنے والے لوگوں کو حربہ بنا کر اور بہکا کر پیدا کی ہے، بہت یار کچھ کاغذی پہلوان مراٹھوں اور روہیلوں کی لڑائی کا ناٹک کیا کرتے ہیں وہ بھول جاتے ہیں کہ جہاں تک شواجی اور باجی راؤ کے خاندانوں کا تعلق ہے وہ اپنی غلطی کو اپنے خون سے دھو گئے۔ نانا صاحب اور عظیم اللہ، لکشمی بائی اور حضرت محل، بخت خاں اور تانتیا ٹوپے کا ایک ساتھ اپنی قربانی دینا، احمد شاہ کو بچانے کے لئے نانا کا لیک کر پہنچنا اور تانتیا ٹوپے کا ساتھ دینے کے لئے شاہزادے فیروز کا بھاگ کر آنا، بہادر شاہ اور بہادر خاں کا گئو کشی بند کرنے کا فرمان نکالنا اور جن روہیلوں اور اودھ والوں سے لڑتے رہنے کی وجہ سے اپنی آزادی کے خاتمے کا بیج بو دیا گیا تھا، انھیں کے ملک میں ان کے لئے جان دیتے ہوئے پیشواؤں کے آخری خاندانی کا ختم ہونا۔ مراٹھا ناٹک کا یہ آخری ڈراپ سین کیا ہندو مسلم دشمنی کا پیغام دیتا ہے؟

صداقت کی تلوار اور رواداری کی ڈھال لے کر اگر ہم اپنی تاریخ کے ناہموار راستے میں اترتے ہیں۔ تو اس کے اندھیرے میں ہم کو کہیں بھی نفرت اور دشمنی کے بھوت دکھائی نہیں دیتے۔ وہ اسی وقت ابھرنے لگتے ہیں جب سچائی کو چھپایا جاتا ہے۔ قدیم ہندوستان کے بارے میں علماء نے جو سچائیاں تلاش کی ہیں ہمارے سیانوں کا اشارہ یہ رہتا ہے کہ ان کو بچوں کی درسی کتابوں میں شامل نہ کیا جائے۔

پیپل کی شاخوں کے لئے آج کتنی پریشانیاں ہوتی ہیں؟ سچائی یہ ہے کہ قدیم ہندو اپنے یگیوں میں پیپل کی لکڑی خاص طور سے کاٹ کر جلاتے تھے۔ جب گیا کا ایک پیپل بودھی ورکش (درخت) بن گیا تب سے پیپل کی عزت بڑھ گئی۔ اور جب راجہ ششانک نے اس بودھی ورکش کو اکھاڑ پھینکا، شاید اس کے بعد سے ہی اس کی شہادت کی یاد میں اس کی پوری برادری مقدس قرار دی گئی۔ گئو کشی کو لے کر آج ہمارے ملک میں کتنا خون خرابا ہوتا ہے! تاریخی اصلیت یہ ہے کہ پہلے پہل بھار شو اور واکاٹک زمانے سے گئو کشی کو پاپ مانا جانے لگا ہے۔ سانچی کے گنبد کی دیدکا (گھیرا کرنے کی جگہ) کے ایک ستون پر تیسری صدی کے حروف میں ایک کتابت ہے جس میں پہلے پہل ہم گئو کشی کے پاپ ہونے کی بات ملتی ہے۔

آنریبل جسٹس سید محمود مرحوم

جناب عبدالمجید قریشی

ایک بہت بڑے باپ کے بہت بڑے بیٹے اور ایک بہت بڑے بیٹے کے بہت بڑے باپ، میری مراد یہاں سرسید کے نامور لخت جگر اور سر راس مسعود کے والد بزرگ ایم اے او کالج علی گڑھ کے لائف جوائنٹ سکرٹری، الہ آباد ہائی کورٹ کے جج اور برصغیر کے نہایت ممتاز اور عظیم قانون دان آنریبل جسٹس سید محمود مرحوم سے ہے۔ متحدہ ہندوستان کے ہر بڑے آدمی کی تصویر میری نظر سے گزری ہے لیکن دل میں یہ حسرت باقی رہی کہ سید صاحب کی اب تک زیارت نہ ہو سکی۔ ویسے سنا ہے کہ چہرہ مہرہ بالکل باپ کا سا تھا بلکہ اُن سے بھی وجیہہ اور بارعب بتلائے جاتے ہیں۔ صوم و صلوٰۃ کے پابند تھے اور چہرہ پر کھلتی ہوئی خوب صورت ڈاڑھی تھی۔ لیکن پیتے تھے اور بہت زیادہ پیتے تھے اور خوب پیتے تھے، شب و روز پیتے تھے، خدا جانے بنت عنب سے انھیں کہاں عشق ہوا۔ کیسے وہ اس کی زلف گرہ گیر کے اسیر ہوئے کہ تمام کی تمام ذہانت، لیاقت اور شہرت اس کے قدموں پر نچھاور کر بیٹھے حتی کہ متاع زیست کا نذرانہ بھی اس کے حضور میں پیش کر دیا۔ بادۂ شبانہ کی سرمستیوں نے انھیں قبل از وقت بوڑھا بنا دیا تھا۔ سرسید کی وفات کے بعد وہ صرف ڈیڑھ سال اور جیے اور آخر کار اپنے رب کے حضور میں حاضر ہو گئے۔ ہندوستان بشمول پاکستان میں خاندان حضرت مولانا شاہ ولی اللہ دہلوی کے بعد سوائے سرسید کے گھرانے کے مجھے کوئی اور خانوادہ ایسا نظر نہیں آتا جس میں مسلسل تین پشتوں تک یکساں قابل فاضل اور شہرۂ آفاق شخصیتوں نے جنم لیا ہو۔

سید محمود اور ان کے بڑے بھائی سید حامد ابھی بچپن کی منزلوں میں تھے کہ اُن کی والدہ انھیں داغ مفارقت دے گئیں۔ سرسید کو ان سے بڑی محبت تھی۔ کچھ اُن کی محبت کا تقاضا اور کچھ بچوں کے

مستقبل کا خیال کہ سید صاحب نے نکاحِ ثانی کا تصور تک نہ کیا۔ حالانکہ ان کی عمر اُن دنوں چالیس برس کے قریب تھی انھوں نے اپنے دونوں بچوں کی پرورش اور تربیت خود کی اور خوب کی۔

سید حامد صوبجات متحدہ میں براہِ راست سپرنٹنڈنٹ پولیس بھرتی ہوئے۔ اس دور میں یہ عہدہ کس قدر اہمیت رکھتا تھا اس کا تصور بھی ہم آج نہیں کر سکتے۔ لیکن ان کی عمر نے وفا نہ کی اور عین عالم شباب میں وہ فوت ہو گئے۔

سید محمود مرحوم سب سے پہلے ہندوستانی تھے جنھوں نے ولایت سے قانون کی اعلیٰ ڈگری حاصل کی۔ اور انیسویں صدی کے آخر میں جب انگریزی عروج و اقبال کا آفتاب نصف النہار پوری تابانی کے ساتھ جگمگا رہا تھا جب چھوٹی چھوٹی ملازمتوں اور معمولی معمولی عہدوں تک پر انگریز افسر فائز و مامور تھے سید محمود کو الہ آباد ہائی کورٹ کی ججی کی کرسی نصیب ہوئی۔ اس وقت پورے ملک کی عدالت ہائے عالیہ کا کوئی جج بھی ہندو یا مسلمان نہ تھا۔ یہ سید محمود کی قانونی عظمت کا کرشمہ تھا کہ انھیں انگریز ججوں اور قانون دانوں کی صفِ اول میں کمال عزت و وقار کے ساتھ جگہ ملی اور انھوں نے اپنی بے مثل فراست اور عدیم النظیر قوتِ فیصلہ سے ثابت کر دیا کہ وہ کہاں تک اس عہدۂ جلیلہ کے مستحق ہیں اور حکومت ہند کے اس وقت کے انگریز وزیر قانون کو اعتراف کرنا پڑا کہ وہ سید محمود کی قانونی موشگافیوں سے استفادہ کرتے ہیں بلاشبہ وہ ایک نامور باپ کے نامور بیٹے ہیں۔

ان کی غیر معمولی ذہانت و فطانت اور اعلیٰ قانونی قابلیت کا پتہ ان اہم مقدمات کے فیصلوں سے چلتا ہے جو سید محمود نے بحیثیت جج الہ آباد ہائی کورٹ صادر فرمائے تھے اور جو آج بھی دنیائے قانون میں اپنی اہمیت، فوقیت اور مسلمہ حیثیت کی بنا پر اپنی مثال آپ ہیں۔ کسی نے سچ کہا کہ سید محمود کا دماغ قانون کا دماغ تھا۔ اس کا دماغ کس طرح کام کرتا اس کا اندازہ ذیل کے واقعات سے بخوبی ہوتا ہے۔

پہلے واقعہ کے راوی خان بہادر تقی محمد خاں صاحب ہیں وہ اپنی سرگزشت "حیاتِ عمر رفتہ" میں رقم طراز ہیں کہ ایک مرتبہ جب سید صاحب ہائی کورٹ کے جج تھے۔ ایک انگریز بیرسٹر ان کی

عدالت میں ملزم کی طرف سے وجوہاتِ صفائی بیان کر رہا تھا۔ گرمی کا زمانہ خس کی ٹٹیاں اور پنکھوں کی سرد ہوا۔ ان پر غنودگی طاری ہو گئی۔ اور انھوں نے آنکھیں بند کر لیں بیرسٹر سمجھا کہ وہ بحث کو بغور سُن رہے ہیں لیکن جب خراٹوں کی آواز سنی تو خاموش ہو گیا اس کے خاموش ہوتے ہی ان کی آنکھ کھل گئی، پوچھا کہ خاموش کیوں ہو گئے۔ اس نے جواب دیا کہ جب عدالت سو جائے تو بحث کس کو سناؤں۔ سید صاحب مسکرائے۔ پھر انھوں نے وہ تمام باتیں دہرا دیں جو ان کے سونے کی حالت میں اس نے بیان کی تھیں، بیرسٹر حیرانی سے ان کا منہ تکنے لگا۔

دوسرا واقعہ ان دنوں کا ہے جب سید صاحب بحیثیت بیرسٹر الہ آباد ہائی کورٹ میں ایک اہم مقدمہ کی پیروی کر رہے تھے۔ وقوعہ کے روز حسب معمول پئے ہوئے تھے کہ بحث کے لئے حاضر عدالت ہوئے بحث کا آغاز بڑی آن بان سے کیا لیکن ان کے موکل کی بدقسمتی کہ سید صاحب کے بیان کردہ تمام دلائل اس کے خلاف جا رہے تھے۔ جج حیران اور فریق مخالف کا وکیل مسکرا رہا تھا۔ سید صاحب کا موکل گھبرا گیا۔ اس نے عدالت سے درخواست کی کہ وہ سید صاحب سے کچھ کہنا چاہتا ہے۔ عدالت نے اجازت دے دی۔ موکل نے ان کے کان میں کچھ کہا کہ سید صاحب کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ لیکن فوراً ہی سنبھل گئے۔ بحث اسی رنگ میں پھر جاری ہوگئی اور پانچ سات منٹ کے بعد ختم ہوگئی دو چار سیکنڈ سکوت فرمایا پھر معاً عدالت کی جانب متوجہ ہوئے کہ حضور والا یہ وہ دلائل ہیں جو میرے مخالف وکیل اپنے موکل کی موافقت میں دے سکتے ہیں۔ اب میرے دلائل سماعت فرمایئے۔ یہ فقرے سنتے ہی انگریز جج کرسی سے اُچھل پڑا اور کہا ضرور ضرور۔ چنانچہ سید صاحب نے نہایت قابلیت کے ساتھ اپنا کیس عدالت کے سامنے پیش کیا اور آخر کار مقدمہ جیت کر اُٹھے۔

جناب ممتاز حسین جونپوری علی گڑھ میگزین کے "علی گڑھ نمبر" میں رقم طراز ہیں کہ سید صاحب کا حافظہ غیر معمولی طور پر قوی تھا۔ اردو فارسی عربی اور انگریزی کے ہزاروں اشعار انھیں ازبر تھے۔ وہ شاعر نہ تھے مگر شعر و سخن کے بڑے دلدادہ اور قدردان تھے۔ شعر و ں سے

ان کی دلچسپی کا یہ عالم تھا کہ مقدموں کی مثلوں اور عدالتی تقریروں میں مناسب اور برمحل اشعار بڑی خوب صورتی اور برجستگی سے پیش کرتے تھے۔ ایک مشہور مقدمہ کے فیصلہ میں انھوں نے قاتل کی آستین پر خون کے دھبّوں کا ذکر فرماتے ہوئے یہ شعر تحریر کیا تھا۔

قریب ہے یار روز محشر چھپے گا کشتوں کا خون کیوں کر
جو چُپ رہے گی زبانِ خنجر لہو پکارے گا آستیں کا

ایک بار ان کی عدالت میں ایک حسین وجمیل عورت جس کا نام سوسن تھا شہادت دینے کے لئے حاضر ہوئی۔ ایسی تیز وطرار اور زبان دراز کہ الہٰی توبہ۔ سید صاحب بار بار اس کی طرف دیکھتے اور اس کی ہزار داستانی اور بے محل طراری کو روکتے روکتے رہ جاتے۔ تماشائیوں سے اجلاس بھرا ہوا تھا، سید صاحب نے میر فدا حسین وکیل کی طرف دیکھ کر فرمایا میر صاحب دیکھا آپ نے

سوسن نے زباں درازیاں کیں

میر صاحب نے فرمایا کہ سید صاحب دوسرا مصرع بھی ساتھ ہی پڑھ دیجیے۔

نرگس نے نگاہ بازیاں کیں

سید صاحب ہنس پڑے۔

اسی طرح مولوی عبدالرزاق صاحب کانپوری نے بزم محمودی کا جو نقشہ "یادِ ایام" میں کھینچا ہے وہ اپنی جگہ آپ ہے مولوی صاحب فرماتے ہیں کہ دلّی میں سید حامد کے انتقال کی خبر سُن کر میں سید محمود صاحب کی قیام گاہ پر گیا، میرے ہمراہ منشی رحمت اللہ رعد، اور منشی عطاء اللہ خاں کو توالِ شہر بھی تھے۔ ادائے تعزیت کے بعد جب ہم نے اُٹھنا چاہا تو سید صاحب نے جانے کی اجازت نہ دی۔ کچھ دیر کے بعد کھانا آیا۔ اور اس طرح رات کے دس بج گئے ہم نے پھر اُٹھنے کا ارادہ کیا مگر اجازت نہ ملی۔ ارشاد ہوا کہ برسوں کے بعد آج جناب رعد سے ملاقات ہوئی ہے۔ کچھ دیر اور تشریف رکھیے۔ حکم کی تعمیل کی گئی۔ سید صاحب رعد کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا کہ جناب رعد آپ کی آواز میں رعد کی سی کڑک ہے لہٰذا کلام بھی ایسا ہی پُرجوش ہوگا کچھ سنائیے رعد نے

معذرت کی کہ جب سے مسدس حالی کو پڑھا ہے ایشیائی شاعری سے تائب ہو چکا ہوں۔ مگر یہ عذر قبول نہ ہوا۔ اور رعد نے مجبوراً اپنا کلام سنایا۔ چند غزلوں کے بعد یہ دور ختم ہو گیا۔ ایک شعر یاد آگیا آپ بھی سن لیجئے۔

جھانکتے تھے ان کو ہم جس روزنِ دیوار سے

وائے قسمت ہو اسی روزن میں گھر زنبور کا

اس کے بعد رعد نے فرمائش کی کہ جناب بھی شاعر ہیں کچھ اپنا کلام سنایئے۔ فرمایا کہ لندن میں بزمانۂ طالب علمی کچھ انگریزی نظمیں کہی تھیں اور ہندوستان آکر کچھ نظمیں اتفاقیہ طور پر فارسی میں لکھیں انھیں چھوڑیئے۔ البتہ اگر متقدمین و متاخرین شعراء کا کلام سننا چاہتے ہوں تو عرض کروں۔

رعد نے اس موقع کو غنیمت سمجھا۔ اس کے بعد سید صاحب نے سوال کیا کہ نظم کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ لہٰذا ارشاد فرمایئے کہ کس زبان کے شعراء کا کلام سناؤں۔ اور یہ بھی طے ہونا چاہیئے کہ اصنافِ سخن میں سے آپ کو کیا پسند ہے غزل یا قصائد۔

رعد نے اردو غزل کی فرمائش کی اور عرض کیا کہ ولی دکھنی سے آغاز کیا جائے۔ چنانچہ رعد ولی کی غزل کا کوئی شعر پڑھتے اور سید صاحب پوری غزل سنا دیتے۔ ولی کے بعد ان شعرائے دکن کا کلام سنایا جو ولی سے بہت پہلے گذر چکے تھے۔ شعرائے دکن کے بعد میر کا کلام سنایا یہ اشعار گویا میر کے بہتر نشتر تھے جو پوری کلیات سے انتخاب کئے گئے تھے۔ اور غالب کے کلام پر شعرائے اردو کا سلسلہ ختم ہو گیا۔

اردو کے بعد متقدمین شعرائے عجم کا کلام سنایا۔ ہر بار سید صاحب یہی فرماتے تھے کہ آپ کسی شاعر کا نام لیں اور اس کی غزل کا مطلع پڑھیں چنانچہ اسی اصول پر حافظ۔ سعدی۔ جامی اور خیام وغیرہ کی متعدد غزلیں ردیف وار سنائیں۔ جب عاشقانہ رنگ سے طبیعت سیر ہو گئی تو منشی صاحب نے مثنوی مولانا روم کی فرمائش کی۔ چنانچہ یہ درخواست بھی منظور ہوئی اور چند منٹ کے لئے سید صاحب دوسرے کمرے میں تشریف لے گئے۔ جب واپس آئے تو قمیص کے بٹن کھلے ہوئے تھے اور داڑھی سے پانی کے قطرے ٹپک رہے۔ بلند آواز سے خادم کو پکارا

اور تولیہ کی فرمائش کی۔ تولیہ سے منہ ہاتھ پونچھ کر کرسی پر بیٹھ گئے اور فرمایا کہ مثنوی مولانا روم میں بغیر وضو نہیں پڑھتا ہوں۔ اب جو حکایت آپ کو پسند ہو اس کا پہلا شعر پڑھیئے۔ رعد کی زبان سے نکلا ع

دید مجنوں را یکے صحرا نورد

چنانچہ سید صاحب نے نہایت ذوق و شوق اور بلند آواز سے یہ پوری حکایت سُنائی۔ دورانِ گفتگو میں نے ہمیشہ سید محمود کو اس کا عامل پایا کہ ان کی زبان سے جو حرف ادا ہوتا تھا وہ صحیح مخرج سے نکلتا تھا۔ دوسرے یہ کہ گھنٹوں کی گفتگو میں بھی ایک انگریزی لفظ زبان پر نہ آتا تھا۔

اس واقعہ کے بعد بھی متعدد مرتبہ سید محمود سے الہ آباد وغیرہ میں ملاقات ہوئی مگر یہ رات عجیب و غریب تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ اخیر عمر میں سید صاحب پر شراب غالب تھی اور کھانا چھوٹ گیا تھا چوبیس گھنٹوں میں صرف دو سیر دودھ۔ انڈے اور چائے پر زندگی تھی۔ اس محفل سے دس بجے شب سے پانچ بجے صبح تک سات آٹھ مرتبہ اٹھ کر دوسرے کمرے میں تشریف لے گئے تھے۔ اور چند منٹ بعد واپس آئے یہ آنا جانا ضرور تا تھا، لیکن ان کی زندگی کا یہ عظیم الشان اخلاقی واقعہ ہے کہ کسی شخص نے ان کو بچشم خود شراب پیتے نہیں دیکھا اور نہ کوئی شرعی شہادت موجود ہے۔"

سید صاحب کی تصویر کا یہ رُخ آپ نے ملاحظہ فرمایا۔ اب ان کی تصویر کا دوسرا رُخ بھی ملاحظہ فرمائیے۔ جہاں وہ پیکرِ جاہ و جلال نظر آتے ہیں۔ سید صاحب کی یہ تصویر سر سید رضا علی کے قلم نے انتہائی کامیابی اور کمال چابکدستی سے "اعمالنامہ" میں کھینچی ہے۔ "سر سید کی جانشینی کا مسئلہ محسن الملک اور سید محمود" کے زیرِ عنوان وہ تحریر فرماتے ہیں:

"بزم اغیار ہے ڈر ہے نہ خفا تو ہو جائے
ورنہ اک آہ میں کھینچوں تو ابھی ہو ہو جائے

سر سید کی وفات کے بعد سید محمود صاحب کی جو حالت تھی اس کی سچی تصویر اس شعر

میں موجود ہے۔ ۳۱ جنوری ۱۸۹۹ء کو ٹرسٹیان کالج کا جلسہ نواب محمد حیات خاں صاحب کی صدارت میں ہوا۔ ایک طرف سید محمود اور دوسری طرف محسن الملک موجود تھے۔ میری یہ عبارت کہ برآمدہ میں پہنچ گیا۔ سید محمود نظیر اکبرآبادی کا یہ مصرع پڑھتے ہوئے اسٹریچی ہال سے نکل رہے تھے۔

سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارہ

سارے ٹرسٹی ایسے ملول و مغموم تھے گویا جنازہ کے ساتھ جا رہے ہیں۔ سید محمود کے پیچھے پیچھے نواب محسن الملک تھے۔ چہرہ زرد، آنکھوں میں آنسو۔ بھرائی ہوئی آواز قدم ڈگمگاتے کہیں رکھتے پڑتا کہیں تھا۔ ان کے ذرا پیچھے نواب محمد حیات خاں صاحب اور خان بہادر ملک برکت علی خاں صاحب اور خلیفہ محمد حسن صاحب تھے۔ تینوں حضرات سرسید کے سچے رفیق اور کالج کے بڑے معاون تھے۔ ان تینوں کے بعد مسٹر بیک جن کو بارہ سال پیشتر سید محمود ولایت سے پرنسپلی کے عہدہ کے لئے منتخب کر کے لائے تھے۔ کچھ ٹرسٹی اسٹریچی ہال کے برآمدے میں تھے۔ کچھ ہال سے نکل رہے تھے۔ ٹرسٹیوں نے اس ہنگامہ سے ذرا دیر پہلے سرسید علیہ الرحمۃ کی جگہ نواب محسن الملک کو کالج کا آنریری سکرٹری منتخب کیا تھا۔ سید محمود فرماتے تھے کہ میں لائف جوائنٹ سکرٹری ہوں۔ قواعد ٹرسٹیان کی رو سے میرے موجود ہوتے تم محسن الملک یا کسی اور کو آنریری سکرٹری نہیں بنا سکتے۔ سید محمود کی حالت زخمی شیر کی سی تھی۔ بپھرے ہوئے تھے اور جو منہ میں آتا تھا کہہ رہے تھے۔ سب اِدھر اُدھر ٹک رہے تھے۔ شیر کا مقابلہ خود اس کے پرانے رفیق محسن الملک سے تھا۔ سارے ٹرسٹیوں کی کوشش تھی کہ جس طرح بن پڑے خوشامد درآمد کر کے غضب آلودہ شیر کو چیتے کی طرح رام کریں۔ اس کوشش میں سب سے زیادہ نمایاں حصہ لینے والے مسٹر بیک معلوم ہوتے تھے دوران گفتگو میں سید محمود مسٹر بیک کو تھیوڈور کہہ کر خطاب کرتے تھے (مسٹر بیک کا پورا نام تھیوڈور بیک تھا) جس سے شیر برطانیہ اور معزول شیر علی گڑھ کے درمیان گہری دوستی اور انتہائی بے تکلفی کا پتہ چلتا تھا۔

شام کے پانچ بجے کا وقت تھا۔ جلسہ سارے دن رہا تھا۔ ٹرسٹیوں نے تو گتھی سلجھانے میں کوئی کمی نہیں کی تھی مگر سید محمود کی برہمی سے معلوم ہوتا تھا کہ سلجھنے کی بجائے گتھی میں اور پیچ پڑ گئے ہیں۔ بالآخر اسی شخص کی سوجھ بوجھ کام آئی جس کی فراست و ذکاوت اور ہوش مندی کا اب سے چند سال پہلے حیدرآباد میں ڈنکا بج رہا تھا۔ محسن الملک بڑھے اور سید محمود کے قدموں کی طرف جھکے۔ آن کی آن میں ایک سید کی ٹوپی دوسرے سید کے قدموں پر تھی۔ سید محمود نے ہاتھ پکڑ کر محسن الملک کو اٹھایا اور فرمایا "مہدی تو کیا کہتا ہے" محسن الملک کی آنکھوں سے آنسو ٹپک رہے تھے۔ بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ "میں کہتا ہوں کہ اس وقت قوم کی کشتی کو ڈوبنے سے سوائے تمھارے اور کوئی نہیں بچا سکتا۔" سید محمود بولے۔" اچھا تو کہتا ہے تو میں راضی ہوں"۔ سید محمود کی آواز میں افسوس کا ذرا سا بھی شائبہ نہ تھا۔ ہم سب محو حیرت تھے کہ ایں چہ می بینم بہ بیداری است یارب یا بخواب۔ ٹرسٹیوں نے دن بھر سارے جتن کئے مگر بے سود۔ سچ تو یہ ہے کہ اگر محسن الملک سید محمود کے جذبۂ شرافت سے استغاثہ نہ کرتے تو سید محمود معاملہ کو بغیر عدالت کا دروازہ کھٹکھٹائے نہ چھوڑتے جس سے کالج کو سخت نقصان پہنچتا۔"

اس واقعہ کا پس منظر یہ ہے کہ سرسید کی وفات کے بعد کالج کی مالی حالت نہایت نازک ہو چکی تھی کیونکہ کالج اب سے چند سال بیشتر ایک بہت بڑے غبن سے دوچار ہو چکا تھا جس کے اثرات ابھی تک باقی تھے۔ سید محمود گو ان دنوں کالج کے عارضی آنریری سکریٹری تھے مگر صلاحیتوں کو کثرت مے نوشی سلب کر چکی تھی۔ حالات کا مزید مقابلہ کرنا اب ان کے بس کا کام نہ تھا ضرورت تھی کہ کالج کی عنانِ اقتدار ایسے ہاتھوں میں آئے جو اس عظیم ادارہ کے واقعی اہل ہوں۔ چنانچہ ٹرسٹیانِ کالج نے اس عہدہ کے لئے نواب محسن الملک کا انتخاب کیا جنھوں نے آگے چل کر ثابت کر دیا کہ ٹرسٹیان کالج کی رائے اس معاملہ میں کس قدر صائب تھی۔

وفات سے کچھ عرصہ پیشتر وہ لکھنؤ تشریف لے گئے۔ وہاں ان کا معمول تھا کہ صبح سویرے سکندر باغ چلے جاتے۔ وہاں کسی گوشہ میں تنہا بیٹھ جاتے۔ آنکھیں بند کر لیتے اور تلاوت کلام پاک کرتے یا بے ثباتی عالم پر فارسی اشعار پڑھتے۔ دیکھنے والوں نے بارہا دیکھا کہ لب پر کلام پاک کی آیات جاری ہیں اور آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگی ہوئی ہے۔ اللہ تعالیٰ بال بال مغفرت فرمائے۔

ان کی وفات کا ماتم حضرت اکبر الہ آبادی نے حسب ذیل اشعار کی صورت میں کیا :

نہ وہ بیک رہ گئے نہ سرسید
دلِ احباب سے نکلتی ہے آہ
ذاتِ محمود سے تسلی تھی
لی انھوں نے بھی آج خلد کی راہ
بولی عبرت کہ ہوش میں آؤ
لے حریصا نہ شان و شوکت و جاہ
مٹ گیا نقش احمد و محمود
رہ گیا لا الٰہ الا اللہ

رسالہ "زمانہ"

جناب ویریندر پرشاد سکسینہ بدایونی

"زمانہ" کا سب سے پہلا شمارہ ۱۰ فروری ۱۹۰۳ء میں مطبع قیصری پریس بریلی میں باہتمام داروغہ منشی مہاراج پرشاد منیجر طبع ہوا تھا۔ اس رسالہ کے سب سے پہلے ایڈیٹر روحانی پیشوا منشی شیوبرت لال ورمن ایم اے تھے جو دو سو سے زیادہ اردو کتابوں کے مصنف تھے لیکن ہمارے ادبی مورخوں اور تذکرہ نویسوں نے ان کا ذکر کسی اردو کی ادبی تاریخ میں نہیں کیا۔ رسالہ "زمانہ" ان کی ایڈیٹری میں ۱۰ فروری ۱۹۰۳ء سے ماہ اکتوبر ۱۹۰۳ء تک شائع ہوتا رہا عبدالرزاق قریشی نے دسمبر ۱۹۵۹ء میں رسالہ آج کل میں منشی دیا نرائن نگم پر ایک مقالہ لکھا ہے اس میں بغیر تحقیق کئے ہوئے یہ لکھ دیا ہے کہ

"زمانہ" ۱۹۰۱ء سے بریلی سے نکلتا تھا"

اس قسم کی غلطی رسالہ "زمانہ" کے سلسلے میں مولانا حسرت موہانی کشن پرشاد کول اور اردو ہندی کے دوسرے ادیبوں نے بھی کی ہے۔ رسالہ زمانہ کے ۱۰ فروری ۱۹۰۳ء کے شمارے میں زمانہ اور اس کی اصلیت و غرض کے سلسلے میں منشی شیوبرت لال ورمن یوں رقم طراز ہیں:

حضرات ناظرین! (۱) زمانہ کے نمونے کا پرچہ بہ تعظیم تمام نذر خدمت کیا جاتا ہے، گر قبول افتد زہے عز و شرف

(۲) زمانہ

عاشق ملک ہے دیوانہ ہے — وہ اس اک شمع کا پروانہ ہے
دین و آئین بھی ہے اُس کا — حامیٔ مذہب فرزانہ ہے

(۳) زمانہ کی اشاعت ایک خاص غرض کی تکمیل ہے۔ اُردو زبان میں مغربی و مشرقی خیالات کے

اتحاد کی تصویر پیشکش کرتے رہنا اور ان علوم و فنون و ضروری واقعات پر خامہ فرسائی کرنا جو ہمارے طرز معاشرت پر اثرانداز ہوتے ہیں اور جن کی معمولی واقفیت تہذیب و شائستگی کا معیار قرار دی جاتی ہے اس کا عین مقصد ہے۔

(۴) زمانہ میں ہر قسم کے مضامین سوشل و پولیٹکل زیر بحث آویں گے اور احتیاط کی جائے گی کہ زمانۂ حال کے خیالات میں وسعت پیدا ہو اور اس ملک کی سب قومیں باہم شیر و شکر کی طرح مل کر قومی اتحاد کے اصول پر عمل کریں۔

(۵) زمانہ کی کوشش ہوگی کہ وہ گورنمنٹ کی منشا کو عوام پر اعلان کرے اور عوام الناس کی خواہش و تمنا کو بلاکم و کاست سرکار تک پہنچائے اور فریقین کی لاعلمی کے دور کرنے میں ممد و معاون ثابت ہو۔

منشی شیوبرت لال ورمن کی اڈیٹری کے زمانہ میں رسالہ زمانہ کے پانسو سے زیادہ خریدار ہو گئے تھے۔ منشی شیوبرت لال ورمن نے رسالہ میں ادبی تاریخی، مذہبی اور سائنس کے مضامین شائع کئے اور بہت سے مختلف رسالوں سے مختلف مضامین اقتباس کئے گئے۔ منشی رام بہادر لال جویا، منشی کندن لال شرر سہارنپوری اور دوارکا پرشاد گہر مرحومین کی نظمیں بھی ماہ فروری ۱۹۰۳ء سے ماہ اکتوبر ۱۹۰۳ء کے شماروں میں نظر آتی ہیں۔ "دارفنا" کے عنوان سے زمانہ مئی ۱۹۰۳ء میں حضرت فانی بدایونی کی ایک غزل شائع ہوئی ہے۔

ماہ نومبر و دسمبر ۱۹۰۳ء میں رسالہ زمانہ منشی دیا نراین نگم کی اڈیٹری میں نکلنا شروع ہو گیا اس مشترکہ شمارے میں مسٹر راناڈے کا نوحہ چکبست لکھنوی کا لکھا ہوا شائع ہوا ہے۔ منشی دیا نراین نگم زمانہ بابت ماہ جنوری ۱۹۰۴ء میں زمانہ کی اڈیٹری کی تبدیلی کے سلسلے میں یوں رقم طراز ہیں:

زمانہ کی ایڈیٹری میں جو تبدیلی واقع ہوئی ہے وہ ناظرین پر سرورق سے ظاہر ہو گئی ہوگی۔ یہ تبدیلی بڑے پس و پیش کے بعد منظور کی گئی ہے۔ اپنی کم مائگی بے علمی کا یقین مانع تھا کہ ایسا اہم کام اپنے ذمہ لیا جائے۔ مگر شوق اکتسابِ علم اور جوش خدمت ملکی اور خیال اصلاح رسالہ ہذا نے بالآخر

فتح پائی اور نتیجہ یہ ہوا کہ زمانہ کی ترتیب کم سے کم کچھ دنوں کے لئے اپنے سر لی گئی۔ مگر اس نازک خدمت کا خوبی اور خوش اسلوبی سے سرانجام پانا اہل قلم کی دستگیری اور سرپرستی کے بغیر ناممکن ہے۔ شکر ہے کہ ملک کے ایک کثیر التعداد اہل قلم کی جانب سے یہ امداد بلا دریغ ملی ہے۔ جو بہرحال زمانہ کی عمدگی اور ہماری حوصلہ افزائی کا باعث ہے۔ ہم اپنی طرف سے زمانہ کو ملک میں ایک مفید اور جامع میگزین بنانے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھیں گے۔ مگر ہماری کوششوں کی کامیابی بہت کچھ اہل ملک کی قدردانی اور حوصلہ افزائی پر منحصر ہے۔

اس اہم ذمہ داری کے لیتے وقت زمانہ کو ملک کے اور دلچسپ و دلکش میگزینوں سے جدا اصولوں پر چلانے کا ارادہ کر لیا گیا ہے۔ کافی غور و فکر اور صلاح و مشورہ کے بعد یہ طے پایا ہے کہ زمانہ محض شاعری اور انشا پردازی کے ہاتھ رہن نہ رکھ دیا جاوے۔ کیونکہ ملک میں ایسے رسالوں کی ایک کافی تعداد موجود ہے جو زبان اردو کے لئے عمدہ کام کر رہے ہیں۔ زمانہ میں حتی الوسع ترقی زبان کا خیال لئے ہوئے اصلاح خیالات۔ درستی مذاق۔ توسیع معلومات۔ ترقی اتحاد وغیرہ کا زیادہ خصوصیت سے التزام رکھا گیا ہے۔ مگر ان ارادوں کا پورا ہونا بہت کچھ تائید غیبی اور امداد باہمی پر موقوف ہے اس لئے دل سے دعا ہے کہ خدا ہماری کوششوں میں برکت دے۔"

منشی دیا نرائن نگم کی ادارت میں زمانہ نومبر و دسمبر ۱۹۰۳ئہ سے جنوری ۱۹۴۲ئہ تک جاری رہا۔ منشی جی فدائے اردو تھے اس لئے مرتے دم تک اردو کی ترقی و عروج کے خواہاں رہے۔ منشی جی کی بیش بہا ادبی خدمت کو اردو والوں نے بھلا دیا لیکن بے شبہ انھوں نے اردو ادب کی جو خدمات انجام دی ہیں ان کی یادگار قائم رکھنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ ان کی ادبی خدمات پر انجمن ترقی اردو ہند کوئی کتاب شائع کرے اور ان کے تحقیقی اور تنقیدی مضامین کا مجموعہ بھی شائع کرے۔ اگر یہ کام منشی جی پر اس وقت نہیں ہوئے تو آئندہ کوئی امید نظر نہیں آتی کیونکہ پرانے رسالوں میں ان کے تحقیقی اور تنقیدی مضامین دیکھنے کی کون زحمت گوارا کرے گا اور پرانے رسالوں تک ہر ایک کی رسائی بھی نہیں ہو سکتی اگر کوئی اردو ادب کی تاریخ لکھنا چاہے

تو اس کو رسالہ زمانہ کے چالیس سال کے فائل کا مطالعہ ضروری ہوگا کیونکہ ان رسالوں میں اردو کی چالیس سالہ تاریخ ملتی ہے۔ رسالہ زمانہ کا دامن ان داغوں سے پاک رہا جبکہ زیادہ تر رسالے سطحی ادب پیش کر رہے تھے۔ مرحوم کا مطمح نظر بلند تھا اس لئے رسالہ کا جو معیار انھوں نے قائم کیا اُسے تازیست نبھایا۔ رسالہ زمانہ کے ذریعہ سے بہت سے گمنام ادیب اور شاعر منظر عام پر آئے ورنہ ان کے افکار اور مضامین سے اردو دنیا محروم رہتی۔

درگا سہائے سرور، چکبست، منشی نوبت رائے نظر، جگر بریلوی، فراق، محروم، منور، رواں، وحشی، اقبال، احسان دانش، جوش ملیح آبادی، جگر مرادآبادی، اثر لکھنوی، عزیز لکھنوی وغیرہ کا کلام بھی زیادہ تر رسالہ زمانہ میں شائع ہوا اور انھیں شہرت نصیب ہوئی۔ اقبال کا قومی ترانہ جگر بریلوی کی پیام ساوتری۔ درگا سہائے سرور کی نظمیں اور پریم چند کے افسانے سب سے پہلے رسالہ زمانہ میں ہی شائع ہوئے۔ اردو ہندی ہندوستانی پر جگر بریلوی اور دوسرے ادیبوں سے نہایت ہی مفصل بحث ہوئی جو صاحب اس بحث کو دیکھنا چاہیں وہ زمانہ کے ان مضامین کو پڑھیں جو ۱۹۳۸ء سے ۱۹۴۱ء تک اردو ہندی ہندوستانی کی بحث کے سلسلے میں شائع ہوئے۔ رسالہ زمانہ کے خاص نمبر رسالہ نگار کی طرح ادب میں ایک اضافہ ہیں۔ پریم چند نمبر، حالی نمبر اور جوبلی نمبر سے اردو کی کوئی لائبریری خالی نہیں ہونا چاہیئے۔ رسالہ زمانہ کے بارے میں، جگر بریلوی 'یادِ رفتگاں' میں فرماتے ہیں۔

" زمانہ کی چالیس سال کی جلدیں ایسے ایسے بلند پایہ مضامین سے بھری پڑی ہیں جو اردو زبان کے لئے گراں بہا دولت ہیں۔ ادب کا کوئی سنجیدہ شعبہ ایسا نہ ہوگا جس پر نہایت پر مغز مضامین نہ موجود ہوں ادب، شعر، تاریخ، مذہب، تہذیب وتمدن، مصوری، موسیقی، سنگتراشی، معاشیات، طبیعیات، اثریات، لسانیات، نفسیات، طنزیات، مضحکات، سیاسیات، فلسفہ اخلاقیات، روحانیت وغیرہ وغیرہ تمام موضوعات پر بڑے بڑے عالموں اور ماہروں نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اگر ایک ایک موضوع پر یہ تمام مضامین اکٹھے

کرکے کتابی صورت میں شائع کیے جائیں تو اردو میں متعدد علوم و فنون پر بہترین تصانیف کا اضافہ ہو جائے اور شاعری اور انشا پردازی کے بیش بہا مجموعے تیار ہو جائیں۔ حق یہ ہے کہ زمانہ نے کیفیت و کمیت دونوں کے اعتبار سے اردو زبان کی ایسی گراں قدر خدمت انجام دی ہے جس کے بار احسان سے وہ کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتی اور جن سے ہمیشہ آئندہ نسلیں استفادہ کرتی رہیں گی۔"

زمانہ فروری و مارچ ۱۹۴۳ء (یادگار نمبر) میں منشی دیا نرائن نگم کی ادبی خدمات پر ڈاکٹر محمد حفیظ، سید ایم اے پی ایچ ڈی ڈی لٹ کا ایک مقالہ شائع ہوا ہے اس میں زمانہ کے سلسلے میں یوں رقم طراز ہیں۔

"چنانچہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ زمانہ کی زندگی ایک آئینہ ہے جس میں بڑی حد تک چالیس برسوں کے درمیانی عرصہ میں واقع ہونے والے تمام ادبی علمی اور لسانی تغیرات کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ زمانہ نے ہر حیات پرور رجحان اور زندگی بخش ادبی اور علمی تحریک کو لبیک کہا اور اس کی نشو و نما میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔۔۔۔۔۔ انھوں نے نہ صرف یہ کہ زمانہ کے صفحات کو نئے خیالات کے طوفان کو روکنے کا اور جدید ادبی کاوشوں کی مخالفت کا منحوس آلہ نہ بننے دیا بلکہ جہاں تک ہو سکا اُن کے اعلیٰ اور بہترین کارناموں کو زمانہ کے صفحات پر نمایاں جگہ دی۔ لیکن ساتھ ہی ان کی زمانہ شناس نظروں سے یہ حقیقت پوشیدہ نہ تھی کہ مستقبل ماضی سے بالکل علیحدہ نہیں کیا جا سکتا اور ماضی ہی کے بطن سے مستقبل کے رجحانات پیدا ہوتے ہیں اس لئے انھوں نے زمانہ کو کبھی کسی نونائیدہ اور فوری جوش کے تحت خواہ مخواہ ماضی کی اچھی چیزوں کی مخالفت کا ذریعہ نہیں بنایا۔"

منشی دیا نرائن نگم کے مضامین رسالہ زمانہ اور مختلف رسالوں میں بکھرے پڑے ہیں وہ کس پایہ کے ادیب تھے چند مضامین کے اقتباسات سے معلوم ہو جائے گا۔

• اخبار نویس ایک معمولی اہل قلم نہیں ہے اس کا رتبہ بہت بلند ہے۔ اس کا درجہ بڑے سے

بڑے مدبر ناموروں سے نامور محب ملک اور مشہور سے مشہور قومی لیڈر سے کسی طرح کم نہیں۔ یہ ضرور ہے کہ اس کا اثر بظاہر اتنا نمایاں نہیں ہوتا اور اس کا رسوخ خاموشی سے بڑھتا رہتا ہے اور سب تعمیری کام کرنے والوں کی طرح اسے بھی ہر وقت اپنی جگہ پر ایثار نفسی کی ضرورت پیش آتی رہتی ہے۔ سچے اخبار نویس کو تحریر میں وزن اور متانت پیدا کرنا ہوگی۔ اسے نکتہ چینی کو ذاتیات سے بالاتر رکھنا پڑے گا۔ رائے زنی میں ہر دلعزیزی حاصل کرنے کی فکر سے آزاد رہنا ہوگا اور حمایت ہو یا مخالفت دونوں میں اسے ہر طرح کے تعصب سے پاک رہنا ہوگا۔ وہ وکالت کرے گا مگر اس کی وکالت میں طرف داری کا شائبہ نہ ہوگا۔ وہ واقعات اور خبروں میں رو رعایت سے کام نہ کرے گا۔ دوسرے کی اختلاف رائے سے بدظن نہ ہوگا اور مخالفین کو اظہار رائے کا پورا موقع دے گا۔"

"سچ ہے خدا کا نام رہتا ہے ہمیشہ کچھ نہیں رہتا ہمارے یہ ہمدرد معاونین جن کو ہم رہ رہ کر یاد کر رہے ہیں۔ ہماری امداد و اعانت کے لئے اس عالم علم و عمل میں موجود نہیں ہیں لیکن ہم کو یقین ہے کہ ان کا روحانی فیض اس وقت بھی ہمارے شامل حال ہے۔ ان کی ہمدردی ان کی دستگیری بے کار نہیں گئی ان کے کارنامے ہمیشہ یادگار زمانہ رہیں گے اور جب تک اردو ادب کا نام و نشان باقی ہے ان کے اعلیٰ خیالات اور پاکیزہ جذبات جو زمانہ کی گذشتہ جلدوں میں محفوظ ہیں عزیزان وطن کے دل و دماغ کو مسرور و منور کرتے رہیں گے اور شائقین ادب ان کے کارناموں کو فخر اور مسرت سے یاد کریں گے، ان کی مثالیں شمع ہدایت کا کام دیں گی ان کے نقش قلم رہنمائی کا فرض ادا کریں گے اور ان کی محنت و محبت کی یادگاریں آیندہ نسلوں کو بھی ملک کی ادبی خدمت پر مائل کرتی رہیں گی۔" (یادرفتگاں)

"ہندو مذہب پر اسلام کا سب سے بڑا اثر یہ پڑا کہ عوام کے عقائد میں توحید کا خیال جو عرصہ سے سست پڑ گیا تھا، پھر زیادہ زور کے ساتھ جاگزیں ہو گیا۔ پورانک ہندوؤں میں بہت سے دیوی دیوتا پوجے جاتے تھے، اور گو شروع ہی سے ہندو مذہب میں ایک قادر مطلق پر متنبہ کا

خیال موجود ہے لیکن دیوی دیوتاؤں کی کثرت نے توحید کو کمزور کر کے اسے بالکل پس پشت ڈال دیا تھا۔ اسلام نے ہندوستان میں آکر خدا کی وحدانیت پر غیر معمولی زور دیا جن کا عام خیالات پر بڑا اثر پڑا۔ چنانچہ تین چار صدی بعد کے ہندو ریفارمروں اور روحانی لیڈروں کی تعلیم میں اس کا پورا ثبوت ملتا ہے ان ریفارمروں نے بعض مذہبی عقائد عمداً ترک کر دئے اور ان کی جگہ جن عقائد کا پرچار کیا ان کی بدولت ہندو مذہب اور اسلام دونوں ایک دوسرے کے قریب تر ہو گئے۔"

"دنیا کے بہت سے آزاد ملکوں میں پریس کی آزادی کو آئینی حیثیت سے باضابطہ طور پر تسلیم کیا گیا ہے۔ ہمارے یہاں بھی ایسا ہی ہونا چاہیئے۔ کیونکہ سیاسی آزادی کی پہلی شرط زبان اور قلم کی آزادی ہے۔ ملٹن تو یہاں تک کہہ گیا ہے کہ خواہ اور کوئی آزادی نصیب ہو یا نہ ہو لیکن معلومات حاصل کرنے کے مطالب ادا کرنے اور ضمیر کے مطابق دلائل پیش کرنے کی سب کو پوری آزادی ہونی چاہیئے۔ سر چارلس مٹکاف سو سال سے زائد ہوئے یہ لکھ گئے ہیں کہ پریس کی آزادی کے فوائد اس کے مضر نتائج سے کہیں زیادہ ہیں۔ اظہار رائے کی آزادی انسان کے ازلی حقوق میں داخل ہے۔ یہ کوئی رعایت نہیں بلکہ انسانی حق ہے۔"

(خطبۂ صدارت اردو پریس کانفرنس)

تعلیمی مسائل

تربیتِ جسمانی

تعلیم کے میدان میں تربیتِ جسمانی کی اصطلاح یوں تو برابر استعمال ہوتی ہے لیکن اکثر و بیشتر اس کے مفہوم کی اہمیت کا اندازہ کئے بغیر ہی اُسے برتا جاتا ہے۔ بہت سے لوگوں کے نزدیک تربیتِ جسمانی کے معنی ورزش اور کھیل کود کے سوا کچھ نہیں بعض حضرات تربیت جسمانی (فزیکل ایجوکیشن) تفریحی مشاغل کی تعلیم (ریکری ایشن ایجوکیشن) اور تعلیم صحت (ہیلتھ ایجوکیشن) کی علیحدہ علیحدہ تشریح و تفریق مناسب خیال کرتے ہیں۔ تربیتِ جسمانی سے عموماً جسمانی کھیل، کسرت، تیراکی وغیرہ کی واقفیت و تربیت مراد لی جاتی ہے اور تفریحی مشاغل کے تحت وقت گذاری کے مناسب استعمال پر زور دیا جاتا ہے تاکہ کاہلی و سستی دُور ہونے کے ساتھ ساتھ ذہنی سکون بھی میسر آسکے۔ تعلیم صحت کے دائرے میں صحت کا درس، صحت مند ماحول کی واقفیت، تندرست و توانا رہنے کی معلومات و ہدایات اور جسم کو اچھی حالت میں رکھنے کے ذرائع اور مواقع وغیرہ شامل ہیں اور بلاشبہ اس کا مفہوم حفظانِ صحت سے کہیں زیادہ ہے جسے ایک نئے مضمون کی حیثیت سے اعلیٰ تعلیم کے نصاب میں بھی داخل کرلیا گیا ہے۔ اسی طرح اس دورِ ترقی میں 'تفریحی مشاغل' نہ محض تفریحی حیثیت رکھتے ہیں اور نہ وہ صرف 'مشغلہ' ہیں۔ آج فکرِ انسانی کی بدولت رفتارِ زمانہ غیر معمولی طور پر بڑھ گئی ہے۔ دنوں کا کام لمحوں میں انجام پانے لگا ہے۔ ایک مشین بہت سے مزدوروں اور کاریگروں کا نعم البدل ہوجاتی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ مادی وسائل کی فراوانی کے ساتھ وقت کی بچت میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے اب ایک ملک کی معاشی خوش حالی کا اندازہ ہفتے بھر میں کام کے دنوں کی تعداد سے لگتا ہے۔ کام کا ہفتہ چھ دن کے بجائے پانچ دن اور اس سے بھی کم ہوتا جارہا ہے۔ اس صورت

میں خالی وقت کو مفید طور پر استعمال کرنے کے لئے پوری توجہ اور رہنمائی درکار ہے۔ لیکن یہ تینوں علوم درا صل تربیتِ جسمانی کے تین رُخ ہیں۔ تربیتِ جسمانی کسی ایک عمل کا نام نہیں ہے اور نہ اسے کسی مخصوص نوعیت کی دلچسپیوں تک محدود سمجھنا چاہیے۔ تربیتِ جسمانی بجائے خود ذہنی تربیت کا سبب بن سکتی ہے۔ تربیتِ جسمانی، فوجی تربیت یا اس کا بدل بھی نہیں ہے۔ وہ پورے تعلیمی عمل کا ایک لازمی جزو ہے۔ ایک طرف وہ خالص علمی کاموں کے ہم پلّہ ہے اور دوسری طرف ہاتھ کے کام کے ساتھ بھی اس کا قریبی تعلق ہے۔ اس کی حیثیت تعلیم کے ایک مخصوص باب کی ہے جہاں مشاغل کو تعلیمی مقاصد کے تحت منتخب کیا جاتا ہے۔ تربیتِ جسمانی کا مقصد ہر ایک فرد کو امکانی صحت و توانائی عطا کرنا ہے۔

تعلیمِ صحت کو قومی صحت کے پروگرام کی بنیاد سمجھنا چاہیئے۔ ہمارا بہت کچھ دکھ درد ناواقفیت کی بنا پر ہوتا ہے کیونکہ ہم حفظانِ صحت کے عام اصولوں سے عموماً بے خبر رہتے ہیں تعلیمِ صحت کے اہم نکات میں جسمانی صفائی ستھرائی، آس پاس کی صفائی، چھوت کی بیماریوں کی روک تھام، معقول غذا، ورزش، والدین کی تربیت اور بچوں کی دیکھ بھال وغیرہ باتیں شامل ہیں۔ اس پروگرام کو چلانے کے لئے ۱۹۵۶ء میں ڈائریکٹریٹ جنرل آف ہیلتھ سروسیز کے تحت ایک سنٹرل ہیلتھ بیورو قائم کیا گیا تھا پھر مرکز کی پیروی میں متعدد ریاستوں نے بھی اپنے اپنے 'بیرو' قائم کئے۔ دوسرے قومی پنج سالہ منصوبے کے دوران میں تربیتِ جسمانی کی طرف کافی توجہ دی گئی۔ ۱۹۵۷ء سے گوالیار میں لکشمی بائی کالج آف فزیکل ایجوکیشن' قائم ہوا۔ یہ اپنی نوعیت کا پہلا کالج ہے جہاں سہ سالہ سندی نصاب جاری کیا گیا ہے اور اعلیٰ تعلیم و تحقیق کے انتظامات کا بھی خیال رکھا گیا ہے۔ لوگوں کو اپنی صحت بہتر بنانے کی ترغیب دلانے کے لئے ۱۹۵۹، ۶۰ء میں قومی صحتِ جسمانی کے معیار کی مہم ' (نیشنل فزیکل ای فیشینسی ڈرائیو) کا آغاز کیا گیا۔ علاوہ ازیں متعدد دوسرے مرکزی پروگرام شروع کئے گئے جن کے تحت دیسی کسرت کے طریقوں کو فروغ دینے، پہلوانوں کے اکھاڑوں کی مدد کرنے اور اسی طرح کے دوسرے کاموں کو ترقی دینے کا سلسلہ شروع ہوا۔ کھیل کود کے میدان میں ہندوستان کا جھنڈا بلند کرنے کی غرض سے دوسرے

قومی منصوبے کے اختتام پر پٹیالہ میں نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف اسپورٹس قائم کیا گیا تاکہ مختلف کھیلوں کی تربیت دینے والے استاد (کوچ) تیار کئے جا سکیں۔ مرکزی سرکار مدرسوں میں کھیل کے میدان تیار کرنے اور کھیل کا سامان فراہم کرنے کے لئے بھی امداد دیتی ہے۔ نومبر میں بھارت اسکاؤٹس اینڈ گائیڈس کے نام سے دیس بھر کے لئے اسکاؤٹنگ کی ایک تنظیم وجود میں آئی۔ اسکاؤٹنگ کی تحریک کی روایات بڑی شاندار ہیں اور وہ طلبہ طالبات میں بے لوث خدمت، ایثار اور ضبط نفس کے جذبے کو فروغ دینے کا ایک موثر ذریعہ ثابت ہوئی ہے۔ تحریک کی تنظیمی اصلاح سے اس کا کام بھی خوب آگے بڑھا ہے۔ تیسرے قومی منصوبے میں اس تحریک کو دیہات کے اندر بھی رائج کرنے کا پروگرام بنایا گیا ہے۔ آزادی کے بعد قائم ہونے والی مہاجرین کی بستیوں میں طلبہ کے اندر قدرتی طور پر بے راہ روی کے مظاہر وں نے شدت اختیار کی۔ ضبط کی حالت کو سدھارنے کے لئے بحالی کی مرکزی وزارت کی طرف سے ۱۹۵۴ء میں ضبط کی قومی اسکیم (نیشنل ڈسپلین اسکیم) شروع کی گئی۔ اس اسکیم نے کچھ ایسی کامیابی حاصل کی کہ پھر اُسے سارے ملک میں رائج کرنے کا فیصلہ کر لیا گیا۔ ۱۹۵۷ء سے یہ اسکیم مرکزی وزارت تعلیم کے اندر ایک ڈائریکٹریٹ کے ماتحت آگئی ہے۔ اب یہ اسکیم سارے دیس کے لئے ہے جس کے ذریعے بچوں اور نوجوانوں کی صحت کو بہتر بنانے، ان کے کردار کو بلند کرنے، شخصیت کو ابھارنے، تہذیبی ذوق کی تربیت دینے اور انتظام کے معمولی طریقوں سے واقفیت پیدا کرانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس اسکیم کے تحت تربیت پانے والے اساتذہ کی تعداد دو ہزار کے قریب پہنچ چکی ہے۔ تیسرے قومی منصوبے کے دوران میں تین مرکزی تربیتی ادارے قائم کرنے کا خیال ہے۔ کچھ عرصہ ہوا ایک مرکزی تربیتی ادارہ الور میں قائم کیا جا چکا ہے جہاں پر پانچ سو استاد تربیت حاصل کرتے ہیں۔ تعلیم کے مرکزی مشاورتی بورڈ (سینٹرل ایڈوائزری بورڈ آف ایجوکیشن) کی سفارش پر طلبہ کے لئے دو تجاویز طے پائی ہیں۔ پہلی تجویز کے مطابق مدرسوں اور کالجوں کے طلبہ دس دن سے لے کر تیس دن تک دیہات کے اندر 'یوتھ کیمپ' میں گذارتے ہیں۔ جہاں سماج سیوا کے کاموں میں ہر ایک سے روزانہ چار گھنٹے محنت و مشقت بھی کرائی

جاتی ہے تاکہ طلبہ میں ذوقِ خدمت پیدا ہو اور وہ اپنے دیس کی دیہاتی زندگی سے بھی واقف ہو جائیں
یہ کیمپ یونیورسٹیاں، ریاستیں، بھارت اسکاؤٹس اینڈ گائڈس، بھارت سیوک سماج اور دوسرے
رفاہِ عام کا کام کرنے والی انجمنیں چلایا کرتی ہیں اور ان کے تمام اخراجات مرکزی سرکار برداشت کرتی ہے
دوسرے قومی منصوبے کے دوران میں تقریباً ساڑھے پانچ سو کیمپ لگے جن میں تقریباً پانچ لاکھ طلبہ شریک
ہوئے اور لگ بھگ ایک کروڑ بیس لاکھ روپیہ خرچ ہوا۔ دوسری تجویز یونیورسٹیوں، کالجوں اور مدرسوں
میں تفریحی مشاغل کی سہولتیں فراہم کرنے سے متعلق ہے۔ اس کے ذریعے اسٹیڈیم، جمنیزیم، تیراکی کے لئے
تالاب، تفریح کے لئے ہال، وغیرہ تعمیر کرائے جاسکتے ہیں۔ شرط صرف یہ ہے کہ طلبہ اور اساتذہ اپنے عملی تعاون
سے ۵ فیصدی اور ادارہ ۲۵ فیصدی اخراجات پورا کرنے کی پوری ذمہ داری لے۔ طلبہ کے خالی اوقات کو
کارآمد بنانے اور انھیں ذہنی سکون پہنچانے کی غرض سے بھی مختلف طریقے اختیار کئے گئے ہیں جن میں یونیورسٹیوں
کا سالانہ یوتھ فیسٹول، ڈرامے کی تربیت کا انتظام، تعلیمی سیر کے لئے امداد اور یوتھ ہوسٹل وغیرہ شامل ہیں
طلبہ کی فوجی تربیت کی غرض سے نیشنل کیڈٹ کور، اور دوسری متعلقہ تنظیمیں قائم کی گئی ہیں۔ چھوٹے بچوں
کی تفریح کا سامان مہیا کرنے کے لئے "بال بھون" تجویز کئے گئے ہیں۔ اس سلسلے میں دہلی کے "بال بھون"
کے ساتھ بچوں کا ایک قومی عجائب گھر بھی قائم کیا جائے گا۔

دوسرے قومی منصوبے کے اختتام پر ۴ کروڑ ۴ لاکھ بچے مدرسوں میں داخل تھے۔ تیسرے
منصوبے میں تقریباً دو کروڑ بچوں کا اضافہ ہو جائے گا اور منصوبے کے آخر میں چھ سال سے لے کر گیارہ سال
تک کے تقریباً ۵ کروڑ بچے مدرسوں میں تعلیم حاصل کر رہے ہوں گے۔ اتنے بہت سے بچوں کی صحت کا سوال
نہ صرف بذاتِ خود اہمیت رکھتا ہے بلکہ قومی صحت کا ایک اہم جزو بھی ہے۔ دوسرے منصوبے کے آخر میں
اسکول ہیلتھ کمیٹی نے اپنی رپورٹ پیش کی جس میں بتایا کہ مدرسے کے بچوں میں خرابی صحت اور بیماری کی زیادتی
کی وجہ ناموزوں اور کم غذا ہے۔ اس کمیٹی نے تجویز کیا کہ تیسرے منصوبے میں مدرسوں میں تعلیم پانے والے بچوں
کی صحت کی طرف ضرور توجہ کی جائے جس میں پینے کے صاف پانی اور گندگی و نجاست سے بچنے کے انتظام
طبی معائنے اور اساتذہ کی تعلیم صحت سے متعلق تربیت کا ذکر خاص طور پر کیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں ابتدائی

مدارس کے ان بچوں کے لئے دوپہر کے کھانے کا انتظام کرنے کی پُرزور سفارش کی گئی ہے۔ اسکول ہیلتھ کمیٹی کی ان سفارشات پر غور کرنے کے لئے ابتدائی تعلیم کی مرکزی کونسل (آل انڈیا کونسل فار ایلیمنٹری ایجوکیشن) کے چیئرمین نے ایک جائزہ کمیٹی (اسٹڈی گروپ) مقرر کردی تھی جس کی تجاویز کونسل کے چھٹے اجلاس منعقدہ ۲۳ اکتوبر ۱۹۶۲ء میں پیش کی گئیں یہ تجاویز بالخصوص ابتدائی مدرسوں کے اندر انتظاماتِ صحت کو بہتر بنانے اور بچوں کو دوپہر کا کھانا مفت مہیا کرنے سے تعلق رکھتی ہیں۔ اس موقع پر مرکزی وزارتِ تعلیم کے مُبَشّر نے اپنی رپورٹ میں بتایا کہ مرکزی وزارتِ تعلیم نے اس سلسلے میں دو اہم سفارشات کو منظور بھی کر لیا ہے یعنی نیشنل اسکول ہیلتھ کونسل کا قیام اور تیسرے قومی منصوبے کے اختتام تک کم سے کم ایک کروڑ بچوں کے لئے دوپہر کے کھانے کا مفت انتظام۔ اس وقت دوپہر کے کھانے کی اسکیم صرف کیرالا، مدراس، آندھرا پردیش، راجستھان، اور پنجاب کی ریاستوں میں جاری ہے اور اس سے تقریباً پچاس لاکھ بچے مستفید ہو رہے ہیں۔ اس کام کے لئے مرکزی سرکار نے ریاستوں کو علیحدہ سے کل اخراجات کی ایک تہائی رقم بھی دینے کا اعلان کیا ہے۔ یہ قدم نہایت مبارک ہے لیکن اس طرح ابتدائی مدارس میں تعلیم پانے والے بچوں کے صرف پانچویں حصے کا مسئلہ حل ہوتا ہے۔ قومی صحت کے پروگرام کا تقاضا ہے کہ کسی نہ کسی طور پر تمام مدرسوں میں انتظاماتِ صحت کو معقول بنایا جائے اور ابتدائی تعلیم پانے والے سب ہی بچوں کو مدرسے کے اندر دوپہر کے وقت مناسب اور صحت بخش غذا فراہم ہو۔ بلکہ ثانوی مدارس اور اعلیٰ تعلیم کے اداروں میں بھی طلبہ کے قیام و طعام کی حالت کو سدھارنے کی شدید ضرورت ہے۔ دارالاقاموں کے اندر کھانے کا انتظام عام طور پر بڑی لاپرواہی کے ساتھ انجام پاتا ہے۔ خوراک کا کوئی معیار نہ مقرر کیا گیا ہے اور نہ اُسے طبّی نقطۂ نگاہ سے کوئی دیکھتا ہے۔ اس سلسلے میں غذائیت کا لحاظ رکھ کر علاقائی ضرورتوں کو مدِّنظر رکھتے ہوئے کھانے کا ایک قومی معیار قائم ہونا چاہیئے تاکہ طلبہ کی صحت درست رہے اور انھیں اپنے کھانے پینے کی عادتوں کو سدھارنے کا موقع نصیب ہو۔ اس کے علاوہ اداروں کے اندر ریستوران، چائے خانوں اور ناشتہ گھروں میں انا پورنا کی طرح صرف کم قیمت اور اچھی مقررہ چیزیں ہی دستیاب ہوں۔ اس باب میں اگر مالی امداد بھی کرنی پڑے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ طلبہ کی رہائش کا مسئلہ بالخصوص اعلیٰ تعلیم کے اداروں میں اور زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ دارالاقاموں کی کمی نہ صرف طلبہ کے اخراجات بڑھاتی ہے، انھیں گندی بستیوں میں رہنے پر مجبور کر دیتی ہے بلکہ ان کی صحت بھی بگڑتی ہے، ان کے اخلاق و کردار پر بھی مُضر اثرات پڑتے ہیں اور مجموعی طور پر ان کی تعلیمی حالت خراب ہو جاتی ہے۔

موجودہ ہنگامی حالات کے آئینے میں تربیتِ جسمانی کی ضرورت واہمیت اور زیادہ واضح طور پر ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ دنیا واقف ہو کہ سیاست کو صداقت سے کوئی علاقہ نہیں ہوا کرتا۔ وہاں تو صرف حکمت عملی کا سکہ رائج ہوتا ہو۔ آج چین محسن کشی پر آمادہ ہو اور انسانیت سوز رویہ اختیار کئے ہوئے ہے۔ کل کسی اور کا دماغ خراب ہو سکتا ہو۔ ہم دوسروں کی نیت کے ذمہ دار نہیں بن سکتے لیکن اپنے آپ کو چاق و چوبند ضرور رکھ سکتے ہیں ہمارے تعلیمی نظام میں تربیتِ جسمانی کے مختلف پہلوؤں پر پوری توجہ ہونی چاہیئے کھیل کود، ورزش اور فوجی تربیت تمام طلبہ کے لئے لازمی ہو اور ان کا مرتبہ ایک خالص تعلیمی مضمون سے کسی طور پر کم نہ ہے۔ آج ہمارے اداروں میں طلبہ کی انجمنیں محض سیاسی شورش میں تضیع اوقات کرتی رہتی ہیں۔ جس قدر بڑا ادارہ ہوتا ہو اسی قدر طلبہ کی ہنگامہ آرائی زور پر ہوا کرتی ہو۔ لہذا ان انجمنوں کی جگہ مختلف تعلیمی، تفریحی اور تہذیبی مشاغل کے کلب کو دینی چاہیئے۔ تربیتِ جسمانی کی اس تنظیم سے طلبہ کو اپنا وقت بہتر طور پر گذارنے کا موقع ہاتھ آئے گا اور ان کی ذہنی وجسمانی نشوونما بخوبی ہو سکے گی۔ اس وقت بجا طور پر مرکزی حکومت نے طلبہ کے لئے فوجی تربیت لازمی کرنے کا فیصلہ کر دیا ہے۔ اگرچہ یہ قدم محض وقتی مصالح کے تحت اٹھایا گیا ہے لیکن اس کو تربیتِ جسمانی کے ایک اہم جزو کی حیثیت سے دیکھنا چاہیئے۔ فوجی تربیت کے ساتھ ساتھ اداروں میں کھیل کے میدان اور کھیل کود کی دیگر سہولتیں فراہم کرنے کی طرف بھی خاص توجہ درکار ہے۔ دراصل تربیتِ جسمانی کا ایک جامع اور صالح نظریہ ہی ہماری تعلیم کو پورے طور پر مفید و موثر بنا سکتا ہے۔ اس کام کو قومی پیمانے پر کرنے کی ضرورت ہے اور سماج سدھار کے کاموں میں اسے سب سے اہم مقام حاصل ہونا چاہیئے۔ تیسرے منصوبے میں تعلیم صحت کی واقفیت کی فراہمی اور صحت کے متعلق نمائش واشاعت پر زور دیا گیا ہے۔ لیکن تعلیمی اصول اور وقت کا سکھایا ہوا سبق آج اس معاملے میں ہم سے کہیں زیادہ توجہ چاہتا ہو۔ دیس بھر میں تعلیم صحت کا ایک مستحکم نظام قائم ہونا چاہیئے اور تربیتِ جسمانی کے کام کو تعلیمی و ملکی ضرورت سمجھ کر کرنا چاہیئے۔ اسی میں ہماری اور ہمارے دیس کی فلاح و بہبود کا راز پوشیدہ ہے۔ تن پاک من پاک!

'معلّم'

تعارف و تبصرہ

(تبصرہ کے لئے ہر کتاب کے دو نسخے بھیجے جائیں)

حدیث دل از غلام ربانی تاباں

تاریخ طباعت: دوسری بار ۱۹۶۲ء۔ قیمت: ۲/۲۵ پتہ: مکتبہ جامعہ نئی دہلی ۲۵

ہمارے شعر و ادب کے نقاد اس سے متفق ہوں یا نہ ہوں مگر میرا خیال ہے کہ ادب کے ہر دور کے ساتھ ایک ذیلی دور یا اس دور کا تتمہ بھی ہوتا ہے جو اپنے ماقبل دور کے مانند بھی ہوتا ہے اور اس سے ممتاز بھی خصوصاً اس زمانے میں جبکہ مسائل تہذیب اور اقدارِ حیات پہلے کے مقابلے کہیں جلد بدل جاتے ہیں۔ مثلاً فانی، یگانہ اور جگر کے بعد غزل گو شعرا کا ایک اور دور ہے جس میں فراق اور چند دیگر شعرا کو شمار کرنا چاہیئے۔ اور اسی طرح اس دور سے ملا ہوا ایک طبقہ ان شعرا کا ہے جس میں تاباں جذبی اور فیض کو شامل کرنا چاہیئے۔ تاباں اس آخرالذکر دور کے ایک اہم غزل گو شاعر ہیں جنھوں نے غزل کی حسین روایات کو برقرار رکھتے ہوئے زندگی کے جدید تقاضوں کو اس میں اس طرح سمو دیا ہے کہ اس سے غزل کا حسن دوبالا ہو گیا ہے۔ ان کی غزل میں نہ فن کی حسین اور ضروری پابندیوں سے فرار ہے اور نہ مسائل حیات سے۔ انھوں نے ان مختلف عناصر کو اپنے ذوقِ جمال اور مذاقِ عالی سے ہم آہنگ کر کے حسین سے حسین تر بنا دیا ہے۔ ان کے اشعار میں حسن کی محفلوں کے غمزہ و ناز اور خلوتوں کے راز و نیاز کا نظارہ بھی کیا جا سکتا ہے اور عاشقوں کے نغمہ ہائے وصال اور نالہ ہائے فراق بھی سنے جا سکتے ہیں۔ ان کے اتحاد سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ حسن و عشق اور جنون و خرد کی ہر منزل سے نہایت ہوش و حواس کے ساتھ گزرے ہیں۔ ایک ایک پھول اور ایک ایک خار سے سرگوشیاں

کی ہیں اور ایک ایک قدرے کی دل کی دھڑکن کو غور سے سنا ہے اور پھر ان واردات وکیفیات کو بڑے حسن اور سلیقے سے بیان بھی کر دیا ہے۔ وہ بقول خود "میکدے کی اصطلاحوں" میں بہت کچھ کہہ جاتے ہیں اور اس لئے "دستورِ زبان بندی" بھی ان کی راہ میں حائل نہیں ہو سکتا۔

تاباںؔ الفاظ کے انتخاب میں بڑے محتاط واقع ہوئے ہیں اور اس کا انھیں پورا سلیقہ ہے۔ یہ بات ایک شاعر کے لئے جتنی ضروری ہے اتنی ہی دشوار بھی ہے۔ ہماری غزل میں بعض مضامین اتنے فرسودہ اور پامال ہیں کہ اب ان میں بالکل جان نہیں رہی ہے مگر پھر بھی بعض اوقات شاعر کو ان سے گریز ممکن نہیں ہوتا لیکن انھیں نیا کر کے بیان کرنا بھی ممکن نہیں ہوتا ہے شاعر کی ندرت بیان اور قوتِ اختراع کا ایسے ہی موقعوں پر امتحان ہوتا ہے۔ مثلاً فصل بہار کی آمد اور جنوں کے تعلق پر اردو شاعری میں ہزاروں شعر مل جائیں گے اور اب اس مضمون کو کسی نئے انداز میں کہنا محال معلوم ہوتا ہے مگر تاباںؔ کا شعر سنئے اور ان کی ندرت بیان کا اندازہ کیجئے۔

اُدھر چمن میں زرِ گل لُٹا اِدھر تاباںؔ
ہماری بے سر و سامانیوں کے دن آئے

اسی طرح ان شعروں کو ملاحظہ فرمایئے کہ کتنے فرسودہ مضامین میں کتنی تازگی پیدا کر دی ہے۔

مری جامہ دری نے راز یہ کھولا زمانے پر
خرد دھوکے دیا کرتی ہے جیب و آستیں بن کر

ملی ہے دل کو کسی شوخِ فتنہ ساماں سے
وفا گماں کی صورت جفا یقیں کی طرح

میں نے ان چند سطروں میں قصداً مثالوں اور انتخابِ اشعار سے گریز کیا ہے کیونکہ نہ مجھے معلّمی اور تنقید کا سلیقہ ہے اور نہ رسوائی کا خوف لیکن جو بھی "حدیثِ دل" کا مطالعہ کرے گا وہ اس مختصر مجموعے میں بہت سے نادر اور بے مثال اشعار پائے گا اور میری طرح محسوس کرے گا کہ اس میں بہت سے اشعار ایسے ہیں جو براہِ راست دل پر چوٹ مارتے ہیں اور میں شاعری میں علم و آگہی سے

زیادہ دل کی چوٹ کو اہم سمجھتا ہوں اور اس کو فن کی بلندی کا سب سے بڑا معیار سمجھتا ہوں۔

میرے خیال میں شاعری میں تقلید کی نقالی سے زیادہ اہمیت نہیں ہے اس لئے میں تازہ واردان بساطِ شاعری کو تاباںؔ کی تقلید کا مشورہ تو نہ دوں گا مگر میں سمجھتا ہوں کہ تاباںؔ کی غزل آئندہ نسلوں کے لئے ایک مثال اور مشعل کا کام دے گی اور ان کی غزل کو اس کے ثبوت میں پیش کیا جا سکے گا کہ کلاسیکل انداز کو برقرار رکھتے ہوئے جدید اقدارِ حیات کو کس طرح پیش کیا جا سکتا ہے۔

در کفے جامِ شریعت در کفے سندانِ عشق
ہر ہوسناکے نداند جام و سنداں باختن

آخر میں یہ گزارش بے محل نہ ہوگی کہ میں ناقد نہیں ہوں اور نہ مجھے اس کا سلیقہ ہے۔ میں نے ایک شاعر کی طرح حدیثِ دل کا مطالعہ کیا ہے اور جتنا اس سے متاثر ہوا ہوں اسے بھی احتیاطاً اور مصلحتاً کچھ کم کرکے ظاہر کر دیا ہے۔ (میکش اکبرآبادی)

آج کل (فن تعمیر نمبر) مدیر مسئول: بال مکند عرش ملسیانی: اسسٹنٹ ایڈیٹر: مظفر شاہ

قیمت، ایک روپیہ۔ پتہ: پبلیکیشنز ڈویژن، پوسٹ بکس ۲۰۱۱ - دہلی ۶

یہ ایک افسوسناک حقیقت ہے کہ اردو میں ہندوستانی فن تعمیر پر کوئی اچھی اور جامع کتاب نہیں ہے اور اس سے زیادہ افسوسناک بات یہ ہے کہ اس موضوع پر اردو میں لکھنے والے بہت کم ہیں۔ بڑی خوشی کی بات ہے کہ آج کل نے ہندوستانی فن تعمیر پر مخصوص نمبر شائع کرکے اردو ادب کی ایک بڑی اہم ضرورت کو پورا کیا ہے۔ اگرچہ یہ شمارہ بہت ضخیم نہیں ہے، مگر موضوعِ زیر بحث کے تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے۔ متعدد تصاویر سے، جن میں مکتیشور مندر (بھوبنیشور) اور موتی مسجد (لال قلعہ دہلی) کی رنگین ہیں۔ اس نمبر کے افادے میں اور اضافہ ہو گیا ہے۔

(ع ل ا)

کوائف جامعہ

شیخ الجامعہ صاحب کی تقریر

۲۹ر اکتوبر کو حسب معمول جامعہ کا یوم تاسیس منایا گیا۔ صبح کو سب سے پہلے شیخ الجامعہ صاحب نے جامعہ کا پرچم لہرایا اور بچوں نے جامعہ کا ترانا پڑھا۔ اس کے بعد ایک عام جلسہ منعقد ہوا جس میں جامعہ کے مختلف پہلوؤں پر مضامین پڑھے گئے۔ آخر میں جناب شیخ الجامعہ صاحب نے تقریر کی، جو ذیل میں درج کی جاتی ہے۔)

آج جامعہ کا یوم تاسیس ہے، وہ دن جب ہمیں اپنے کاموں کا جائزہ لینا چاہیئے اور دیکھنا چاہیئے کہ ہم نے کہاں تک اپنے ارادوں کو اور ان امیدوں کو جو لوگوں کو ہم سے ہیں پورا کیا ہے۔ یہ تعلیم کا کام کبھی ختم نہیں ہوتا، اس کام کو کرنے والوں کا فرض ہے کہ ہمیشہ نئی باتیں سوچتے رہیں۔ جن سے تعلیم بہتر ہو سکے، دوسری طرف قوم اور حکومت کو دیکھتے رہنا چاہیئے کہ تعلیم کس حد تک ضرورتوں کو پورا کر رہی ہے اور اسے کس طرح کی مدد ملنی چاہیئے۔ آپ لوگوں کو معلوم ہے کہ اس سال ۱۲ جون کو حکومت نے جامعہ کو اعلیٰ تعلیم کا ادارہ مان لیا ہے، اور اب ہمارا تعلق زیادہ تر یونیورسٹی گرانٹس کمیشن سے رہے گا جامعہ کو اب تک حکومت سے مدد ملتی رہی ہے، مگر کام کو بڑھانے اور بہت سی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے لازمی تھا کہ جامعہ کو یا تو قومی اہمیت رکھنے والے ادارے یا یو جی سی ایکٹ کے ماتحت اعلیٰ تعلیم کے ادارے کی حیثیت دی جائے۔ اب آخر نومبر میں ایک کمیٹی ہمارے منصوبوں پر غور کرے گی اور اس کی سفارشوں کے مطابق ہمیں اپنے کاموں کو مضبوط کرنے اور بڑھانے اور دشواریوں اور تکلیفوں کو دور کرنے کے لئے امداد ملے گی۔

مگر جو سپاہی کا پیشہ اختیار کرتا ہے وہ جنگ کے میدان کو اپنا گھر بنا تا ہے ہم ۱۹۲۰ء سے ۱۹۴۷ء تک اپنے طریقہ پر آزادی کی جدوجہد میں شریک رہے۔ یہ لڑائی ختم ہوئی تو ہم یہ معلوم کرنے کی فکر میں پڑ گئے کہ آزاد

ہندوستان میں ہماری حیثیت کیا ہوگی۔ اس لئے نہیں کہ ہمیں خدمت کے بدلے میں کچھ لینا تھا، بلکہ اس وجہ سے کہ اس کے بغیر ہمارے کاموں میں مضبوطی نہیں پیدا ہوسکتی تھی۔ اب جو یہ بات طے ہوگئی تو ہمارے اوپر نئی تعلیمی ذمہ داریاں آگئی ہیں۔ آج ان ذمہ داریوں کو بیان کرنے کی خاص ضرورت ہے۔ اس لئے کہ ہمارے ملک پر ایک دشمن نے حملہ کیا ہے، اور ہمیں اس دشمن کا اس طرح مقابلہ کرنا ہے کہ اس کے بعد ہر دشمن کا ہر طریقے سے مقابلہ کر سکیں۔ اب تک ہم نے یہ سمجھا تھا کہ ہم کسی سے عداوت نہیں برتیں گے تو ہم سے کوئی عداوت نہیں برتے گا اور ہم کسی سے دوستی کرنا چاہیں گے تو ہم سے بے مروتی نہیں کی جائے گی۔ مگر چین کے رویے نے ثابت کیا ہے کہ ہمارا خیال غلط تھا تو اس کا غم نہیں۔ ہمارا اصول کہ جہاں تک ہو سکے صلح پسندی سے کام لینا چاہیئے صحیح تھا اور اس کے سوا اور کوئی اصول صحیح مانا نہیں جا سکتا۔ ہم اب تک یہ بھی سمجھتے تھے کہ ہمیں سب سے پہلے غریبی، جہالت، سماجی بے انصافیوں کا مقابلہ کرنا ہے، لیکن میدان جیتنے کے گر ہم نے نہیں سیکھے۔ اس میدان میں ہم کو اپنی کوششیں جاری رکھنا ہے، لیکن تعلیم کا اب مقصد یہ ہوگا کہ جنگ کے میدان کو ہر دوسرے منصوبے کے لئے ایک مثال بنا دے۔

یہ میرے بتلانے کی بات نہیں ہے آپ نے اپنے تجربے سے معلوم کیا ہوگا کہ گھبراہٹ میں کام خراب ہوتا ہے، اور جتنا بڑا کام ہو اتنا ہی زیادہ خراب ہوتا ہے۔ آپ نے یہ بھی دیکھا ہوگا کہ بہت مشورہ کیا جائے تو کوئی فیصلہ نہیں ہو پاتا۔ ہم یہ نہیں سوچتے کہ جو قاعدہ بنایا یا حکم دیا گیا ہے اس کی خوبی یا خرابی اس پر عمل کرنے سے ہی معلوم ہو سکتی ہے۔ ہم یا تو اس پر بحث کرتے ہیں کہ قاعدہ بنانے یا حکم دینے والے کو اس کا ادھیکار تھا یا نہیں، یا خود قاعدے یا حکم میں عیب نکالتے ہیں۔ ہم میں سے بہت کم یہ سوچتے ہیں کہ جس بات میں ہمیں اپنا نقصان معلوم ہوتا ہے اس سے دوسروں کو اور مجموعی حیثیت سے سماج کو کتنا فائدہ پہنچ رہا ہے، اور ہمیں اس فائدے کا زیادہ خیال کرنا چاہیئے یا اپنے نقصان کا۔ دراصل انسان کی تاریخ سے یہ بات ثابت ہے کہ بڑے مقصد کو حاصل کرنے کے لئے بہت سے چھوٹے مقصدوں کو قربان کرنا ہوتا ہے، سوال صرف یہ ہوتا ہے کہ یہ قربانی زبردستی کرائی جائے یا لوگ اسے لازمی سمجھ کر خود قبول کریں۔ تاریخ سے یہ بھی ثابت ہے کہ کامیاب وہ ہوتا ہے جو اپنے کام کو جانتا ہے، کوئی سپہ سالار

اس وجہ سے لڑائی نہیں جیتتا کہ وہ اچھا آدمی ہے یا اچھے مقصد کے لئے لڑتا ہے۔ کامیاب وہ سپہ سالار ہوتا ہے جو لڑائی کے فن کو خوب جانتا ہو، اس کے اصولوں اور طریقوں سے جیسی مصلحت ہو کام لے سکے اور جس کی پشت پر ایک متحد قوم ہو۔ اب سوچئے کہ انھیں چند باتوں سے کیا کیا نتیجے نکلتے ہیں۔

آدمی گھبراتا اس وقت ہے جب کوئی ایسی بات ہو جائے جس کے لئے وہ تیار نہ ہو۔ آپ آج ارادہ کر لیجئے کہ آپ خود کو ہر صورت حال کے لئے تیار کر لیں گے۔ کچھ مشورے میں بھی دے سکتا ہوں۔ جنگ کی تاریخ اور آج کل جنگ کا جو طریقہ ہے اس کے بارے میں جتنی کتابیں مل سکیں پڑھیئے۔ ممکن ہے آپ کی اس محنت کو ہم آپ کی کارگذاری میں شامل کر سکیں، ممکن ہے نہ کر سکیں نصاب کو بدلنے میں بہت دیر لگتی ہے، آپ واقف کار شہری بننے کے لئے اس کا انتظار نہیں کر سکتے۔ آپ کو کتابیں چاہئیں تو کچھ میرے پاس ہیں، کچھ کا پتہ میں بتا سکتا ہوں، کچھ مول لے کر خریدیئے۔ اس سے ایک فائدہ یہ ہوگا کہ آپ طے کر سکیں گے کہ ضرورت پڑنے پر آپ کون سا کام اپنے ذمے لے سکیں گے۔ نوجوان فوج میں بھرتی ہو سکتے ہیں، زیادہ عمر کے لوگ فوج میں بھرتی ہونے والے جو کام کر رہے ہیں ان میں سے مناسب کام اپنے ذمے لے سکتے ہیں سول ڈفنس میں شریک ہو سکتے ہیں، پروپیگنڈا کر سکتے ہیں۔ میں تو چاہوں گا کہ طالب علموں میں سے ہر ایک، اور خاص طور سے لڑکیاں، بندوق چلانے کی مشق کریں، وہ نقشے کو سامنے رکھ کر قزاقانہ جنگ (GUERILLA WARFARE) کے پلین بنائیں۔ اور چھٹی کے دنوں میں اس کی مشق کریں۔ فرسٹ ایڈ، یعنی دواؤں وغیرہ کے ذریعے زخمیوں اور بیماروں کی فوری مدد کے طریقے بھی ہم سب کو جاننے چاہئیں۔ مجھے معلوم ہے کہ اس کی الگ ٹریننگ ہوتی ہے، اور آپ مطالبہ کر سکتے ہیں کہ اس کا انتظام کیا جائے۔ میرا کہنا یہ ہے کہ پڑھے لکھے ہندوستانی شہریوں کو ایسا بے بس نہ ہونا چاہیئے کہ جو باتیں کتابوں سے معلوم کی جا سکتی ہیں وہ بھی معلوم نہ کر سکیں جب تک کہ کورس اور استاد اور۔ ہاں آخر میں سرٹیفکٹ کا انتظام

نہ ہو جائے۔ جنگ اور اس سے متعلق باتوں کے بارے میں آپ کافی معلومات حاصل کرلیں گے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ آپ میں اعتماد پیدا ہوگا اور آپ دوسروں کی گھبراہٹ کو بہت جلد دور کرسکیں گے۔ مثلاً اگر آپ سنیں کہ ہندوستانی فوج بیس میل پیچھے ہٹ آئی تو آپ پریشان نہیں ہوں گے، اس لئے کہ فن جنگ کے استادوں اور ماہروں نے بتایا ہے کہ لڑائی میں یہ نہیں دیکھا جاتا کہ کون آگے بڑھا کون پیچھے ہٹا، دیکھا یہ جاتا ہے کہ کس نے زیادہ آدمیوں اور سامان کا نقصان اٹھایا، فوج کو پیچھے ہٹا کر اور مقابلہ کے لئے بہتر موقع نکال کر دشمن کو نقصان پہنچایا جا سکتا ہے، اور فوج کو آگے بڑھا کر نقصان اٹھایا جا سکتا ہے۔ فوجیں جس قوم کے لئے لڑتی ہوں وہ گھبرا جائے تو پھر جیتنا کیا لڑنا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ اس کی بھی چند مثالیں دیتا ہوں۔ بلجیم اور ہالینڈ پر جرمنی کا حملہ سنہ ۱۹۴۰ء میں اور امریکیوں کا حملہ جرمنی پر ۱۹۴۵ء میں ان موقعوں پر وہاں کے عوام گھبرا کر بھاگنے لگے، جس کی وجہ سے فوج کی آمد و رفت رک گئی اور دشمن کو ان جگہوں پر قبضہ کرنے کا بہترین موقع مل گیا! اسی طرح کی گھبراہٹ اگر دلی میں ہوئی تو اس کا اثر سارے ملک پر پڑے گا۔ اور ہماری فوج کی راہ میں بڑی دقتیں پیدا ہو جائیں گی۔

اب دوسری بات غور کیجئے، کہ مشورہ کب تک اور کہاں پر کرنا چاہیئے، اور قاعدے یا حکم پر کب عمل کرنا چاہیئے۔ جمہوری طریقے کے مطابق مشورہ کرنا اور مشورہ دینا بہت ضروری ہے مگر جمہوری طریقہ بالکل ناکامیاب، بلکہ ایک مصیبت ہو جاتا ہے اگر مشورہ کرنے کی کوئی حد مقرر نہ ہو، اور مشورہ دینے والے اس کی اہمیت اور استعداد نہ رکھتے ہوں، جامعہ میں ہم مشورہ کرتے ہیں، آزادی سے رائے دیتے ہیں، ساتھ مل کر کام کر لیتے ہیں، مگر ہم قدم ملا کر نہیں چلتے، جو بات اپنی سمجھ میں نہ آئے اسے نہیں کرنا چاہتے۔ خفا ہو کر کہہ دیتے ہیں کہ ہاں، حکم دیجئے تو کر لیں گے ورنہ نہیں کریں گے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جن جلسوں میں شرکت اختیاری ہو ان میں لوگ شریک ہونا ضروری نہیں سمجھتے۔ یہ کوئی غیر معمولی خرابی نہیں ہے، اور اس کی وجہ سے ہم نے کوئی خاص نقصان نہیں اٹھایا ہے۔ مگر اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم میں یہ صفت نہیں ہے کہ

ایک جگہ جمع ہونے کی ضرورت ہو تو گھنٹی بجائے اور شور مچائے بغیر جمع ہو جائیں، جسے یقین نہ ہو کہ وہ صحیح مشورہ دے سکتا ہے وہ مشورہ کے وقت چپ رہے، جو صحیح مشورہ دے سکتا ہو وہ آگے بڑھ کر مشورہ دے تو اسے بغیر حجت کئے قبول کر لیا جائے، شیخ الجامعہ کی عدم موجودگی میں کوئی فیصلہ کرنا ہو تو خازن اور مجلس اور سینیر اساتذہ مل کر فیصلہ کرلیں، اور جامعہ کی برادری سمجھے کہ ایسا کرنا مناسب ہے۔

چین کے حملے کے بعد ہر طرف پکار کر کہا جا رہا ہے کہ اب ہمیں متحد ہونا چاہیئے جامعہ میں ہم برابر کہتے رہے ہیں کہ ہم ہندوستان کے شہری ہیں، خدا کا شکر ہے کہ ہمارے یہاں وہ بات نہیں ہے جسے فرقہ وارانہ جھگڑے، لسانی اختلافات اور علاقائی تعصب کہا جاتا ہے۔ دوسروں کی بہ نسبت شاید ہمیں اس کا بہتر موقع ہے کہ ہم اپنے کام میں اور اپنی روزمرہ زندگی میں وہ ڈسپلن اور یکجہتی پیدا کرلیں جو جنگ کے لئے تیار فوج میں ہوتی ہے۔ ہم میں اور فوج کے سپاہیوں میں فرق یہ ہوگا کہ سپاہی پر خود سوچنے اور فیصلہ کرنے کی ذمہ داری نہیں ہوتی، اسے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا افسر کون ہے اور وہ وہی کرتا ہے جس کا اسے حکم دیا جاتا ہے۔ اس کے برخلاف ہم میں سے ہر ایک سپاہی بھی ہے اور افسر بھی، ہم میں سے ہر ایک میں اس کی صلاحیت ہونا چاہیئے کہ حکم مان سکے اور دے سکے، خود سوچ سکے اور دوسرے کی رائے پر عمل کر سکے۔ سپاہی لڑتا ہے یا لڑائی کی مشق کرتا ہے، ہم کو ایسی ذہنیت پیدا کرنا ہے کہ امن اور شانتی کے لئے ہر ممکن کوشش کریں۔ دوسروں کی بھلائی چاہیں، مگر عزت و آبرو کو اور ملک کو بچانے کے لئے ضروری ہو جائے تو سپاہی کی طرح میدان میں آجائیں۔ ایسی ذہنیت صرف اچھی تعلیم کے ذریعے پیدا کی جا سکتی ہے، اور اچھی تعلیم وہ ہے جو ہمیں حق اور انصاف اور آدمیت کی خدمت کرنے کا حوصلہ دلائے اور اس حوصلہ کو پورا کرنے کے قابل بنا دے۔

سول ڈیفنس کی ٹریننگ اور قومی فنڈ میں چندہ

چین کے حملہ کی وجہ سے تعلیمی میلہ جو ۹، ۱۰ اور ۱۱ نومبر کو ہونے والا تھا، ملتوی کر دیا گیا اور سول ڈیفنس

کے لئے مختلف قسم کے کاموں کی اسکیمیں تیار کی گئی ہیں مثلاً طالب علموں اور طالبات کے لئے ٹریننگ کا ایک کورس تیار کیا گیا ہے کہ آگ لگنے کی صورت میں اس پر قابو کس طرح حاصل کیا جائے، زخمیوں کی کس طرح امداد کی جائے، افراتفری اور گھبراہٹ کو کس طرح روکا جائے اور اپنے اپنے علاقہ کے نظم ونسق کو برقرار رکھنے کے لئے کیا تدابیر اختیار کی جائیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ ایک رائیفل کلب قائم کیا گیا ہے جس میں طالب علموں اور اسٹاف کو رائیفل اور بندوق کا استعمال سکھایا جائے گا اور صحیح نشانے کی مشق کرائی جائے گی۔

قومی مدافعت فنڈ کے لئے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو کو حسب ذیل چندے بھیجے گئے ہیں۔

۱۔ جملہ اسٹاف کی ایک دن کی تنخواہ	۸۸۹ء۲۷ روپے
۲۔ انجمن اساتذہ کی طرف سے	۱۰۰۱ روپے
۳۔ چندہ از طلبائے انسٹی ٹیوٹ آف آرٹس ایجوکیشن	۲۴۱ روپے
۴۔ جگوبھائی شاہ (آرٹس انسٹی ٹیوٹ کے ایک استاد)	۱۰۱ روپے

میزان ۲۷ء۲۲۳۲ روپے

بقیہ اداروں کے طلباء چندہ جمع کر رہے ہیں۔ اس کے علاوہ طلبائے مدرسہ ثانوی نے ایک دن اور طلبائے کالج نے دو دن روزے رکھ کر اپنے کھانے کی رقم قومی مدافعت فنڈ میں دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ آرٹس انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے ایک ڈرامہ کیا گیا ہے اور اس کی جملہ آمدنی مدافعت فنڈ میں دی جائے گی۔ استادوں کے مدرسہ کے بہت سے طلباء اور کچھ اساتذہ نے خون کی پیش کش کی ہے۔ ان کے خون کی جانچ ہو چکی ہے اور عبد اللہ ولی بخش قادری (استاد)، ویرسنگھ بھائی (متعلم بی ایڈ)، حکم سنگھ چوہان اور ستیش پال (متعلمین صداقت نامہ معلمی سال دوم) کا کافی کس روسی سی خون لیا جا چکا ہے بہر حال تعلیم معمول کے مطابق جاری ہے، مگر ساتھ ساتھ ہی قومی مدافعت کے لئے بڑے جوش وخروش کے ساتھ متعدد قسم کے کام بھی کئے جا رہے ہیں۔

مراسلات

حضرت جگر کے خط مطبوعہ جامعہ کی صحیح تاریخ

اکتوبر ۱۹۶۲ء کے رسالہ جامعہ میں جگر مرحوم کے دو خط شائع ہوئے تھے، جن پر کوئی تاریخ درج نہیں تھی۔ فاضل مکتوب الیہ کے محض اندازے کے مطابق نوٹ میں تاریخ درج کردی گئی تھی۔ پہلے خط میں حضرت شاعر لکھنوی اور لاہور کے ۲۶ تاریخ کے مشاعرہ کا ذکر ہے، اس لیے میں نے موصوف کو صحیح تاریخ معلوم کرنے کے لئے عریضہ لکھا جس کے جواب میں حسب ذیل عنایت نامہ موصول ہوا ہے :-

کراچی

۲۶ ستمبر ۱۹۶۲ء برادرم جناب اعظمی صاحب سلام مسنون

.... مرحوم نے اپنے خط میں جس ۲۶ تاریخ کا ذکر کیا ہے اس کی تفصیل یہ ہے۔

"۲۶ اپریل ۱۹۴۹ء کو انجمن حمایت الاسلام لاہور کے زیر اہتمام ایک مشاعرہ کا انعقاد ہوا تھا اور ہندوستان سے حضرت جگر کو اپنے ہمراہ لاہور لانے کی خدمت مجھے سپرد کی گئی تھی۔ حضرت جگر اُن دنوں گونڈہ میں تشریف فرما تھے۔ میں گونڈہ میں اُن کے ہمراہ اجازت نامہ (NO OBJECTION) حاصل کرنے کی جدوجہد میں مصروف تھا جو گونڈہ کے ڈپٹی کمشنر سے تعلقات میں کشیدگی کے باعث ناکامی پر ختم ہوئی اور میں اور جگر صاحب دونوں لاہور کے مشاعرہ میں شریک نہ ہو سکے۔ یہ مشاعرہ خواجہ ناظم الدین (جو اس وقت پاکستان کے گورنر جنرل تھے) کی صدارت میں منعقد ہوا تھا"

نیازمند

شاعر لکھنوی

حضرت شاعر نے اپنے اس خط میں "ڈپٹی کمشنر کے تعلقات کی کشیدگی" کا ذکر کیا ہے۔ نامناسب نہ ہو اگر یہاں تھوڑی سی اس پر بھی روشنی ڈال دی جائے۔ جگر مرحوم اپنے بے تکلف اور محترم دوست حضرت تسکین کو اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں :-

"گونڈہ کی فضا نہایت خراب ہوگئی ہے۔ یہاں کا ڈپٹی کمشنر شیطان بہ صورت انسان ہے۔
میں نے اس کے خلاف قدم اٹھایا ہے۔ یہاں کا سیاسی جمود ختم ہو رہا ہے۔ ایک وفد کے سلسلے میں
رکن کی حیثیت سے حکومت یوپی کے وزیر اعظم سے کل ہی مل لینا ہے۔ منشی صاحب تانگے کی تلاش
میں گئے ہوئے ہیں۔" (مکاتیب جگر صفحہ ۶۹)

اس خط سے حضرت شاعر لکھنوی کی تاریخ کی تائید ہوتی ہے۔ جگر مرحوم نے اس خط پر ۲۷ اپریل
کی تاریخ درج کی ہے۔ سنہ کے بارے میں حضرت تسکین نے حاشیہ پر لکھا ہے کہ "سال غالباً
بلکہ یقیناً ۱۹۴۹ء ہوگا۔ میں اس زمانے میں لکھنؤ سے اپنے وطن گیا ہوا تھا۔" مگر باوجود اس کے
کہ جگر مرحوم نے ۲۷ اپریل لکھا ہے حضرت تسکین لکھتے ہیں: "چونکہ اگلا خط ۹ اگست کا ہے،
اس لئے غالباً یہ خط ماہ جولائی میں لکھا گیا۔" لیکن اگلے خط میں کوئی ایسی بات نہیں ہے، جس
کی بنا پر جگر مرحوم کی تاریخ کو غلط سمجھا جائے۔ اس لئے میں نے حضرت تسکین سے اس کے
بارے میں استصواب کیا۔ انھوں نے جواب میں لکھا ہے کہ یہ نوٹ غلطی سے شائع ہوگیا ہے۔

جاوید نامہ کا انگریزی ترجمہ ——— ایک تصحیح

رسالہ جامعہ کے سالنامہ میں، جو فروری ۶۲ء میں شائع ہوا تھا، جناب ڈاکٹر عبادت
بریلوی صاحب کا ایک مضمون "پاکستان کی اردو مطبوعات پر ایک نظر" کے عنوان سے شائع
ہوا تھا۔ موصوف نے صفحہ ۴ پر ایک جگہ لکھا ہے:-

"بزم اقبال لاہور نے علامہ اقبالؒ کے جاوید نامہ کا ترجمہ بھی انگریزی میں شائع کر دیا
ہے۔ اس کے مترجم عبدالکریم خاں ہیں اور انھوں نے علامہ کی فارسی نظموں کو انگریزی نظم کے
سانچے میں بڑی خوبی سے ڈھالا ہے۔"

ادارۂ ثقافت اسلامیہ لاہور کے سکریٹری جناب اشرف ڈار صاحب نے ہمیں لکھا ہے کہ
اس بیان میں مترجم اور ناشر دونوں کے نام غلط ہیں۔ ذیل میں موصوف کا خط شائع کیا جا رہا ہے۔

مناسب تو یہ تھا کہ فاضل مضمون نگار ڈاکٹر عبادت بریلوی صاحب کی رائے بھی معلوم کرکے ساتھ ہی شائع کردی جاتی، مگر افسوس کہ موصوف لندن یونیورسٹی میں اردو کے پروفیسر کی حیثیت سے تین سال کے لئے، انگلستان چلے گئے ہیں، اس لئے ان سے استصواب کئے بغیر ہی یہ خط شائع کیا جارہا ہے :-

مدیر صاحب جامعہ!

" آپ کے موقر جریدۂ "جامعہ" کے سالنامہ (اشاعت فروری ۱۹۶۲ء) میں ادارہ ثقافت اسلامیہ کی ایک کتاب کے بارے میں غلط اطلاع درج ہوگئی ہے۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی صاحب نے مختلف اشاعتی اداروں کی مطبوعات کے متعلق اپنے مضمون میں علامہ اقبال کے "جاویدنامہ" کا انگریزی ترجمہ کسی "عبدالکریم خاں" سے منسوب کردیا ہے اور تحریر فرمایا ہے کہ یہ ترجمہ بزم اقبال نے شائع کیا ہے۔ یہ دونوں باتیں غلط ہیں۔" جاویدنامہ" کا ترجمہ پروفیسر محمود احمد (پرنسپل گورنمنٹ کالج - میرپور) نے کیا ہے اور اسے شائع کرنے کا فخر ادارہ ثقافت اسلامیہ کو ہے۔

احقر

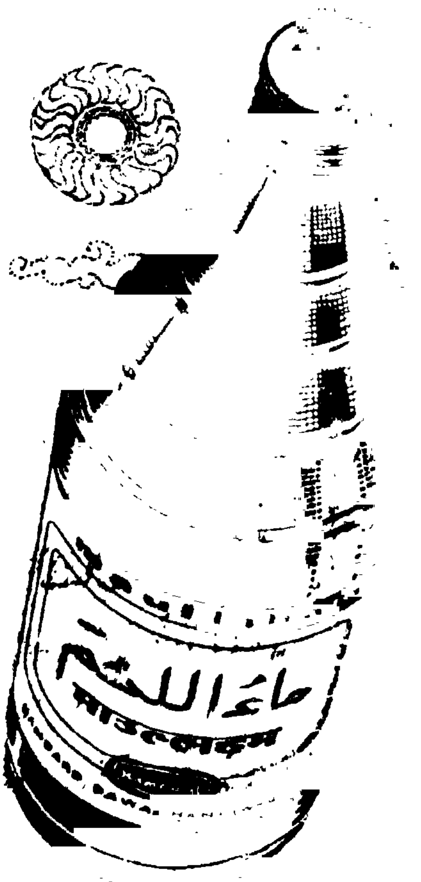
اشرف ڈار

۱۹۶۲ء کے اُردو اَدب کا جائزہ

رسالہ جامعہ کا اگلے سال فروری میں ایک خاص نمبر شائع ہوگا جس میں ۱۹۶۲ء کے اُردو ادب کا تفصیل سے جائزہ لیا جائے گا اور سال بھر کی مطبوعات کی مضمون وار فہرست شائع کی جائے گی۔ ادیبوں اور ناشروں سے درخواست ہے کہ وہ اس خاص نمبر کو کامیاب بنانے میں ہماری مدد کریں۔

(اڈیٹر)


بوتل میں بند۔ توانائی اور صحت
کا سرچشمہ
ماءاللحم خاص
(اصل زعفرانی رنگ)
گوشت کے حیات بخش اجزاء و نامینز سے بھرپور پھلوں کے رس
قیمتی جڑی بوٹیاں، مشک، عنبر اور زعفران کا بہترین مرکب
ماءاللحم خاص بے پناہ قوت اور توانائی، جوش و امنگ اور محنت کا عالم
پیدا کرتا ہے اس کا استعمال ہر عمر کے مرد اور عورت کیلئے یکساں مفید ہے
ہر جگہ ایجنسیاں قائم کی جا رہی ہیں
دواخانہ طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علیگڑھ (یوپی)
ایجنسیاں:- (۱) مرادآباد چوکھا پل (۲) کان پور ظہیر اینڈ سنس جمن گنج (۳) جمشید پور محمد مصطفےٰ اسٹور بازار
(۴) مبارک پور محفوظ الرحمٰن عبد الحفیظ (۵) مئو ناتھ بھنجن، صدر بازار احمد مجتبیٰ (٦) لکھنؤ امین آباد، اودھ جنرل اسٹور



طابع و ناشر: عبداللطیف اعظمی — مطبوعہ: یونین پریس دہلی — ٹائیٹل: دیال پریس دہلی